اقبالؒ کی نعت

فکری و اسلوبیاتی مطالعہ



مرتّب

صبیح رحمانی

اقبال کی نعت
— فکری و اسلوبیاتی مطالعہ

صبیح رحمانی

اقبال کی نعت

— فکری و اسلوبیاتی مطالعہ

صبیح رحمانی

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : ستمبر ۲۰۱۸ء

کمپوزنگ : لیزر پلس، فون:32751324

قیمت : ۱۳۰۰/ روپے

Iqbal Ki Naat— Fikri-o-Usloobiyati Mutala

(Criticism)

Compiled By: Sabeeh Rahmani

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail:a.bazyaft@gmail.com

نقدِ اقبال کے تین اساتذہ

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ، پروفیسر میرزا محمد منور

اور

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

کے نام

فہرست

اقبال کی نعت —— چند باتیں

اردو شعر و ادب کے چند ایک بڑے اور فکر افروز موضوعات کا انتخاب کیا جائے تو بلاشبہ ان میں سے ایک لازماً اقبال سے بھی موسوم ہوگا۔ یہ بات قدرے احتیاط سے کہی گئی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال ہمارے شعر و سخن، ادب و نقد اور فکر و نظر کا ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر موضوع ہے کہ اس کے پہلو اور جہات کو خود اپنی جگہ ایک الگ دفترِ معنی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے دورِ حیات سے لے کر آج تک ہماری تنقید مستقل طور سے اقبال کو موضوعِ گفتگو بنا رہی ہے۔ تاریخِ ادب سے دل چسپی رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی بڑے تخلیق کار کی عظمت کا ایک حوالہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تغیراتِ زمانہ کے ساتھ اُس کی تفہیم کا تناظر تبدیل ہوتا ہے اور یوں بدلتے ہوئے ادوار میں اس کے نئے مطالعات کی ضرورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اقبال ہماری شعری روایت کا ایسا ہی ایک اہم شاعر ہے۔ اقبال پر جو کچھ اب تک لکھا جا چکا ہے، وہ ہماری تنقید کا ایک روشن باب ہے۔ تاہم اقبال آج بھی ایک تازہ اور فکر انگیز موضوع کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے شعر و سخن کے ذیل میں ایسے نکات اب بھی سامنے آتے رہتے ہیں کہ جن پر گفتگو خود ہماری تنقید کو ثروت مند بناتی ہے۔

نعتیہ ادب کے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے مجھے اردو کے بڑے شعرا کو اس جہت سے دیکھنے کی ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ وہ موضوعاتِ نعت کی طرف کس طرح اور کس حد تک

مائل ہوتے رہے ہیں۔ اگر کسی کے یہاں ایسی صورتِ حال نظر آتی ہے تو میں گہرے انہماک سے اس شاعر کے کلام میں نعتیہ افکار کی تلاش وجستجو کرتا ہوں۔ یہ کام اگرچہ خاصا صبر آزما اور وقت طلب ہوتا ہے کہ ایک شاعر کے ہاں سے اُس کی کلیتِ کار کے سیاق میں چن چن کر نعتیہ عناصر یک جا کیے جائیں، کیوں کہ اس کے لیے اس کے سارے تخلیقی سرمائے کو سرسری انداز میں دیکھنے سے بات نہیں بنتی، بلکہ اسے مکمل طور سے کھنگالنا پڑتا ہے، لیکن میں ہمیشہ ہی بہ صد شوق اس مرحلے سے گزرتا رہا ہوں۔

وہ شعرا جن کے ہاں نعت کا باقاعدہ اہتمام ملتا ہے، ان کے ہاں سے مثالوں کا تلاش کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے، مگر جن شعرا کے ہاں باقاعدہ یہ اہتمام نہ ہو، ان کے نظامِ فکر میں عشقِ رسول ﷺ کے اظہار کے زاویوں کی تلاش یقیناً زیادہ توجہ چاہتی ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ میں ادب کی بڑی آوازوں کی گونج میں عشقِ نبیِ کریم ﷺ کی روشنی کو تخلیقی توانائی کے سیلِ رواں میں الگ شعاعِ نور کے طور پر دریافت اور پیش کرسکوں۔ ''غالب اور ثنائے خواجہ'' جیسی کتاب کی تدوین بھی اسی کوشش کا حصہ تھی تاکہ نعت کے مجموعی تخلیقی زاویوں اور ادبی پہلوؤں پر غور وفکر کے اس دور میں اردو شاعری کی روایت کے وہ بڑے اور اہم نام بھی پیشِ نظر رہیں جن کے ہاں ذرا کم ہی سہی، لیکن بہرحال اسلوبِ نعت اپنی ضو دکھاتا ضرور ہے۔ دل چسپ اور اہم بات یہ ہے کہ ایسے بڑے شاعروں کے ہاں یہ مضمون اپنا ایک الگ قرینہ اور ایک جداگانہ سطح رکھتا ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نعت شناسی کے قافلے کو ادب کی اعلیٰ منزلوں تک لے جانے کے لیے اردو زبان وادب کے ان عظیم شعرا کے کلام میں نعتیہ افکار کی تلاش اور اس کی تفہیم کا اہتمام ناگزیر ہے۔ اس سے ایک طرف تو نعت کا ادبی افق وسیع ہوگا اور دوسری طرف انتشار وادبار کے اس ماحول میں کہ جب سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی دنیا تغیر کے پے در پے تجربات سے گزر رہی ہے، اپنے ادب اور تہذیب کی بقا اور استحکام کے لیے یہ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی قوتوں اور شناخت کے ایسے حوالوں کو ہر ممکن طریقے سے ابھاریں جو ہماری اجتماعیت کے لیے تقویت کا سامان فراہم کرتے ہوں۔

زیرِ نظر کتاب ''اقبال کی نعت— فکری و اسلوبیاتی مطالعہ'' بھی دراصل اسی جستجو کا

تسلسل ہے۔ اس کاوش سے مقصود فکرِ اقبال کے آئینے میں عشقِ رسول کا عکس دکھانے اور نعت کے تخلیقی آفاق پر پھیلنے والی اس حیات افروز روشنی کو نمایاں کرنا ہے جس نے نہ صرف اقبال کے نعتیہ اظہار کو ایک انقلابی آہنگ عطا کیا، بلکہ اسلوبِ نعت کا مزاج بھی بدل ڈالا، اور یوں نعت میں جذب و فکر کی نو بہ نو کیفیات نے ظہور کیا۔ اقبال کے نعتیہ اشعار نے نہ صرف ایران و افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں محبت کی روح پھونکی، بلکہ پورے عالمِ اسلام کا دامن عشق کی حرارت اور کیف و مستی سے بھر دیا۔ نعت میں بھی اقبال نے اپنی طرزِ سخن کے عین مطابق ایک نئی روش نکالی اور اس میں بھی احیا و انقلاب کا سامان پیدا کیا۔ اقبال کو مروّجہ معانی میں نعت گو نہیں کہا گیا، کیوں کہ ان کے کلام میں نعت کے عنوان سے تخلیقی نقوش محض روایتی انداز سے ہمارے سامنے نہیں آتے۔ تاہم یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اقبال کی شاعری میں جا بہ جا عشقِ رسول کی جاں افروز شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری میں نبیِ کریم ﷺ کا عشق ہی ان کے ایمان کی اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عشق صرف ربط کا نام نہیں، بلکہ یہ نام ہے گہرے، سچے اور محکم تعلق کا۔ اقبال کے کلام میں جو نعتیہ عناصر اُن کی ذاتی زندگی اور قومی و تہذیبی حالات کے تناظر میں غیر محسوس طور پر نمایاں ہوئے ہیں، وہ ان کے عشق اور والہانہ تعلق کی روداد ہی تو ہیں۔ روایتی نعت کے مقابلے میں اس طرح کی نعت کا اظہار، لہجہ اور فکری سطح یقیناً ایک نئے احساس کو پیش کرتی ہے۔ حضور نبیِ کریم ﷺ اقبال کے فکری و تخلیقی تناظر میں مومنِ اوّل اور مردِ کامل کے طور پر نمایاں ہوتے ہیں آپ کی زندگی اور اسوۂ حسنہ ہی اقبال کے قلندر، درویش، مردِ خدا آگاہ و خدا مست کے لیے مشعلِ راہ کا درجہ رکھتا ہے۔

تنقیداتِ اقبال کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال پر اس زاویے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر اس کا عنوان اقبال کی نعت گوئی نہیں ہے، بلکہ اقبال کا عشقِ رسول رہا ہے۔ ظاہر ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اقبال کے ہاں علاحدہ سے نعت مروّجہ صورت میں دستیاب نہیں ہوتی۔ حالاں کہ اقبال کے عشقِ رسول پر لکھتے ہوئے درحقیقت تمام اہلِ علم نے اقبال کے کلام میں نعتیہ عناصر ہی کو نمایاں کیا ہے اور ان کے فکری پہلوؤں کو بااہتمام موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ مجھے اردو نعت کی روایتی فضا کو بدلنے والی دو آوازوں حالی اور اقبال نے

ہمیشہ اپنی جانب متوجہ کیا، خصوصاً جب میری نظر سے رشید احمد صدیقی کی یہ رائے گزری:

''نعت ہمارے شعر و ادب کی قابلِ قدر روایت بن گئی ہے۔ ایسی روایت جو شاعری میں عبادت کے عنصر و عوامل کے ساز و برگ کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ نعت کو شاید کسی اور مذہب و ملت میں وہ اہمیت حاصل نہ ہو جو ہمارے شعر و ادب میں ہے۔ اس کو مقصد دینے، متحرک کرنے کی ابتدا حالی نے کی جسے اقبال نے اس درجے تک پہنچا دیا ہے جس کے آگے پہنچانا اب کسی اقبال ہی کا کارنامہ ہوگا اور مستقبل بعید میں کسی دوسرے اقبال کا ظہور پانا آسان معلوم نہیں ہوتا۔''

اس رائے سے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ اقبال نے اردو کی نعتیہ شاعری پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں، لیکن مقامِ حیرت یہ ہے کہ اقبالیات کے شعبے میں ابھی تک اس موضوع پر کسی کام کا اہتمام نظر نہیں آیا۔ میں ''اقبال کی نعت— فکری و اسلوبیاتی مطالعہ'' کے اشاعتی منصوبے پر غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر عزیز احسن نے میری توجہ اقبال کے ایک پسندیدہ نعتیہ شعر کی جانب مبذول کروائی۔ سیّد فقیر وحید الدین کی کتاب ''روزگارِ فقیر'' کی پہلی جلد میں صفحہ نمبر ۱۴۷ پر اقبال کے پسندیدہ شعر کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے۔

''سید امجد علی نے ایک بار ڈاکٹر صاحب کو شگفتہ خاطر دیکھ کر سوال کیا کہ آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے، فرمایا، عرفی کا شعر:

سایۂ من ہمچو من در ملکِ ہستی اُمت
سایۂ تو در عدم پیغمبرِ ہمتای من

(قصایدِ عرفی میں یہ شعر نعتِ رسول ﷺ میں موجود ہے۔)

ساتھ ہی اپنی پسندیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس شعر میں خوب صورت تعلی ہے۔''

اتفاق سے یہ شعر جب سامنے آیا تو تعلی کا عقدہ کھولنے میں کچھ دقت محسوس ہوئی۔ چناں چہ میں نے متعدد اہلِ علم سے رجوع کیا، کیوں کہ میرے پیشِ نظر نہ تو عرفی کا دیوان تھا اور نہ ہی میں فارسی زبان پر کوئی خاص دسترس رکھتا ہوں۔ اس مرحلے پر جناب ڈاکٹر تحسین فراقی نے میرے نام اپنے ایک خط میں اس گتھی کو بھی سلجھا دیا۔ چناں چہ اس شعر کی

تشریح ان ہی کی زبانی سنیے...... رقم طراز ہیں:

''آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس شعر کی توضیح پیش ہے، مگر پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ شعر عرفی کے مشہور قصیدے در نعتِ حضرت رسول (ﷺ)' کا حصہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

صبحدم چوں در دمد دل صورِ شیون زای من
آسماں صحنِ قیامت گردد از غوغای من

تشریح طلب شعر کی وضاحت کے ضمن میں چند اُمور پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں۔ پہلا یہ کہ شعر چوں کہ قصیدے کا ہے، اس لیے اس میں تعلّی کا ہونا گویا اس کے عناصرِ ترکیبی میں سے ہے۔ دوم یہ کہ آپ کے فرستادہ شعر کی توضیح کا حق اس صورت میں اطمینان بخش طریقے سے ادا ہوسکتا ہے جب اس کے ساتھ اس کے معاً بعد کا شعر بھی پیشِ نظر رکھا جائے یعنی:

آسمانِ وحدتم بر عالمِ فطرت محیط
تو اَمیّت برنتابد پیکرِ جوزای من

سوم یہ کہ یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ اس عالمِ ناسوت میں حضور اکرم ﷺ کے پیکرِ مبارک کا سایہ نہیں تھا:

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم
بے سایہ و سائبانِ عالم
(فیضی)

گویا یہ ایک معجزہ تھا منجملہ اور متعدد معجزوں کے۔ چہارم یہ کہ قصیدے کے میدان میں بہ قول عرفی کوئی اس کا ہم سر اور حریف نہیں۔ اقبال نے درست فرمایا ہے کہ عرفی کے مذکورہ شعر میں خوب صورت تعلّی موجود ہے۔ اب آیئے ان دونوں شعروں کی توضیح کی جانب: پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر، حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے اپنے کمال والہانہ پن کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے نبیِّ والا صرف میں ہی نہیں، میرا سایہ بھی اِس دنیا میں آپ ﷺ کا اُمّتی ہے۔ دوسرے مصرعے کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ چوں کہ آپ ﷺ کے پیکرِ مبارک کا سایہ معدوم ہے تو گویا وہ عالمِ موجودات میں نہیں عالمِ عدم میں

ہے۔ اِس دنیا میں شاعری کے باب میں میرا بھی کوئی ثانی نہیں گویا میرا حریف بھی معدوم ہے یعنی ملکِ عدم میں ہے۔ لہٰذا وہاں آپ ﷺ کا سایہ میرے حریف کا پیغمبر ہوگا۔ اگلے شعر کا مفہوم سابقہ شعر کی تکمیل کرتا ہے۔ عرفی کہتا ہے کہ میں وحدت کا آسمان ہوں (یعنی شاعری کے میدان میں واحد ہوں) جو عالمِ فطرت پر چھایا ہوا ہے اور میری شاعری کا پیکر دوئی کا متحمل نہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے پیکرِ شعری کو بارہ بروج میں سے ایک برج— جوزَا قرار دیا ہے جس کی شکل و شبیہہ دو لڑکوں کی صورت میں ہے جو پشت کی جانب سے جڑے ہوئے ہیں گویا توام ہیں۔ شاعر کے نزدیک اس کی شاعری ہے تو برجِ جوزا سے مماثل، مگر یہ پیکرِ شعری واحد ہے، اس کا جوڑا یا حریف و ہم سر ناپید ہے۔ مطلب یہ کہ میری شاعری اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اب سوال یہ ہے کہ عرفی نے اپنے شعری پیکر کو جوزا کس لیے قرار دیا ہے تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ منطقۃ البروج میں برجِ جوزا سب سے بڑا، سب سے زیادہ باشکوہ اور غیر معمولی شانِ امتیاز کا حامل ہے۔ باقی باقی۔''

اقبال کا عشقِ رسول ﷺ اور ذوقِ نعت جاننے کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے اپنا پسندیدہ شعر بھی ''نعت'' ہی کے ذخیرے میں سے منتخب فرمایا تھا... اور اس شعر کی پسندیدگی کی وجہ میں جو تعلی عرفی کی ذات سے منسوب ہوئی تھی، دیکھا جائے تو وہی تعلی ایک طرح سے اقبال کے اپنے لیے بھی موزوں تھی، کیوں کہ وہ وہ خود فرما چکے تھے:

نداند جبرئیل ایں ہاے و ہُو را
کہ نشناسد مقامِ جستجو را
بپرس از بندۂ بیچارۂ خویش
کہ داند نیش و نوشِ آرزو را

(اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ جبرئیل [تلاشِ حق میں تڑپنے کی لذت] ہُو حق کے شور سے آشنا نہیں ہے۔ جب کہ تیرا بندۂ بے چارہ [اقبال] اس لذت سے آشنا ہے، کیوں کہ وہ مقصود کی تلاش میں پیش آنے والے دکھ سے بھی واقف ہے اور لذات سے بھی آشنا ہے۔)

انسان کا مزاج اشیا، اشخاص اور اقدار کے حوالے سے اس کی پسندیدگی کی روشنی

میں سمجھا جاتا ہے۔ اقبال کا مزاج بھی حُسنِ کامل کے حوالے سے ان کے آدرش کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبال کے پورے کلام میں انسانی حسن، اقداری ارفعیت اور پیغام کی لازوالیت کے نقوش کا مرکزی نقطہ 'حبِ رسول ﷺ' ہی ہے۔ قوت بھی حُسن ہے اس لیے مسلمان کو بالعموم اور دیگر اقوام کو بالخصوص اقبال 'حبِ رسول ﷺ' کے معجزانہ احوال کی طرف دعوت دے کر اس سے قوت حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے Constance E. Padwick کی کتاب Muslim Devotions سے ایک اقتباس دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر صاحبِ بصیرت انسان یہ جانتا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی محبت ہی میں اُمتِ مسلمہ کی قوت کا راز پنہاں ہے:

''جس کسی کو مسلمانوں کی حُبِ رسول ﷺ کی خبر نہ ہو، وہ اسلام کی قوت کا احساس کر ہی نہیں سکتا... یہ جذبۂ حُب ایسا شدید ہے کہ اسے تصوف کی گرمیِ نفس کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ ذاتِ رسول ﷺ سے محبت مسلمانوں کی وحدت اور اتحاد کا ایک بڑا موجب ہے۔''

اقبال کے کلام میں جا بہ جا حضورِ اکرم ﷺ سے والہانہ عشق کا اظہار ہے، مثلاً:

تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز وگدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربی، گرفت حجازِ من

(غیر عرب دنیا کی چمک دمک میرے قلبی سوز و گداز تک نہیں پہنچتی کیوں کہ میرے حجاز یعنی دل کو میرے آقا جنابِ محمد رسول اللہ (ﷺ) نے ایک ہی نگاہ میں اپنا کرلیا ہے [اب مجھے آپ ﷺ کی تعلیمات کے سوا سب ہیچ نظر آتا ہے])۔

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدای من

(یارسول اللہ ﷺ! میں تو اللہ سے بھی آپ ﷺ کے توسط سے بات کرتا ہوں، اس لیے کہ وہ میری آنکھ سے پوشیدہ ہے اور آپ ﷺ میرے سامنے ظاہر ہیں۔)

اقبال نے خان نیاز الدین خان کو ایک خط میں لکھا تھا:

''میرا عقیدہ ہے کہ نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت

سے اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابہ j ہوا کرتے تھے، لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔''

علامہ اقبال کا یہ انکشاف، محض بیان نہیں ہوسکتا، اس میں ان کے ذاتی احوال، مشاہدات اور قلبی و روحانی واردات کا عکس بھی ہے۔ اُنھوں نے اپنی بصیرت سے کائنات کی حرکی قوتوں کا راز ''رسول ﷺ مرکزیت'' میں پالیا تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کی روداد ۱۹۰۲ء کے صفحہ نمبر ۳۲ پر بھی ایک نعت میسر آتی ہے جسے سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری نے ''چٹان''، لاہور کے شمارہ ۸/اپریل ۱۹۷۴ء (جلد نمبر ۲۷، شمارہ نمبر ۱۴) کے صفحہ نمبر ۱۷ پر شائع کیا تھا۔اقبال کی یہ نعت ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پاے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہ عرفاں کردہ ای
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن زِ نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علمِ تو
اُمیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای
فیضِ تو دشتِ عرب را مطمحِ انظار ساخت
خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای
دل نہ نالد در فراقِ ماسوائے نورِ تو!
خشک چوبے رازِ ہجرِ خویش گریاں کردہ ای

(اے وہ ہستی کہ جس نے دلوں پہ عشق کے اسرار و رموز آسان فرما دیے ہیں۔ سینوں کو انوار و تجلیات سے یوسف آباد بنا دیا ہے۔ آپ کے نقوشِ قدم سے سیکڑوں کوہِ طور جلوہ دکھاتے ہیں۔ آپ نے یثرب کی سرزمین کو معرفت کا مرکزِ تجلی بنا دیا ہے۔اے وہ ذات

کہ آپ کے بعد کسی بھی مفہوم میں نبوت شرک قرار پاتی ہے۔

آپ نے بزمِ کائنات کو شمعِ عرفاں کے نور سے منور فرما دیا ہے۔ اے وہ ذات کہ آپ شہرِ علم کا دروازہ خدا کا ہم نام ہے۔ آپ ایسے امّی تھے جس نے علم وحکمت کو روشن تر کیا ہے۔ آپ کے فیض نے عرب کے دشت کو نگاہوں کا مرکز بنا دیا۔ آپ نے اس ویرانے کی مٹی کو گلشن بہ داماں بنا دیا ہے (دل ننالد در فراقت)۔ آپ کے نورِ عشق کے بغیر کوئی دل آپ کے فراق میں گریہ نہیں کرتا۔ آپ نے سوکھی ہوئی لکڑی کو اپنے ہجر میں گریاں کر دیا ہے۔)

ماہنامہ ''نعت'' جلد نمبر ۱ شمارہ ۹، مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۹ء میں میری نظر سے پروفیسر محمد اقبال جاوید کا ایک مضمون گزرا ''تین قدیم رسول نمبر'' جس میں عزیز حسن بقائی کی ادارت میں نکلنے والے رسالے ''پیشوا'' دہلی (۱۳۴۸ھ) کے رسول نمبر کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے اس میں اقبال کے تین نعتیہ اشعار کا ذکر کیا ہے جو معراج سے متعلق ہیں۔ اشعار اقبال ہی کے سوادِ خط میں شائع ہوئے ہیں۔

اے کہ از معراج می گوئی سخن
برحکایت ہائے ملّایاں متن
خود بگو او را فلک در بر گرفت
یا ضمیرِ او فلک را در گرفت
آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است

(آپ جو معراج کے بارے میں محوِ سخن ہیں۔ آپ ملاؤں کی بیان کردہ کہانیوں پر عبارت آرائی نہ کیجیے۔ خود ہی انصاف کیجیے کہ کیا نبیِ کریم ﷺ کو آسمانوں نے اپنی آغوش میں لیا یا نبیِ کریم کے ضمیرِ مبارک نے آسمانوں کو خود میں سمو لیا تھا۔ کائنات انسان میں سما جاتی ہے۔ انسان کائنات میں نہیں سماتا۔)

یہ گفتگو کسی اور رُخ پر چل نکلی۔ عرض کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نعت اور اس کے موضوعات اور اظہار کے قرینوں سے اقبال کی طبعی مناسبت متعدد پہلوؤں سے سامنے آتی

ہے۔اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال کا عشقِ رسول اُن کی شاعری کا ایک اہم رنگ اور فکر کا محکم حوالہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقبال کے سرمایۂ سخن میں نعت کا وہ اسلوب و آہنگ نہیں ملتا، جو ہمارے ہاں رائج ہے، اور اس لحاظ سے اقبال کو اُس طرح نعت گو شعرا میں شمار نہیں کیا جا سکتا جس طرح اس صنف کو بعض اہلِ سخن کے اختیار کرنے پر شمار کیا جاتا ہے، لیکن کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ یہ صرفِ نظر دراصل شعر و فکرِ اقبال کی ایک بہت محکم کیفیت کی نفی کے مترادف ہوگا۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل جیّد اہلِ نقد و نظر کے یہ مضامین واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا نہ صرف اعتراف کرتے ہیں، بلکہ اقبال کی شاعری کے اس پہلو کا جائزہ اُن کے کلام کی کلیت میں کرتے ہوئے، اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا تعین بھی کرتے ہیں۔

ان مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح معرضِ اثبات تک آ جاتی ہے کہ اقبال کے یہاں مروّجہ صورت میں نعت نہیں ملتی، لیکن ان کی شاعری نعت کے جوہر سے تہی دست ہرگز نہیں ہے۔ واقعہ اصل میں یہ ہے کہ اردو کی نعتیہ شعری روایت میں اقبال کا آہنگ و انداز منفرد اور اسلوب جداگانہ ہے۔ ان کے نعتیہ اظہار میں ایک طرف تو ان کی ذاتی عقیدت و محبت کی وہ دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں جو ان کے دل میں گونج رہی ہیں اور دوسری طرف اقبال کی نعتیہ شاعری میں اپنا تہذیبی اور ملّی المیہ ایک الگ رنگ میں اجتماعی کرب و اضطراب کو بیان کرتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسئلے کو جس طرح اقبال نے اپنی شاعری میں فکر کی اعلیٰ سطح پر بیان کیا، اس کی سب سے بلیغ اور اثر انگیز صورت ہمیں ان کے یہاں اس وقت ملتی ہے جب وہ اسے نعتیہ آہنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس مرحلے پر اقبال کی نعت بہ یک وقت دو معنوی جہتیں پیدا کرتی ہے، ایک عقیدت و محبت کی اور دوسری دادرسی اور شفاعت کی۔

مذہب، سیاست، عمرانیات، معنویتِ حیات اور شعورِ کائنات کے تناظر میں سامنے آنے والے یہ نعتیہ عناصر زبان و بیاں، اظہارِ عشق و عقیدت، جدت و ندرت اور انفرادیت و شعور کی اُس سطح پر معرضِ اظہار میں آتے ہیں کہ جہاں فن معجزہ بن جاتا ہے اور حسنِ کلام سحر و اعجاز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اس رنگِ سخن کی اردو کی پوری نعتیہ شاعری

کی روایت میں دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔

اقبال کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے اور پھر اقبال کی اس شعری جہت پر لکھے گئے، ان منتخب مضامین کو پڑھتے ہوئے میں نے بارہا ایک بات محسوس کی، جس کا اظہار میں کسی تکلّف و تأمل کے بغیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں بہت اعلیٰ تخلیقی سطح رکھنے والا نعتیہ کلام بھی ملتا ہے، لیکن اس کا تناسب نعتیہ کلام کے کُل ذخیرے میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک کا ہوتا ہے۔ ہماری نعت کا حاوی مزاج آج بھی عقیدت و محبت کا ہے۔ عہدِ جدید کے اس تناظر میں جب وقت کے تغیرات نے حالات کو اس حد تک بدل ڈالا ہے کہ روایتی اسالیب، پیرائے اور طرزِ اظہار اپنی معنویت اور جاذبیت تیزی سے کھو رہے ہیں اور فراموشی کے اندھیروں کی طرف بڑھ رہے ہیں، اگر آج ہم نعت کو فی الحقیقت اُس کی تہذیبی و ادبی قدر و منزلت کے درجے میں نئے قرینے کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اقبال کے نعتیہ اسلوب و آہنگ کو دیکھنا، سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا پڑے گا۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آج کے نعت گو شعرا اقبال کے رنگ میں نعت کہنے لگیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔ اوّل تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اقبال اپنے رنگ و آہنگ کا مبتدی بھی ہے اور منتہی بھی۔ اس کا اتباع کرنا اگر ناممکن نہیں تو ایسا سہل بھی نہیں کہ اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتوں کے بغیر اسے اختیار کیا جاسکے۔ دوم یہ کہ اگر کوئی اس کو اختیار کرنے میں کامیاب بھی ہوجائے تو اس کی کامیابی اور پذیرائی کا دائرہ بہت مختصر ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑا تخلیقی تجربہ ہے جو دراصل اپنی ایک سماجی، سیاسی، تہذیبی اور عصری تطبیق بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں عرض کیا گیا، اقبال کے شعری تجربے میں ہمیں اس کے عہد کے سیاسی، تہذیبی، سماجی اور اخلاقی مسائل اور احوال کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ چناں چہ آج کے شاعر کے لیے دیکھنے اور کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے عہد سے فکری اور حسی وابستگی کا ہنر تو اقبال اور اس کی طرزِ سخن سے سیکھے، لیکن اس کی معنویت کے لیے اسے اپنے عہد سے رشتہ استوار کرنا ہوگا، اور اپنے عصر کے ذہنی، عقلی، جذبی اور نظری تناظر کو اپنے تخلیقی تجربے میں ڈھالنا ہوگا۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ نعت تخلیق ہو پائے جس میں کائناتی آہنگ اور آفاقی وسعت در آئے، اس میں اپنے عہد کا تہذیبی و فکری لہجہ گونجتا سنائی دے اور اس عصر کے ضمیر کی آواز

پیدا ہو سکے۔ اقبال کے نعتیہ شعور سے اس دور کی نئی نعت یقیناً یہ رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔

کسی بھی بڑے تخلیق کار کی فکری و معنوی سیاحت کا حاصل متعدد صورتوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ بادی النظر میں تو بے شک اقبال کے نعتیہ اسلوب کا مطالعہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان مضامین کو یک جا اور بالاستیعاب پڑھا جائے تو خود نقدِ نعت کے لیے بھی فکر و نظر کا وہ سامان فراہم ہوتا ہے جو ہمیں سوچنے اور سمجھنے کے نئے پہلو مہیا کرتا ہے۔ اس کتاب پر کام کرتے ہوئے اس کے موضوع اور مواد کے حوالے سے میری گفتگو صاحبِ نظر نقاد اور میرے عزیز دوست مبین مرزا سے بھی رہی۔ ان کی رائے بھی یہی ہے کہ ہماری تنقید چوں کہ بالعموم روایتی زاویے سے اقبال کی نعت کو دیکھتی ہے، اس لیے وہ واضح لفظوں میں اقبال کو نعت گو شاعر نہیں کہتی۔

اس کتاب میں شامل مضامین دراصل ایک بڑے ذخیرے سے بہت احتیاط اور ذمے داری سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ مقصد ایک کتاب مرتب کرنا نہیں تھا، بلکہ اس موضوع پر اُن اہم ترین تحریروں کو یک جا کرنا اور ایک ایسا لوازمہ پیش کرنا تھا جو موضوع کی تمام ممکنہ فکری، ادبی اور اسلوبیاتی جہات کا احاطہ کرتا ہو۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں جن لوگوں کے مقالات شامل ہیں، وہ سبھی ہمارے ادب و نقد کے ایسے اہم ترین نام ہیں جن کے کام سے پورا ایک عہد روشن ہوا اور ایک زمانے کے اذہان نے بصیرت اور رہنمائی حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے لیے چند مضامین نئے بھی لکھوائے گئے ہیں جو اِس کتاب میں پہلی بار شائع ہو رہے ہیں۔ اس کاوش کا مقصد یہ تھا کہ کتاب میں اُن تین نسلوں کے اہلِ نظر ناقدین کی نمائندگی ہو سکے جنھوں نے گزشتہ چھ سات دہائیوں میں ہماری ادبی دنیا میں اپنے وجود کا احساس فکر انگیز تنقید سے دلایا ہے۔ انھیں میں ایک مضمون مبین مرزا کا بھی ہے۔ مبین مرزا نے بالکل نئے زاویے سے کلامِ اقبال میں نعت کے اشعار و افکار کو دیکھا ہے اور اس حوالے سے ایک ایسا تنقیدی تناظر قائم کیا ہے جو اس سے پہلے تنقیدِ اقبال میں ہمیں کہیں نظر نہیں آتا۔ کم سے کم میں تو یہ بات ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ نقدِ اقبال کے ضمن میں جتنی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں، میں نے ایسا کوئی زاویہ ان میں نہیں دیکھا جو مبین مرزا نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"عقل و عشق، خودی و خود آگاہی، حیات و مرگ، فنا و بقا، اجتہاد و انقلاب اور عروج و زوال

سے لے کر اقبال کے عہد تک کے فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات و نظریات جیسے مابعدالطبیعیات، سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت تک آپ جس زاویے سے چاہے دیکھ لیجیے، اُن کی دانش و بینش کا تقریباً سارا نمایاں منظرنامہ اور اُن کے افکار و تصورات کا دائرہ جس سرچشمے سے روشنی حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ لہٰذا مطالعے کے لیے فکر و شعور اور جذبہ و احساس کا جو رُخ بھی سامنے رکھا جائے، سخنِ اقبال پر اسی سرچشمے کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اب اگر اس لحاظ سے غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گو شعرا میں اقبال کا مقام کس قدر بلند اور کتنا منفرد ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا مطالعہ اس زاویے سے کیا جائے تو اُس کا جہانِ فکر و فن بالکل ہی ایک الگ انداز سے ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں دیکھنے اور سوچنے کے نئے پہلو فراہم کرتا ہے۔ مبین مرزا نے کلامِ اقبال کی فکری جہات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اس نکتۂ خیال کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے، اور اس ضمن میں اس سوال پر بھی غور کیا ہے کہ اقبال کے ہاں روایتی نعت ہمیں کیوں نہیں ملتی۔ اس پہلو سے بھی وہ ایک مضبوط دلیل کے ساتھ اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اقبال کی نعت اپنی یگانگت اور انفرادیت کا ایک اور بہت اہم حوالہ یہ رکھتی ہے کہ اقبال نے جس طرح نعت کی موضوعاتی وسعت کو کائناتی سطح تک پھیلایا اور اس کی لے کو سوزِ دروں اور جذبِ باطن سے ہم آہنگ کیا ہے، اسی طرح اُس نے نعت کی صنفی اور ہیئتی قیود کو بھی کراں تا بہ کراں کشادہ کیا ہے کہ اُس میں وجود و شہود، زمین و زماں، شاہد و مشہود اور حضوری و سپردگی کے تصورات سے تجربات تک تہ در تہ عناصر مل کر ایک ایسا کلامیہ تشکیل دیتے ہیں کہ جو کشف و الہام کی سطح کو پہنچا ہوا معجزۂ فن بن جاتا ہے۔ فن کی یہ نمود بھلا کیوں کر ایک روایتی پیرائے میں معرضِ بیاں میں آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں رواں دواں نظم کے کسی ایک مرحلے پر نعت کا ایک شعر آتا ہے اور نظم کی پوری کیفیت و معنویت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے مروّجہ سانچے میں نعتیہ اشعار پیش نہیں کیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں دو ایک شعر یا چند ایک مصرعے نظم کے مکمل سلسلۂ خیال کو حضوری کے تجربے سے ہم کنار کر سکتے ہیں، پورے کلام کو نعت کے اسلوب میں ڈھال سکتے ہیں اور سارے فکری تصورات کو نعت کی تحویل میں دے سکتے ہیں۔ فن کی یہی نمود شعر و فکرِ اقبال کی بلند اقبالی کا ثبوت ہے۔''

مبین مرزا نے اپنے مضمون میں جو نکات پیش کیے اور جو سوالات اٹھائے ہیں، وہ صرف نقدِ نعت اور نقدِ اقبال کے باب میں اضافے کا درجہ نہیں رکھتے، بلکہ خود اردو تنقید کے لیے بھی فکر و نظر کا ایک نیا دریچہ وا کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات ذاتی طور پر بڑی خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ آج اردو تنقید اور خصوصاً تنقیدِ نعت اس مقام پر آ چکی ہے کہ افکار کا ایک وسیع و عریض منظر نامہ اس کا حصہ بن چکا ہے۔

ادب کے طالبِ علم کی حیثیت سے یہ بات میں بخوبی جانتا ہوں کہ اقبال جیسے بڑے شاعر کے فن کی ایک جہت بھی حیات و کائنات کے گہرے مفاہیم کو سمجھنے میں حیرت انگیز طور پر کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں جس جہت سے اقبال کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ اِس سے پہلے اُس توجہ کا مرکز نہیں بن سکی تھی جس طرح اسے بننا چاہیے تھا۔ بہرحال اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مطالعے سے نعت گو شاعر اور نعت کے نئے ناقدین ہی استفادہ نہیں کریں گے، بلکہ یہ مضامین اور ان میں پیش کیے گئے اشارات و نکات ایک عام قاری کو بھی اپنے ادب، شاعری، تہذیب اور زمانی حقائق کو سمجھنے کے لیے نئے شعور سے ہم کنار کریں گے۔ اس شعور کی ہمیں آج ادب ہی کے لیے نہیں، زندگی کے لیے بھی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ یہ وقت کا تقاضا ہے— انفرادی اور اجتماعی حیات کی دونوں سطحوں پر۔

اس کتاب کی تالیف سے اشاعت تک مختلف مراحل پر چند کرم فرما اور دوست خلوص و محبت سے معاونت کرتے، مشورے دیتے اور ہاتھ بٹاتے رہے۔ ان میں افتخار عارف، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر معین نظامی، مبین مرزا اور عزیز احسن کا خاص طور پر میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

صبیح رحمانی

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

علامہ اقبال — بارگاہِ رسالت ﷺ میں

علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ، کشمیر میں بابا لوُلی حاجی کے نام سے مشہور مشائخ میں شمار ہوتے تھے جو بابا نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء) کے مرید تھے۔[۱] والدین ماجدین اور استاد میر حسن کی تربیت سے علامہ کی ذہنی نشوونما جس نہج پر ہوئی ہے، اس کی تفصیل مختلف کتابوں اور مقالوں میں موجود ہے۔ بچپن میں علامہ نے ایک پیشہ ور گداے مبرم کی سرزنش کی تھی تو والد مرحوم[۲] لرز گئے تھے اور اس طرح بیٹے سے خطاب کیا تھا جیسا کہ ''رموزِ بے خودی'' میں ہے:

اندکے اندیش و یاد آرِ پسر
اجتماعِ امتِ خیر البشر ﷺ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر
لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
ہر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا، بندہ را رُسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ
گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ ﷺ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت

بہرہَ از خلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

والدہ مرحومہ[۳☆] کی تربیت سے جو فیض حاصل ہوا تھا اُس کا ذکر بھی علامہ نے اس طرح کیا ہے:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

والدین ماجدین اور استاد کا ذکر ''التجاے مسافر'' میں بھی ہے:

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

استادِ مرحوم (متوفی ۱۹۲۹ء) سے مستفید ہونے کا زمانہ ایف اے کی تعلیم کی تکمیل تک رہا۔ یہی زمانہ والدین سے زیادہ قریب رہنے کا بھی تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کرچکا ہوتا، کبھی جاری رہتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہوگئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم پڑھتا ہوں، پھر یہ

سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آجاتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا، کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا،''بیٹا قرآنِ کریم اُس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبیِ اکرم (ﷺ) کے بعد قرآنِ کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ فرمایا، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضور ﷺ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہوسکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا، انسانیت کو جس طرح معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود تھا اُس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد ﷺ کی صورت میں پیش کردیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی، محمد ﷺ ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلے گویا Muhammad in the Making (تکمیلِ محمد ﷺ) کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ محمد ﷺ مکمل ہوگیا۔ بابِ نبوت بند ہوگیا۔ انسانیت اپنی معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمد ﷺ موجود ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، اتنا ہی قرآن اُس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا، کہ قرآنِ کریم اُس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔''[☆۴]

سیالکوٹ سے ۱۸۹۵ء میں ایف اے پاس کرکے لاہور آگئے۔ وہاں ۱۸۹۷ء میں بی اے اور ۱۸۹۹ء میں پروفیسر آرنلڈ کی تربیت میں ایم اے پاس کیا۔ پھر پروفیسر موصوف کی کشش نے انھیں انگلستان بلوالیا۔ ڈاکٹری اور بیرسٹری کی سند لے کر ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔[☆۵] لیکن وہاں جانے[☆۶] سے پہلے اور واپسی پر حضرت نظام الدین

اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر دہلی میں حاضری دی جس سے ظاہر ہے کہ انھیں اپنے والدین کے زیرِ تربیت اللہ والوں سے کس قدر عقیدت تھی۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں علامہ اقبال نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں کے لوگ وطنیت اور قومیت کے نظریوں کے پردے میں کم زور قوموں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس محض مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے کی گئی تھیں، اس لیے علامہ اقبال نے ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''، ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' اور ''حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں''[☆۷] کے عنوانوں سے جو نظمیں لکھی ہیں، وہ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی میں ہیں، نظم ''شمع اور شاعر'' بھی اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے جو فروری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہی وہ نظم ہے جس میں غالباً پہلی بار انھوں نے ''بے خودی'' اور ''خودی'' کے نظریے پیش کیے تھے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

پھر انھوں نے باقاعدہ اپنے مذکورہ نظریوں سے متعلق ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' مثنویاں شائع کیں۔ لکھتے ہیں کہ ''مذکورہ بالا دونوں کتابیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔''[☆۸] لیکن وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، اُن کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔''[☆۹] بہرحال ''اسرارِ خودی'' کے یہ اشعار حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جس انداز سے لکھے گئے ہیں، وہ اہلِ دل کے لیے متاعِ گراں مایہ ہے:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم است
آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم است
طور ، موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

کم تر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسبِ افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پاے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

''رموزِ بے خودی'' میں بھی جگہ جگہ حضورِ انور ﷺ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور یہ کہ:

ہست دینِ مصطفیٰ ﷺ دینِ حیات
شرحِ او تفسیرِ آئینِ حیات

پھر اس مثنوی کے آخر میں ''عرضِ حال'' ہے جس میں انتہائی خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تابِ روے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

اس نعت کے بعد قوم کے متعلق کہتے ہیں:

محفل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم

لیکن پھر عرض پرداز ہیں:

اے بصیری را ردا بخشندۂ
بربطِ سلما مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را
گردلم آئینۂ بے جوہر است
در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نا بسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اللہ اللہ کتنا خلوص ہے۔ ایسے خلوص کی مثالیں اہل اللہ کے یہاں بھی اکثر کم یاب ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

اس کے بعد پھر عرض کرتے ہیں:

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است
یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خداے عزوجل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

پھر ایک اور آرزو پیش کرتے ہیں:

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام
آرزوے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است
محرم از صبحِ حیاتم بودہ است

اپنے والد صاحب کے فیضان کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ:

از پدر تا نامِ تو آموختم
آتشِ ایں آرزو افروختم
تا فلک دیرینہ تر سازد مرا
در قمارِ زندگی بازد مرا
آرزوے من جواں تر می شود
ایں کہن صہبا گراں تر می شود
ایں تمنا زیرِ خاکم گوہر است
در شبم تابِ ہمیں یک اختر است

اس آرزو کا ذکر بعد میں کریں گے۔ ابھی خود اپنے گزشتہ حالات بھی بے کم و کاست عرض کرنا چاہتے ہیں کہ:

مدتے بالالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا باماہ سیمایاں زدم
برچراغِ عافیت داماں زدم
عقلِ آزر پیشہ از زُنّار بست
نقشِ او در کشورِ جانم نشست
سال ہا بودم گرفتارِ شکے
از دماغِ خشکِ من لاینفکے
حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ
در گماں آبادِ حکمت ماندۂ
ظلمتم از تابِ حق بیگانہ بود
شامم از نورِ شفق بیگانہ بود

اس کے بعد پھر اپنی آرزو کا ذکر کرتے ہیں:

ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند
در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانۂ چشمم چکید
در ضمیرِ من نواہا آفرید
اے زیادِ غیر تو جانم تہی
برلبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی را از عمل ساماں نبود
پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہارِ او آید مرا
شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

پھر بہت ڈرتے ہوئے اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں جس کا ذکر انھوں نے نظم ''شفاخانۂ حجاز'' میں بھی پہلے کیا تھا کہ:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں☆۱۰

اور یہ آرزو یقیناً موجبِ افتخار و ابتہاج ہے کہ:

بافلک گویم کہ آرمم نگر
دیدۂ آغازم ، انجامم نگر

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی ''رموزِ بے خودی'' کن حالات میں لکھی گئی۔ علامہ اقبال ۴/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تأثرات کے اثر میں ہیں☆۱۱۔ اُن کو عربی اسلام سے اور اُس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ اُن کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ ﷺ کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اُسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ اِن شاء اللہ دوسرے حصے (رموزِ بے خودی) میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی سے کہاں تک اُن تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جن کا تصوف حامی ہے۔

مسلمانوں کی بے حسی اور انحطاط کے اسباب و علل کا ذکر کئی جگہ علامہ نے کیا ہے۔ حضورِ انور ﷺ کی ایک حدیث کا ذکر ۱۰/جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں اس طرح ہے:

> حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ

> کرتا ہے تو اُسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملّی نے اُن کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے، مگر ہمیں ادائے فرض سے کام ہے۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے اس حصے میں بعض باتوں پر مزید روشنی پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت subtle (لطیف) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کرسکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیش تر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگر چہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو ونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بہ الفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا 'وحدت الوجود' تھی۔ ان شعرا نے عجیب و غریب اور بہ ظاہر دل فریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔[☆۱۲]

اگر علامہ اقبال کے اس نظریے کے مطابق ہمارے شعرا کا مطالعہ کیا جائے تو واقعی عجیب وغریب باتیں ظاہر ہوں گی۔قوم اور ملت کا دردِ محض حضورِ انور ﷺ سے حد درجہ محبت اور عقیدت کی وجہ سے تھا، اسی لیے 'سیرتِ طیبہ' کا مطالعہ علامہ اقبالؔ کا محبوب مشغلہ

تھا۔۳/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی، کیوں کہ رات کو ''سیرۃ النبی ﷺ'' کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا (شبلی رحمۃ اللہ علیہ) مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبوی ﷺ سے عطا ہوگا۔

حضورِ انور ﷺ سے اس عقیدت کا ذکر مولانا غلام قادر گرامی کے نام ۱۲/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے ایک مکتوب میں اس طرح ہے:

مسلم کو موت نہیں چھوسکتی کہ اُس کی قوت، حیات و موت کو اپنے اندر جذب کرکے حیات و ممات کا تناقض مٹا چکی ہے۔ شاید نضیر نامی ایک شخص تھا جو پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سخت ایذا دیتا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد جب حضور ﷺ شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمعِ عام میں آپ ﷺ نے علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اُس کی گردن اُڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اُس کم بخت کا خاتمہ کردیا۔ اُس کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی، لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی اور جس کا قلب، تأثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا، اس دردانگیز منظر سے مطلق متأثر نہ ہوئی۔ نضیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو وہ نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو حضور ﷺ اس قدر متأثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہم دردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے اور اپنی روتی ہوئی آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا، یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے۔ پھر حکم دیا کہ نضیر کے

بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے۔

غرض کہ اسی مسلم حنیف، جذباتِ متناقض یعنی قہر و محبت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرۂ اثر، اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں، بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے 'محمدیت' کا اور وارث ہے 'موسویت' کا اور 'ابراہیمیت' کا، کیوں کر کسی شے میں جذب ہوسکتا ہے؟ البتہ اس زمان و مکاں کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کرسکتا ہے اور اس کی قوتِ جاذبہ، ذوقی اور فطری نہیں، بلکہ مستعار ہے ایک کفِ پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذرّوں کو کبھی پامال کیا تھا۔

اسی انداز سے علامہ اقبال نے ایک جگہ اور بھی فرمایا:

البتہ ایک ہستی ضرور ایسی گزری ہے جس نے خود ہی ایک نظریہ پیش کیا اور خود ہی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟— وہ محمد عربی ﷺ تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام۔[۱۳]☆

یہ بات بھی محض حضورِ انور ﷺ سے انتہائی عقیدت کی وجہ سے تھی کہ وہ مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ۲/ دسمبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں:

آپ اُمتِ محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس لیے مامور من اللہ قوم کے خاص افراد ہی کو امرِالٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقۂ یاسیہ کو چھوڑ کر فرقۂ رجائیہ میں آجایئے۔ جس حقیقت کو آپ زیرِ پردہ دیکھ چکے ہیں اُس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ اِن شاء اللہ۔

اسی رجائیت کا ذکر علامہ اقبال نے اپنی نظم ''طلوعِ اسلام'' کے آخر میں کیا تھا:

کناراز زاہداں برگیرو بے باکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمِ آشکار آمد

دگر شاخِ خلیل علیہ السلام از خونِ مانم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

پھر اپریل ۱۹۲۲ء تک ''پیامِ مشرق'' چھپ گئی ہوگی اور اُس پر غالبًا ماہِ جون کے رسالہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں مولانا سلیمان ندوی کا تبصرہ شائع ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔[☆۱۴]

''پیامِ مشرق'' میں علامہ نے اپنی کشمیری نسبت کے ساتھ ساتھ حجازی دل کا ذکر بھی کیا ہے:

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

اس کتاب میں بھی انھوں نے حضورِ انور ﷺ کی خدمت میں اس طرح عرض کیا ہے:

با خدا در پردہ گریم ، باتو گویم آشکار
یارسول اللہ ﷺ ، او پنہاں وتو پیدائے من

اور ''خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا'' والی نظم میں کہا ہے:

اُمیے ﷺ بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او
واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بود ست
نظرے کرد کہ خورشیدِ جہانگیر شدیم

اور شروع میں امیر امان اللہ خان کے لیے جو اشعار ہیں، اُن میں یہ شعر کس قدر رفعت اور سربلندی کا پیام ہے:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست[☆۱۵]

ہم اوپر نظم ''طلوعِ اسلام'' کا ذکر کر چکے ہیں۔[☆۱۶] وہ ۱۹۲۳ء میں لکھی گئی جب کہ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو آزاد کرایا تھا— وہ نظم ''بانگِ درا'' میں شامل ہے جو ستمبر ۱۹۲۴ء

میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی جگہ جگہ حضورِ انور ﷺ سے عقیدت کا اظہار ہے۔ غزلوں میں سے چند اشعار یہ ہیں:

کرم اے شہِ ﷺ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

اے بادِ صبا کملی والے ﷺ سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمت بے چاری کے دیں بھی گیا ، دنیا بھی گئی

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

''بانگِ درا'' کی اکثر نظموں میں بھی یہی عقیدت نظر آتی ہے۔''بلادِ اسلامیہ''، ''ترانۂ ملّی''، ''وطنیت''، ''ایک حاجی مدینے کے راستے میں''، ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' وغیرہ دیکھیے، پھر ''حضورِ رسالت مآب ﷺ میں'' عرض کرتے ہیں:

حضور ﷺ ، دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو ، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

پھر ''زبورِ عجم'' ۱۹۲۶ء میں مکمل ہوئی اور دوسرے سال شائع ہوئی۔ اس میں بھی حضورِ انور ﷺ کے نورِ عین حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ سے جوشِ عمل حاصل

کرنا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

ریگِ عراق منتظر ، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین بازدہ کوفہ و شام خویش را☆[۱۷]

ایک جگہ یوں بھی عرض کرتے ہیں:

حکمت و فلسفہ کردہ ست گراں خیز مرا
خضرِ من ، از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

حضورِ انور ﷺ کی ہجرت بڑی مصلحت رکھتی ہے:

مصطفیٰ ﷺ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب

پھر وہ حضور ﷺ ہی کی سیرتِ مبارکہ ہے جس سے ''بے ہمہ'' اور ''باہمہ'' کا درس ملتا ہے:

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہم رو

اس کے بعد علامہ اقبال ''الٰہیاتِ اسلامیہ'' والے انگریزی خطبات کی تیاری میں مصروف رہے۔ گو کہ ''زبورِ عجم'' کی ترتیب کے وقت وہ کونسل کے ممبر بھی منتخب ہو چکے تھے اور سیاسی خدمات میں بھی پیش پیش تھے۔☆[۱۸]

انگریزی خطبات گو کہ علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء سے لکھنے شروع کیے، لیکن بہت پہلے سے یہ کام اُن کے ذہن میں تھا۔ مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام جو مکاتیب ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۲۲ء سے ان کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ یہ مکاتیب ۶۰ تا ۶۶، ۶۸ تا ۷۴، ۷۶، ۷۸ تا ۸۰، ۸۲، ۹۰، ۹۱ ہیں جن میں ان مسائل سے متعلق استفسارات ہیں جن کا ذکر ان خطبات میں آتا ہے۔ ان مکاتیب کی مدتِ تحریر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۳ء تک ہے گو کہ وہ شروع کے چھ خطبات ۱۹۳۰ء تک تیار کر چکے تھے۔ مکتوب نمبر ۱۰۶ (حصہ اوّل) میں ۵؍دسمبر ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں:

تین لیکچر امسال لکھے گئے ہیں۔ تین آئندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر ۱۹۲۹ء یا جنوری ۱۹۳۰ء میں دوں گا۔ حیدرآباد (دکن)

بھی ٹھہروں گا۔ کیوں کہ عثمانیہ یونی ورسٹی کا تار آیا ہے کہ لیکچر وہاں بھی دیے جائیں۔[☆۱۹]

علامہ اقبال نے یہ لیکچر مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیے۔ لیکن ان سے متعلق اُن کا مطالعہ جاری رہا۔ چناں چہ ساتواں لیکچر (کیا مذہب کا امکان ہے؟) Is Religion Possible? انھوں نے لندن Aristotalian Society کے لیے تیار کیا تھا جس کی تکمیل کا ذکر ۲۹رمئی ۱۹۳۲ء کے مکتوب (نمبر۱۲۳، حصہ دوم) میں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی اس میں ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہو۔ لیکچروں (خطبات) کے مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے مکتوب نمبر۱۹ (حصہ اوّل) بھی بڑی مناسبت رکھتا ہے جو ۲رستمبر ۱۹۲۵ء کو لکھا گیا تھا:

... کیا اچھا ہو کہ وہ (مولوی صاحب) شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادت و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ ''بلاغ'' امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ ''اشاعۃ القرآن'' کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے، لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروّج ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے[☆۲۰] Jurisprudence (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب

سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

پھر شرعی تقاضوں اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق علامہ اقبال نے اس طرح اظہارِ خیال کیا:

> شارعِ اُمی (ﷺ) نے وہ اصول بتائے ہیں کہ اُن کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہا کا تفقہ جس پر ہمارے وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے، ایک طفلِ مکتب کی ابجد خوانی معلوم ہوتی ہے۔
>
> رسالتِ محمدیہ کا مقصد صرف یہی نہیں کہ بندوں کو اپنے رب سے ملائے، بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ بندوں کو چار عناصر کی دنیا میں رہنے اور انفرادی اور ملّی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مکمل آئین بھی تیار فرمائے اور یہ آئین، خداے تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس وقت تک مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس سے مستفید ہونے کے لیے قوتِ استدلال اور پاکیزگیِ عمل کی ضرورت ہے اور ان اوصاف کی متاعِ گراں بہا ابھی تک بہ کلّی مفقود نہیں ہوئی۔ ان (مسلمانوں) کو اپنے ہر فعل کے لیے (خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی) کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے عمل میں نظامِ کار تلاش کرنا چاہیے اور جو نظامِ کار ان دو مآخذوں سے ملے، اسی پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔[۲۱]☆

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ علامہ اقبال سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۲۶ء میں کونسل کے ممبر ہوئے اور ۲۹/دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں صدر کی حیثیت سے اپنے خطبے میں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ وطن (پاکستان) کا مطالبہ کیا— پھر آپ دوسری گول میز کانفرنس (لندن) کے ممبر منتخب ہوئے۔ یہ کانفرنس ۱۷/ستمبر ۱۹۳۱ء سے شروع ہوکر یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی۔ واپسی میں اٹلی اور اسپین وغیرہ کی بھی سیر کی۔ غالبًا الٰہ آباد کے اجلاس (۲۹/دسمبر ۱۹۳۰ء) کے زمانے میں یا اس سے پہلے علامہ اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا۔ راغب احسن صاحب کے نام ایک مکتوب مؤرّخہ ۲۸/مئی ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

مدت ہوئی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج، عربی گھوڑوں پر سوار ہے — مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑوں سے مراد روحِ اسلامیت ہے۔[☆۲۲]

۱۹۳۰ء ہی میں علامہ اقبال ''جاوید نامہ'' شروع کر چکے ہوں گے۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۳۱ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

آخری نظم ''جاوید نامہ'' جس کے دو ہزار اشعار ہوں گے، ابھی ختم نہیں ہوئی، ممکن ہے مارچ تک ختم ہوجائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائن کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی طرز پر لکھی گئی ہے۔[☆۲۳]

یہ کتاب ۲۲/ اپریل[☆۲۴] تک مکمل ہوچکی تھی۔ گو کہ فروری ۱۹۳۲ء[☆۲۵] میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وہ رومی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اسرارِ معراج بیان کرتے ہیں:

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق
خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیش ایں نور ار بمانی استوار
حی و قائم چوں خدا خود را شمار
مردِ مومن در نسازد باصفات
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم راضی نشد الا بہ ذات[☆۲۶]
چیست معراج؟ آرزوے شاہدے
امتحانے روبروے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیقِ او
زندگی ما را چو گل را رنگ و بُو
در حضورش کس نماند استوار
در بماند ، ہست او کامل عیار

ذرّہَ از کف مدد تابے کہ ہست
بختہ گیر اندر گرہ تابے کہ ہست
تابِ خود را بر فزودن خوش تر است
پیشِ خورشید آزمودن خوش تر است
پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش
امتحانِ خویش کن موجود باش
ایں چنیں موجود، محمود است و بس
ورنہ نارِ زندگی دود است و بس

مردِ مومن کے لیے ان اشعار میں بھی پیام ہے اور اُس جوش اور گرمی (تاب) کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جس سے زندگی محمود بن سکتی ہے۔

معراجِ مبارک، انسانی صلاحیتوں کا منتہیٰ ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کئی مقامات پر عجیب عجیب نکات بتائے ہیں اور قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس سے بہت مفید نتائج اخذ کیے ہیں:

راہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

''بالِ جبریل'' میں ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور ''ضربِ کلیم'' میں ارشاد ہے:

ناوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج

''جاوید نامہ'' میں بارہا حضورِ انور ﷺ کے احسانات کا ذکر ہے۔ ایک موقعے پر ''خلافتِ آدم'' کے ذیل میں کس قدر خلوص سے کہا ہے:

مصطفیٰ ﷺ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ مارا در دلِ او ریختند
ملّتے از خلوتش انگیختند
می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبی ﷺ نتواں شدن☆[۲۷]

یہ آخری شعر ہزاروں نعتوں پر بھاری ہے اور سراپا حقیقت ہے۔ کتاب کے آخر میں ''خطاب بہ جاوید'' (نژادِ نو) ہے۔ اس میں 'ادب' اور 'عشق' کا خاص پیام ہے۔ لکھتے ہیں:

'دیں' سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش 'ادب'
آبروے گل ز رنگ و بوے اوست
'بے ادب' بے رنگ و بو بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب☆[۲۸]
روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا
یادِ عہدِ مصطفیٰ ﷺ آید مرا

اس لیے ''الطریق کلہٗ ادب'' بھی کہا گیا ہے۔ اور سورۃ الحجرات (۳) میں فرمان ہے:

یٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتکم فوق صَوتِ النّبی۔

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز سے اونچا مت کرو۔☆[۲۹]

''جاوید نامہ'' میں منصور حلّاج کی زبانی حقیقتِ محمدی کا راز بتایا ہے کہ نورِ محمدی ﷺ ہی سے کائنات میں بہار ہے۔ وہ جوہرِ دہر ہے اور دہر اسی سے پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے تقدیر کی تشکیل ہوتی ہے:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب ، نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جاں ستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظارِ او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ
ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بو
عبدہٗ باابتدا بے انتہا ست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست

دراصل عبدیت ہی مقامِ اقربیت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

۱۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ (بنی اسرائیل:۱) اور مقامِ محمود بھی اسی لیے ہے۔
۲۔ فاوحیٰ الی عبدہٖ مآ اوحیٰ (النجم:۱۰)
۳۔ تبرک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعالمین نذیراً۔ (الفرقان:۱)

''جاوید نامہ'' کے بعد علامہ اقبال نے اپنی مثنوی ''مسافر'' ۱۹۳۴ء میں لکھی۔ ہوا یہ کہ نادر شاہ (والیِ افغانستان) نے مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، سر راس مسعود اور علامہ اقبال کو دینی اور تعلیمی امور میں مشورے کے لیے کابل دعوت دی۔ یہ تینوں حضرات اکتوبر ۱۹۳۳ء کے آخر میں وہاں گئے اور قندھار کے راستے سے ۲؍نومبر کو واپس ہوئے۔ افسوس

کہ واپسی کے چند روز بعد ہی نادر شاہ قتل کر دیے گئے۔[۳۰]☆

مثنوی ''مسافر'' میں لکھتے ہیں:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ ﷺ ست
ایں تجلی ہاے ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ست
ایں دو قوت از وجودِ مومن است
ایں قیام و آں سجودِ مومن است
فقر سوز و درد و داغ و آرزوست
فقر را در خوں تپیدن آبروست

مثنوی کے آخر میں ظاہر شاہ (ابنِ نادر شاہ) سے خطاب ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد مارا پیامِ لا تخف
می رساند بر مقامِ لاتخف
قوتِ سلطان و میر از لا الٰہ
ہیبتِ مردِ فقیر از لا الٰہ
تا دو تیغِ لا و الا داشتیم
ما سوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

'لاَ' اور 'اِلاَّ' کا سبق بھی حضورِ انور ﷺ ہی کا عطیہ ہے جس کا ذکر اسی مثنوی میں اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہوئے بھی کرتے ہیں:

اے ز خود پوشیدہ خود را بازیاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب
رمزِ دینِ مصطفیٰ ﷺ دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی ست

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
آں مسلمانے کی بہ نیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست
تیغ لا موجود الا اللہ اوست

اسی مثنوی میں روحِ سنائیؔ (المتوفی ۵۴۵ھ) بھی حضورِ انور ﷺ سے رجوع کرنے کا پیام دیتی ہے:

مصطفیٰ ﷺ بحر است و موجِ او بلند
خیز و ایں دریا بجوے خویش بند

پھر جنوری ۱۹۳۵ء میں ''بالِ جبریل'' شائع ہوئی۔ اس میں بھی متعدد مقامات پر حضورِ انور ﷺ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

محمد ﷺ بھی ترا، جبریل علیہ السلام بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں ، وہی یٰسیں ، وہی طٰہٰ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ﷺ ، عشق خدا کا پیام

نظم ’’ذوق وشوق‘‘ میں مدینہ منور کی راہ کوہِ اضم اور وادیِ کاظمہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم[۳۱]☆ کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

اسی نظم میں یہ شعر بھی ہے:

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ﷺ ، عقل تمام بولہب

علامہ اقبال کو غالباً اواخر جنوری ۱۹۳۴ء سے گلے کی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ مکتوب نمبر ۱۵۶ (حصہ اوّل) میں لکھتے ہیں کہ ’’مجھے قریباً دو ڈھائی ماہ سے Acute Laryngitis کی شکایت ہے جس کی وجہ سے بولنے یا عام طور پر کلام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ لندن اِن شاء اللہ اگلے سال جاؤں گا۔‘‘ یہ مکتوب ۶/اپریل ۱۹۳۴ء کا ہے۔ پھر کئی دوسرے مکاتیب (مثلاً ۱۱۶، ۱۲۵، حصہ دوم) میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ۲۳/مئی ۱۹۳۵ء کو علامہ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا (مکتوب ۲۱۲، حصہ اوّل)، لیکن پھر بھی ۳۰/مئی ۱۹۳۵ء (مکتوب ۲۱۳، حصہ اوّل) کو قرآن سے متعلق ایک کتاب لکھنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں۔ پھر ۳/ اپریل ۱۹۳۶ء کے خواب کا ایک مکتوب (نمبر ۲۴۵، حصہ اوّل) میں ذکر کرتے ہیں کہ:

> ۳/اپریل (۱۹۳۶ء) کی رات ۳ بجے کے قریب (میں اُس شب بھوپال میں تھا) میں نے سرسیّد علیہ الرحمہ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں، تم کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا، دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا، حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اُسی وقت کھل گئی اور اس عرض داشت کے چند شعر جو اب طویل ہوگئی ہے، میری زبان پر جاری ہوگئے۔ اِن شاء اللہ

ایک مثنوی فارسی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' نام کے ساتھ یہ عرض داشت شائع ہوگی۔ ۴/ اپریل کی صبح سے میری آواز میں کچھ تبدیلی شروع ہوئی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں رنگ (Ring) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصّہ ہے گو اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔

چناں چہ یہ فارسی مثنوی گو کہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔اس کی ترتیب اس خواب کے بعد ہی شروع ہوگئی ہوگی۔ یہ خواب اس مثنوی میں اس طرح درج ہے:

در حضورِ رسالت مآب ﷺ

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترس مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را
درجہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح تو بانگِ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ
ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو
سازِ ما بے صوت گردید آں چناں
زخمہ بر رگ ہائے او آید گراں

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ ﷺ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
ایں ز خود بیگانہ، ایں مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ
ناں خرید ایں فاقہ کش با جانِ پاک
داد ما را نالہ ہاے سوز ناک
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لا غالب الا اللہ نیست
تا دلِ او درمیانِ سینہ مُرد
می نیندیشد مگر از خواب و خورد
قُم باذنی گوے و او را زندہ کن
در دلش اللہ ہُو را زندہ کن

پھر چند اشعار کے بعد علامہ اقبال اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا علاج چاہتے ہیں:

آہ زاں دردے کہ در جان وتن است
گوشۂ چشمِ تو داروے من است
در نسازد با دوا ہا جانِ زار
تلخ و بویش برمشامم ناگوار
کارِ ایں بیمار نتواں برد پیش
من چو طفلاں نالم از داروے خویش
تلخیِ او را فریبم از شکر
خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر

چوں بصیری از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہرِ ما در است

اس مثنوی میں بھی جگہ جگہ حضورِ انور ﷺ کی خدمت میں قوم کو رجوع ہونے کا مشورہ دیا ہے:

مردِ حق باز آفریند خویش را
جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفیٰ ﷺ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

عصرِ ما ، ما را زما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰ ﷺ بیگانہ کرد

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات
گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام
نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
با نگاہے دیگرے او را نگر
حکمش از عدل است وتسلیم و رضاست
بیخِ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ ست

چوں بنامِ مصطفیٰ ﷺ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تانداری از محمد ﷺ رنگ و بو
از درودِ خود میا لا نامِ او

۱۴؍ جون ۱۹۳۶ء کے مکتوب نمبر ۱۴ (حصہ اوّل) میں علامہ لکھتے ہیں، ''ضربِ کلیم'' اُمید کہ اس ماہ کے آخر تک چھپ جائے گی۔ فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' [۳۲] اس کے بعد شائع ہوگی۔ خیال ہے کہ اس سال جولائی میں ''ضربِ کلیم'' اور یہ فارسی مثنوی ستمبر میں شائع ہوئی۔ [۳۳]

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''ضربِ کلیم'' میں سے بھی چند اشعار جو نظم ''اے روحِ محمد ﷺ'' میں ہیں، پیش کیے جائیں:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد ﷺ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اس کتاب [۳۴] میں بھی حضورِ انور ﷺ سے قوی رشتہ رکھنے کے لیے تاکید ہے:

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمد ﷺ و براہیم
دل در سخنِ محمدی ﷺ بند
اے پورِ علی رضی اللہ عنہ زِ بو علی چند؟

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قاید قرشی بہ از بخاری[☆۳۵]

اب ہم علامہ اقبال کی زندگی کے بالکل آخر دور سے متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اس دور میں انھیں حضورِ انور ﷺ کی محبت میں ہم بے تاب و بے قرار دیکھتے ہیں۔ ۱۹/ فروری ۱۹۳۷ء کے مکتوب نمبر۲۰۴ (حصہ اوّل) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب نے اُن سے ایک رباعی (قطعہ؟) مانگ لی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے:

از نگاہِ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر

علامہ نے اپنی تڑپ اور بے تابی، نیز انتہائی عقیدت کا اظہار جو اُس رباعی میں موجود ہے، اس طرح کر دیا:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا[☆۳۶] حضورِ خواجہ ﷺ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

غلام بھیگ نیرنگ لکھتے ہیں:

۱۹۳۷ء کے موسمِ سرما میں ایک روز جاوید منزل میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک صحبت رہی۔ وہ اُس وقت بہت کم زور تھے۔ سفرِ مدینہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے کہ جس قدر تھوڑی سی طاقت مجھ میں باقی رہ گئی ہے، میں اس کو مدینے کے سفر کے لیے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اقبال کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور ﷺ کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہوجاتی تھی۔ اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چوں کہ میں بارہا اُن کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا، اس لیے میں نے اُن کے سامنے

> تو نہیں کہا، مگر خاص لوگوں سے بہ طورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور ﷺ کے مرقدِ پاک پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہیں جاں بحق ہوجائیں گے۔[۳۷]☆

اسی زمانے میں مکتوب نمبر۱۱۹ (حصہ اوّل)، ۲/ دسمبر ۱۹۳۷ء کو پیر غلام میراں شاہ کے نام لکھا تھا:

> کاش میں بھی آپ کے ساتھ (حج کے لیے) چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا، لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاسکوں۔ تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے: الطالح لی یعنی گنہ گار میرے لیے ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے۔

حج اور زیارتِ مدینہ کی ایسی تڑپ کا اظہار کئی مکاتیب میں ہے۔

پیر صاحب موصوف جب حج سے واپس آئے تو اُس وقت بھی علامہ اقبال نے اُن کو خط لکھا۔ مکتوب نمبر۱۲۱ (حصہ اوّل) مؤرّخہ ۲۹/ مارچ ۱۹۳۸ء میں (یعنی انتقال سے قریب تین ہفتے پہلے) لکھتے ہیں:

> ... دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت، ہمت، اثر رسوخ اور دولت وعظمت کو حقائقِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب ﷺ کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جلد آپ کی طبیعت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو جس کی ابھی تک آپ کو توقع نہیں، افسوس ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علمِ اسلام بلند کیا، اُن کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ

> کر تباہ ہوگئیں اور آج اُن سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا۔ الا ماشاء اللہ۔ وقت تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ انھی بزرگوں کی اولاد سے کسی روحانیت کو بیدار کردے اور کلمۂ اسلام کے اعلا پر مامور کرے۔

علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر ہے کہ مولانا اسلم جیراج پوری ''یومِ اقبال'' کے موقعے پر اُن سے نیاز حاصل کرنے کے لیے تشریف لے گئے، اس سال اُن کا ارادہ حج کرنے کا تھا، لیکن بیماری اور کم زوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا بھی مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفرِ حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے، بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لیے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ اُن میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی— مکہ سے مدینے کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوعِ سخن بدلنا پڑا۔[۳۸☆]

حضورِ انور ﷺ کی محبت اور عقیدت سے متعلق دوسرے واقعات بھی ملتے ہیں۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے علامہ اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شان دار کوٹھی میں اُن کے قیام کا انتظار کیا۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً اُن کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس

> رسولِ پاک ﷺ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، اُس نے بوریے پر سوکر زندگی گزار دی تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اُس بستر پر لیٹنا اُن کے لیے ناممکن ہوگیا۔ اُٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کردیا۔ جب ذرا دل کوقرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اُسی غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانے ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے۔[☆۳۹]

مولانا مودودی یہ بھی لکھتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ اُن کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کومعلوم ہے، مگر یہ شاید کسی کونہیں معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسولِ عربی ﷺ کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کرکے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں، پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں، یہ ڈاکٹر آف فلاسفی اُن کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحے کے لیے بھی اُن کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے اُن کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اُحد پر تشریف رکھتے تھے، اتنے میں اُحد لرزنے لگا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہر جا، تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے، اس پر پہاڑ ساکن ہوگیا۔ اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس

میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں، بلکہ ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم حقیقت سے آگاہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے مادّے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں، واقعی لرز اٹھتے ہیں۔[۴۰]☆

''ارمغانِ حجاز'' علامہ اقبال کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعض مضامین کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حضورِ رسالت ﷺ کے عنوان سے جو فصل شروع ہوتی ہے، اس کا آغاز عزت بخاری کے اس شعر سے ہوتا ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

علامہ اقبال جو دل لے کر پیدا ہوئے تھے، اس کی تسکین کے لیے عشقِ رسول (ﷺ) ہی لازم تھا۔ وہ اپنی پیری کا ذکر کرتے ہوئے ایک پرند کی مثال پیش کرتے ہیں جو شام کو کسی آشیانے کی تلاش میں اُڑتا پھرتا ہے:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

پھر عالمِ خیال میں صحرائے عرب کی سیر کرتے ہیں جہاں (مدینہ طیبہ کے راستے میں) کتنے قافلے درود پڑھتے ہوئے گامزن ہیں:

چہ خوش صحرا کہ دروے کارواں ہا
درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرمِ او آور سجودے
جبیں را سوز، تا داغے بماند

پھر اس صحرا کی دردمندی کا ذکر کرتے ہیں ص:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبحِ خنداست
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرّۂ او دردمند است

اس صحرا میں مستی اور جذب کے عالم میں عراقیؔ اور جامیؔ کے اشعار گنگناتے ہوئے چلتے ہیں:

گہے شعرِ عراقیؔ را نجوانم
گہے جامیؔ زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہاے سار بانم

پھر اپنے ساتھی سے کہتے ہیں:

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپاے خواجہ ﷺ چشماں را بمالیم

اسی راہ میں حضورِ انور ﷺ کی خدمت میں اپنے مسلمان بھائیوں کی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہیں:

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست
باین خاک آفتابے را گزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق
مسلمانے زما بے چارہ تر نیست

اس مسکین ہندی غلام کے لیے سورۃ الدہر کی آیت ۸ کے مطابق حقِ غلامی مانگتے ہیں:

حقِ آں دہ کہ ''مسکین و اسیر'' است
فقیر و غیرتِ او دیر میر است
بروے او درِ مے خانہ بستند
دریں کشور مسلماں تشنہ میر است

اور اس کے لیے یہ گزارش کرتے ہیں کہ:

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او
جہانے آفریں اندر دلِ او
ہوا تیز و بدامانش دو صد چاک
بیندیش از چراغِ بسمل او

پھر مسلمانوں کے زوال کے بہت سے اسباب بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً ان کے دلوں میں غیراللہ نے جگہ کرلی ہے۔ وہ موت سے ڈرنے لگے ہیں۔ ملوکیت نے انھیں فریب دے رکھا ہے۔ مشکل پسندی سے گھبراتے ہیں۔ مکتب نے انھیں مردہ دل بنا دیا ہے۔ وہ دل ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں ''محبوب'' نہیں ہے۔ یقین سے محروم ہوگئے ہیں، اور میری بات بھی نہیں مانتے۔ پھر انتہائی عشق میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ:

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جز تو ما را منزلے نیست

بے شک حضورِ انور ﷺ ہی کے کرم سے اللہ کو پہچاننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے:

بچشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دو چارم کن بہ صبحِ من رآنی
شبم تا تابِ مہ آوردۂ تست

کیوں کہ:

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست

اور آپ ﷺ ہی کے طفیل میں:

تپیدم ، آفریدم ، آرمیدم

لیکن افسوس کہ:

ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

حالاں کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ:

چو میگویم مسلمان بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

بہرحال علامہ اقبال ایک ہی آرزو رکھتے ہیں کہ ''ما را مصطفیٰ ﷺ بس'':

بکوے تو گدازِ یک نوا بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خرابِ جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ، ما را مصطفیٰ بس

اس عشق و مستی کے عالم میں اگر کوئی ہم نوا مل جائے تو اُس سے یہی کہا جائے گا کہ:

بیا ، باہم در آویزیم و رقصیم
ز گیتی دل برانگیزیم و رقصیم
یکے اندر حریمِ کوچۂ دوست
ز چشماں اشک خوں ریزیم و رقصیم

اللہ اللہ کیا کیف و سرور ہوگا۔ اللہ پاک اُس پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائے۔ کہا جاتا ہے کہ انتقال سے ۱۰، ۱۲ منٹ پہلے یہ رباعی زبان پر تھی:

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ایک اور نعت علامہ اقبال کی یادگار ہے:

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای
اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پای تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای
اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای
اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
اُمیّے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای
فیضِ تو دشتِ عرب را مطمحِ انظار ساخت
خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای
دل نہ نالد در فراقِ ماسوائے نورِ تو
خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای[۴۱] ☆

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ جس طرح علامہ اقبال نے اسلام کو سمجھانے کے لیے ایک نئے اندازِ فکر کی تشکیل کی تھی اسی طرح حضورِ انور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے صحیح فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایسے نکات کی نشان دہی کی ہے جو عموماً اہلِ علم سے پوشیدہ ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس شعر میں بھی یہی نکات موجود ہیں:

يَا خاتَمَ الرُّسُلِ الْمُبَارِكَ صُنُوَةً
صَلّٰی عَلَیْکَ مُنَزِّلُ الْقُرْاٰنِ

ترجمہ: اے خاتم المرسلین(۱)، آپ برکت وسعادت(۲) کا وہ سرچشمہ ہیں جس پر قرآن(۳) نازل(۴) فرمانے والے نے درود وسلام(۵) بھیجا ہے۔

حواشی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیں رسالہ ''صحیفہ'' (لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء)، صفحہ ۱۔۱۲

۲۔ ان کا انتقال ۱۷/ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوا۔

۳۔ والدہ مرحومہ کا انتقال ۹/ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ رسالہ ''صحیفہ'' (لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء)، صفحہ ۱۳۱، ''مکاتیبِ اقبال''، حصہ دوم (لاہور، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۱۱ میں اقبال اور ان کے والد صاحب کے متعلق دو واقعات ملتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

۴۔ رسالہ ''فکر ونظر'' (اسلام آباد، اگست ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۱۹)، والد صاحب کی مذکورہ بالا ہدایت کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے ''بالِ جبریل'' میں فرمایا ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ ، نہ صاحبِ کشاف

۵۔ کیمبرج، لندن اور میونخ یونی ورسٹی کے علمی مشاغل کا مفصل تذکرہ مختلف کتابوں میں موجود ہے۔

۶۔ انگلستان ۱۹۰۵ء میں گئے تھے۔۱۹۰۳ء میں نظم ''ابرِ گہربار'' (فریادِ اُمت) لکھی تھی۔ ۱۱/ مارچ ۱۹۰۳ء کے مکتوب میں اس کا ذکر ہے۔

۷۔ نظم ''شفاخانۂ حجاز'' میں اقبال آرزو کرتے ہیں:

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسول ﷺ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔''

۸۔ مکاتیبِ اقبال، حصہ دوم، نمبر ۹۱۔

۹۔ ایضاً، حصہ اوّل، نمبر ۵۱

۱۰۔ ایک حدیث کی رُو سے یہ بات حقیقت بن جاتی ہے کہ حضورِ انور ﷺ سے جس قدر زیادہ عقیدت ہوگی اُسی قدر حضور ﷺ کا قرب زیادہ حاصل ہوگا۔ سحر خیزی سے بھی یہ محبت حاصل ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی سحر خیزی کا ذکر ۳۱/ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں کیا ہے۔ دیکھیں مکاتیب، حصہ دوم، نمبر ۶۵۔

۱۱۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار اکبر الٰہ آبادی کے نام مکتوبات میں بھی ہے۔ دیکھیں، مکاتیبِ اقبال، حصہ دوم، نمبر ۲۱۔۲۲۔

۱۲۔ ۱۹/ جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک مکتوب میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں؛ ''اس طرح ان لوگوں

نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کردیے ہیں۔ کاش مولانا نظامی کی دعا اس زمانے میں مقبول ہو اور رسول اللہ ﷺ پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمان پر اپنا دین بے نقاب کریں۔''

''جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہوجائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہوجاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو اُن کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ اُن کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔''

۱۳۔ دیکھیں، مکاتیبِ اوّل، حصہ اوّل، نمبر۱۲۴۔

۱۴۔ ایضاً، نمبر۵۸، لیکن حصہ دوم کے مکتوب ۹۷ میں جو ۱۹/ مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھا گیا: ''پیامِ مشرق'' کے جلد شائع ہونے کی یہ اطلاع ہے کہ ابھی طباعت ہو رہی ہے۔

۱۵۔ ''جوابِ شکوہ'' میں بھی ہے:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ، لوح وقلم تیرے ہیں

۱۶۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو علامہ اقبال کو ''سر'' کا خطاب ملا تھا۔ ۴/ جنوری کے ایک مکتوب میں (اس خیال سے کہ اب کوئی انھیں حکومت کا بندہ نہ سمجھے) لکھتے ہیں: ''قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے، اُس بزرگ ﷺ و برتر کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اِن شاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں، لیکن اُن کا دل مومن ہے۔'' پھر ۱۴/ جنوری ۱۹۲۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''میرا عقیدہ ہے کہ نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم ہوا کرتے تھے۔''

۱۷۔ ''بالِ جبریل'' میں بھی ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوے دجلہ وفرات

۱۸۔ غالباً اسی زمانے میں علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو وہ طویل مکتوب لکھا ہے جو ''مکاتیبِ اقبال'' حصہ اوّل کے آخر میں ہے۔

۱۹۔ مکتوب نمبر۱۴۶ (حصہ اوّل) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی خطبات ۲۰/ مئی ۱۹۳۰ء سے پہلے شائع ہوچکے تھے۔

۲۰۔ یہی بات مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ۸/ مارچ ۱۹۲۶ء اور ۷/ اپریل ۱۹۲۶ء کے مکاتیب میں بھی ہے۔

۲۱۔ رسالہ ''صحیفہ'' لاہور، اکتوبر ۱۹۷۳ء، صفحہ ۲۳۸۔

۲۲۔ مکاتیب، حصہ دوم، مکتوب ۹۶۔

۲۳۔ ایضاً، حصہ اوّل، نمبر ۱۰۸۔

۲۴۔ ایضاً، حصہ دوم، نمبر ۱۸۰۔

۲۵۔ ایضاً، نمبر ۱۸۶۔

۲۶۔ جلال الدین جمالی کا شعر ہے:

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

''بالِ جبریل'' کا پہلا شعر بھی اسی انداز کا ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

۲۷۔ ایک جگہ یہ شعر بھی ہے:

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

۲۸۔ ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ علامہ اقبال سخت بے چین ہیں۔ پوچھنے پر بتایا کہ ''آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار محمد صاحب کہتا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔'' (حیاتِ اقبال، ص ۱۱۵)

۲۹۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے احترام کے لیے سورۃ الاحزاب کی آیت: ۶ بھی دیکھیں۔

۳۰۔ ''بالِ جبریل'' میں بھی نادر شاہ پر چند اشعار ہیں: ''سرشکِ دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں۔''

۳۱۔ کوہِ اضم اور کاظمہ کی تلمیح قصیدۂ بردہ کے اس شعر سے ہے:

اَمْ هَبَتِ الرِّيْحُ مِن تِلْقَآءِ كَاظِمَةٍ
وَ اَوْ مَضَ الْبَرْقُ فِى الظُّلَمَآءِ مِنْ اَضَمٖ

۳۲۔ اس مثنوی کے متعلق خود علامہ کی رائے مکتوب نمبر ۱۸۷ (حصۂ اوّل) میں دیکھیں۔

۳۳۔ ''اشاریہ ہائے آثار منظوم اقبال'' (پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۷۵ء)، صفحہ ۶

۳۴۔ مکتوب ۲۲۵ (حصہ اوّل) میں علامہ لکھتے ہیں: ''اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے اور

نوائے چنگ کی تلافی Epigrammatic Style سے کی گئی ہے۔''

۳۵۔ مکتوب نمبر۱۵ (حصہ اوّل) میں علامہ اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں: قرشی سے مراد حضورِ رسالت مآب ﷺ ہیں۔ بخاری سے مراد بوعلی سینا۔

۳۶۔ اسی خجالت کا اظہار ''اسرارِ خودی'' میں بھی کیا تھا:

رزق خویش از نعمتِ دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو
تانباشی پیشِ پیغمبر خجل
روز فردائے کہ باشد جاں گسل

مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں بھی ابھی ہم یہ شعر پڑھ چکے ہیں: چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درود۔ از خجالت آب می گردد وجود۔

۳۷۔ رسالہ ''اقبال'' (لاہور، اکتوبر، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۰۔

۳۸۔ ''آثارِ اقبال''، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۹۰۔

۳۹۔ ''جوہرِ اقبال''، صفحہ ۳۹۔۴۰۔

۴۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۸۔

۴۱۔ رسالہ ''اسلامی تعلیم''، لاہور، مارچ تا جون ۱۹۷۴ء، ص ۶۔

سیّد عابد علی عابد

اقبال اور مقامِ رسالت ﷺ

یوں تو فارسی اور اردو کا شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب شاعر ہو جس نے نعتِ رسول ﷺ لکھ کر مقامِ رسالت سے اپنی عقیدت اور شیفتگی کا اظہار نہ کیا ہو، لیکن اقبال نے مقامِ رسالت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ عقیدت کے اس مقامِ پُراسرار سے لکھا ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ خدانخواستہ میری مراد یہ نہیں ہے کہ دوسرے شعرا کو رسولِ پاک ﷺ کی ذات سے عقیدت نہ تھی۔ تھی اور ضرور تھی، لیکن اس کے باوجود کوئی نقاد اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ بہت کم شعرا ایسے ہیں جن کے نعتیہ کلام میں شیفتگی کا اظہار اتنا واضح اور دل باختگی کا اقرار اتنا شوخ اور بانکا ہے جتنا اقبال کے کلام میں ہے۔ دیوانوں کے دیوان کھنگال ڈالیے، نعتیہ اشعار میں کہیں کہیں کوئی شعر کندن کی طرح دمکتا اور گوہرِ شب تاب کی طرح چمکتا نظر آئے گا، باقی عقیدت کا اظہار ہوگا۔ شعر جذبۂ محبت سے سرشار نہیں ہوگا۔ ایسے اشعار جن میں سپردگی اور ربودگی کی وہ کیفیتِ خاص پائی جائے کہ دل بھر آئے، باقی شعرا کے کلام میں خال خال ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو شعر اس جذبے میں ڈوب کر کہا گیا ہے، اس کی کیا بات ہے، عالمِ کرامات ہے، طلسمات ہے۔ اقبال سے پہلے کے شعرا کے کلام سے اس شرابِ طہور کے کچھ جام آپ کو پلاتا ہوں اردو میں یہ شرابِ سہ آتشہ نہیں ہوتی۔ اس لیے فارسی ہی کے روزن سے اس سحرِ حلال کی جھلک آپ کو دکھاتا ہوں:

مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوے تو شد بے ادبی

ہزار بار بشوئم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

تا بہ حشر اے دل از ثنا گفتی
ہمہ گفتی چو مصطفیٰ گفتی

اور ایک بزرگ نے تو قصہ ہی ختم کر دیا کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ایک صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی:

باخدا دیوانہ باش و بامحمد ہوشیار

جو اشعار میں نے آپ کو سنائے ان پر ایرانی ادبیات کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے۔ یہ شعرگوئی نہیں، اعجاز ہے، لیکن اس کے باوجود یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ اقبال نے مقامِ رسالت پر جو لکھا ہے، وہ اس سے کہیں بلند، بزرگ، پُراسرار اور معنی خیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولِ پاک ﷺ سے اقبال کی عقیدت رسم و روایت پر مبنی نہیں، بلکہ گہرے ذاتی، فکری اور عمیق سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔

اقبال کی نظر میں معلوماتِ انسانی کے ذریعے دو ہیں: ایک تو وہ مشاہدات ہیں جو حواسِ خمسہ کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں، دوسرے وہ جو بہ طریقِ کشف و الہام برگزیدہ اشخاص پر نازل ہوتے ہیں۔ اب یہ وارداتِ ذہنی کے سانچے میں ڈھل کر نازل ہوتے ہیں جو انھیں قبول کرتا ہے۔ اگر ذہن میں ذرا سی کجی ہو، قلب میں ذرا سا فساد ہو، نظر میں ذرا سی خیرگی ہو تو واردات کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ یہ بڑا پُراسرار مقام ہے۔ بڑا نازک مقام ہے۔ یہاں لغزشِ پا ہوئی تو تحت الثریٰ سے ادھر کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اقبال نے اسی مقام کے متعلق ہمیں متنبہ کیا ہے:

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

یہ وہی مقام ہے جہاں بعض اوقات بڑے بڑے برگزیدہ صوفیوں کے پاؤں لڑکھڑا جاتے ہیں اور طامات وخرامات کا وہ طومار تیار ہوتا ہے جس نے دینِ محمدی ﷺ کو مکدر کر کے رکھ دیا ہے۔ انا الحق کا نعرہ اسی مقام سے بلند ہوتا ہے، ذہنی استعداد کی کج روی یہیں سے ظاہر ہوتی ہے، بعض اوقات تو اس مقامِ حیرت پر پہنچ کر انسان انانیت کے شبنمستان میں ایسا گم ہوجاتا ہے کہ پیمبری کے دعوے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ واردات صرف برگزیدہ ذہنوں پر نازل ہوتی ہیں، لیکن بعض اوقات نہایت سلجھے ہوئے ذہن اور دماغ بھی ان واردات کے صحیح کیف سے ناآشنا رہتے ہیں۔ صورتِ پیام مسخ ہوجاتی ہے۔ اس لیے انسانی معلومات کا یہ ذریعہ یعنی واردات بہ ذریعہ کشف ہر چند کہ نہایت دل فریب اور معنی خیز ہے، لیکن نہایت گم راہ کن بھی ہوسکتا ہے۔

اقبال نے جب ان تمام برگزیدہ ذہنوں کی واردات کا مطالعہ کیا جو کشف اور الہام کو اپنا سرمایۂ علم بیان کرتے تھے تو اسے سخت مایوسی ہوئی ہر جگہ کجی نظر آئی۔ ہر جگہ خیرگی کے آثار پائے، ہر جگہ ژولیدہ مغزی کا ثبوت ملا۔ مغرب اور مشرق کے تمام فلسفی، تمام صوفی، تمام مفکر اس ذریعۂ معلومات یعنی وارداتِ کشفیہ کے بارے میں اقبال کی تسلی نہ کرسکے۔ اس لیے کراہ کر کہا:

درماں کجا کہ درد بدرماں فزوں شود
دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیائی
از من حکایتِ سفرِ زندگی مپرس
درساختم بدرد وگزشتم غزل سرائی

پھر کہا:

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو است
ساقی بیار بادہ و بزمِ شبانہ ساز
ما را خراب یک نگہِ محرمانہ ساز

مشرق ومغرب کے مفکروں اور فلسفیوں سے مایوس ہوکر فلسفے کی موشگافیوں اور علم الکلام کی نکتہ طرازیوں سے دل شکستہ ہوکر جب اقبال اس ذاتِ گرامی کی سیرت کے مطالعے کی طرف لوٹا جسے عقیدت نے سیّد مکی مدنی العربی کہہ کر پکارا ہے تو اسے معلوم ہوا کہ یہ وہ ذہنِ برگزیدہ ہے جس میں کجی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ یہ وہ نظرِ پاک ہے جس میں خیرگی کا نشان تک نہیں ہے۔ یہ وہ مصدرِ کشف ومحورِ الہام ہے جس کی استعداد ذہنی مقامِ عروج تک پہنچی ہوئی ہے کہ وارداتِ الہامی کو بعینہٖ بغیر کسی تصرف کے اس طرح پیش کرتی ہے کہ نہ واردات کا کوئی پہلو بیان ہونے سے رہ جاتا ہے، نہ کوئی پہلو ایسا شامل ہوجاتا ہے جو واردات کا جزو نہ تھا۔ اقبال نے جو اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اسلام درحقیقت اس جوہرِ عشق کا نام ہے جو فطرتِ ازلی نے صلاحِ خیر کے حصول کے لیے ضمیرِ انسانی کے پوشیدہ ترین گوشوں کو ودیعت کر رکھا ہے تو اقبال کو اب اس مردِ کامل کی تلاش تھی جو اس جوہرِ عشق کا کامل ترین مصدر ہو۔ اقبال کو رسولِ پاک کی ذات اس جوہر کی مصدر نظر آئی، ان کی ذات میں سوز و ساز، ذکر وفکر، علم وعمل، بصارت و بصیرت، خرد اور نظر گھل مل کر اس طرح حل ہوگئے تھے کہ فقیری اور شاہی کا یہ اجتماع چشمِ فلک نے نہ پہلے دیکھا، نہ پھر دیکھے گی۔ اب آپ اندازہ کرلیجیے کہ جب اقبال کی جستجو ختم ہوئی ہوگی، جب اس کے دلِ بے قرار کو سکون ملا ہوگا، جب فلسفے کے بخشے ہوئے اضطراب کے بجائے اسے نعمتِ اطمینان میسر آئی ہوگی تو اس پر کیا گزری ہوگی، ایک عالم بیت گیا ہوگا۔ اسی عالم میں اقبال رسولِ پاک ﷺ سے مخاطب ہوتا ہے، اسی عالم میں اقبال رسولِ پاک ﷺ کی عقیدت میں سرشار ہوکر شعر کہتا ہے، میں اس عالم کے ارتقا کی رفتار آپ کو دکھاتا ہوں، پہلے خدا کی زبان سے یہ کہا:

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہوجا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہوجا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہوجا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہوجا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اجالا کردے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پھر اقبال اس مقام سے ذرا آگے بڑھا اور عقیدت کے اس مقامِ پُر اسرار تک پہنچا جسے عشق کہتے ہیں، اس کیفیت میں اس نے کہا:

باخدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یارسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

پھر اور آگے بڑھا، رسول ﷺ کی ذاتِ گرامی کو تمام فیوض کا منبع قرار دیا۔ جب دستِ طلب دراز کیا، انھی کے سامنے دراز کیا۔ جب کچھ مانگا، انھی سے مانگا۔ جب پکارا، انھیں کو پکارا کہا:

روے تو ایمانِ من قرآنِ من
جلوۂ داری دریغ از جانِ من
از زیانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمے گردد متاعِ آفتاب

یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق شاد عظیم آبادی نے اپنے دو نہایت لطیف اشعار میں اشارہ کیا ہے:

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں
پاؤں ٹوٹے تو گئی دربدری شکرِ خدا
اب یونہی تا بہ ابد آپ کے در پر ہم ہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ اقبالؔ کی عقیدت رسولِ پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی سے نہایت عمیق ذاتی فکر پر مبنی ہے، اب اس فقرے کی نہایت اجمال سے گرہ کشائی کرتا ہوں۔ فلسفۂ ادیان کے تمام ماہر جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ آریائی دماغ اپنے پیمانۂ فکری کی ساخت و ریخت میں کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ حقیقت کو پارہ پارہ کر کے دیکھتا ہے، بلکہ تاریخ پکار پکار کر یہ بھی کہہ رہی ہے کہ آریائی قوموں ہی پر کیا موقوف ہے، قریباً تمام اقوام ان خوف ناک امراض کا شکار رہی ہیں جس کو علامہ مرحوم دوئی کہتے ہیں، بابلیوں، مصریوں، یونانیوں اور ہندوستانیوں کے خرافاتِ علم الاصنام یعنی ان کی دیومالا کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حقیقتِ مطلقہ کو پارہ پارہ کرنے میں انسانی دماغ نے کیسی کیسی جدتیں کی ہیں۔ کہیں مظاہرِ فطرت کو پوجا جا رہا ہے، یہ تریمورتی مورتی ہے، شو ہلاک کنندہ، وشنو قائم دارندہ، برہما پیدا کنندہ۔ یہ تثلیث ہے، باپ بیٹا اور روح القدس، کہیں صبح و شام کو خیر و شر کی ازلی پیکار کا نمونہ سمجھ کر ان کی پرستش کی جا رہی ہے، صبح کی دیوی اوشا ہے، علم کی دیوی سرسوتی ہے، بجلیوں کے بادشاہ اِندر ہیں، کہیں خیر و شر کی قوتوں کو خدا مان کر ان کی جنگ کا تماشا دکھایا جا رہا ہے، یہ یزداں ہیں، یہ اہرمن ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گویا انسانی دماغ حقیقتِ مطلقہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ایران میں اس دوئی نے جو کرشمے دکھائے ہیں، ان کی داستان بڑی دل چسپ

ہے۔ زرتشت سے لے کر مانی اور مزدک تک سب کے یہاں اس خوف ناک مرض کے آثار نظر آتے ہیں۔ کہیں نور وظلمت کا مقابلہ ہے، کہیں خیر و شر برسرِ پیکار ہیں۔ کہیں رشی دیوتا اور آسو جنگ کر رہے ہیں۔ سب کچھ ہے، نہیں ہے تو حقیقتِ کاملہ کا ادراک نہیں ہے، وحدتِ مطلقہ کا احساس نہیں ہے۔ ہمارے پرانے شاعروں کو کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ وہ اس مرض کے شکار ہیں، چناں چہ غالبؔ نے اپنے لطیف انداز میں کہا:

رموزِ دیں نہ شناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

لیکن اقبال نے اس مرض کو صاف دیکھا اور واشگاف الفاظ میں ہندی مسلمان کو اس مرض کی طرف توجہ دلائی، کہا:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے
جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

اقبال کا خیال ہے اور بالکل درست خیال ہے کہ اسلام نے رسولِ پاک ﷺ کے ذریعے، ان کی تعلیم کے ذریعے، ان کے افعال کے ذریعے وحدتِ مطلقہ اور توحیدِ کامل کا ایک نہایت واضح تصور پیش کیا اور اس تصور کے تمام اسرار و رموز فاش کیے تاکہ اقوامِ عالم کے اس خوف ناک مرض کا علاج ہو سکے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ذات میں مشاہدات و واردات، سوز و ساز، دین و سلطنت، فقر و شہنشاہی اس طرح سموئے گئے کہ خود ان کی ذات دوئی کے تصور کے خلاف ایک زندہ ثبوت توحید کے نکتے کی تفسیر اور حقیقتِ مطلقہ کی وحدت کی دل نشین برہان بن کر رہ گئی۔ اقبال نے اس طرف یوں اشارہ کیا:

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

افسوس ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے بعد بہت کم لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا کہ دوئی کا خوف ناک مرض اور دل فریب صورتوں کا روپ دھار کر اسلام کے عقائد میں شامل ہوگیا۔ عجمی اور مجوسی اثرات دوئی کو مختلف شکلوں میں قبول کرکے چپ چاپ اسلام میں شامل کرتے رہے۔ اسماعیلی اور سبائی دعوتوں کے زیرِ اثر یہی دوئی عجب عجب رنگوں میں ظاہر ہوئی۔ حقیقت کے دو ٹکڑے کیے گئے۔ ایک کو شریعت کا نام دیا گیا، ایک کو طریقت کہہ کر پکارا گیا، اور اس خوف ناک تصور پر بڑے بڑے سمجھ دار شاعروں نے بہ زعمِ خود مضامینِ عالیہ کی بنیاد رکھی:

پوچھا دل سے یہ میں نے عشق کی راہ
کس طرف مہربان پڑتی ہے
کہا اس نے کہ نے تو ہندوستاں
نہ سوئے اصفہان پڑتی ہے

یہ دوراہا جو کفر و دین کا ہے
دونوں کے درمیان پڑتی ہے

صرف یہی نہیں معانیِ قرآن کی وحدت پر کاری ضرب لگائی گئی کہ تنزیل کے ظاہری معنی کچھ اور ہیں، وہ عوام کے لیے ہیں، باطنی کچھ اور ہیں، وہ خواص کے لیے ہیں۔ مشائخِ صوفیا نے ایک نئے مسلک کی بنیاد رکھی جس میں مراسمِ اسلامی بجا لانے کے بجائے تزکیۂ قلب پر زور دیا گیا۔ حج، نماز، روزہ، زکوٰۃ ساقط کردیے گئے، اس کی بجائے خود فراموشی، وجد اور ریاضت کو قربِ خداوندی کا وسیلہ بنا دیا گیا۔ یہ طریقہ مسلکِ محمدی ﷺ نہ تھا۔ اس مسلک سے ہٹ کر عجم نے جو ظلم عرب پر ڈھایا ہے، اس کے خلاف اقبال نے نہایت شدید صحت مند، قوی احتجاج کیا اور پکار کر کہا:

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش
تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

ہم لوگ اندازِ سیاست اور طرزِ حکومت کے معاملے میں کنکھیوں سے مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں، لیکن وہاں اس مرضِ دوئی کا یہ عالم ہے کہ سلطنت اور دین میں جدائی ہے، اخلاق اور معاشرت میں جدائی ہے، عرفان اور سائنس میں جدائی ہے، اس سے جو خوف ناک ذہنی اور روحانی امراض پیدا ہو رہے ہیں، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جس دن سے یہ دوئی اپنے شدید رنگ میں ظاہر ہوئی، مغرب کو کوڑھ ہوگیا ہے اور آخر یہ جزام کا مرض اس وجودِ مریض کو فنا کر کے رہے گا۔

دوئی مغرب میں ہو یا مشرق میں اقبال نے اس کا علاج ایک ہی تجویز کیا ہے، رسولِ پاک ﷺ کی ذاتِ گرامی سے عقیدت، جن کی زندگی دوئی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر احتجاج تھی۔ جب کوئی شخص کسی رنگ میں کسی شکل میں اسلام میں دوئی کو رواج دینا چاہتا ہے تو اقبال اس گم راہ کو علی الاعلان ٹوک کر مقامِ محمدی ﷺ کی یاد دلاتا ہے۔ حسین احمد مدنی سے اقبال نے پکار کر کہا:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ ﷺ عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبال کے خیال میں ہر وہ فتنہ جو ملتِ اسلامیہ کے لیے مہلک ثابت ہوسکتا ہے، ہر وہ مرض جو اسلام کے نظامِ حیات کو گھن کی طرح کھا سکتا ہے، ان سب کا علاج یہ ہے کہ مسلمان اپنی عقیدت کو رسولِ پاک ﷺ سے استوار کرے، یہاں تک کہ اس عقیدت کو مقامِ عشق تک پہنچا دے۔ انھی کے قول سے استدلال کرے، ماضی کے فعل

سے استشہاد انھی کی سیرت کو نمونہ بنائے، انھی کو پکارے، انھی کو بلائے، یہی ملتِ اسلامیہ کے ہر مرض کا علاج ہے، یہی کتاب اور سنت کی پیروی ہے۔ یہی اسلام ہے، باقی سب طامات اور خرافات ہے۔ اب آپ خود غور فرما لیجیے کہ رسولِ پاک ﷺ کے متعلق جب خود اقبال کا یہ خیال ہو تو وہ عقیدت کے کس مقام میں ہوگا، محبت کی کس منزل تک پہنچ گیا ہوگا اور جب رسولِ پاک ﷺ کا ذکر کرتا ہوگا تو کس طرح سرشار ہو کر کرتا ہوگا۔ اقبال کی سرشاری کی یہ کیفیت ہے کہ اس نے نہایت وضاحت سے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کرنا ممکنات میں سے ہے، لیکن مقامِ رسالت اور شانِ نبوت سے انکار کرنا محال ہے اور اسی پر خاتمۂ کلام ہے:

می توانی منکرِ یزداں شدن
منکر از شانِ نبی نتواں شدن

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق

اقبال کی نعت گوئی

نعتیہ شاعری کی تاریخ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا آغاز جس ماحول میں ہوا وہ خالص عربی تھا جہاں صادق البیانی شعر کا اصل وصف سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے اس دور کی شاعری زندگی سے قریب تھی۔ دورِ اوّل کی نعتیہ شاعری میں قرآنی اسلوب پایا جاتا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کے معنوی اوصاف کا بیان ہے۔ جہاں اوصافِ حسن کا بیان آ گیا ہے وہ بھی حقیقت سے بعید نہیں ہے، اس لیے کہ اصحابِ رسول ﷺ نے جمالِ محمدی ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور حسن و جمال کا سارا نقشہ ان کی نظروں میں تھا۔ وقت کے ساتھ نعتیہ شاعری کا انداز بدلتا گیا اور اس میں حکمت آفرینی کے بجائے جذباتی عقیدت مندی کا رنگ غالب ہوگیا۔ عجمی تصوف نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس رنگ کو اور نکھارا۔ اب محبانِ رسول نے جذباتی عقیدت مندی اور خیالی بدمستی کو اصل ایمانی کیفیت سمجھ لیا جس نے اُمتِ مسلمہ کی عملی اور مجاہدانہ طاقت کو نقصان پہنچایا۔

فارسی نعت گو شعرا میں سنائیؔ کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے نعتیہ مضامین کو مباحث کے طور پر پیش کیا۔ ان کے خیالات میں حکیمانہ گہرائی، ذہنی پختگی اور الہامی برجستگی پائی جاتی ہے۔ فرید الدین عطار اور نظامی کے یہاں بھی روح افزا نعتیں ملتی ہیں۔ خاقانیؔ کا قصیدہ اپنے شعری محاسن کے لیے مشہور ہے۔ مولانا رومؔ کے دیوانِ غزلیات میں نعتیہ اشعار کے علاوہ ان کی شہرۂ آفاق مثنوی کے دفتر میں مختلف مباحث کے تحت

حقیقتِ مصطفوی ﷺ کا حکیمانہ اور عارفانہ بیان ملتا ہے جس میں زندگی کے مسائل سمجھانے کے لیے شاعرانہ تمثیلات کا طرز اختیار کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ سعدیؔ، امیر خسروؔ، جامیؔ، عرفیؔ، قدسیؔ وغیرہ کے کلام میں جوش، خلوص، تڑپ اور عرفان کی جامعیت پائی جاتی ہے۔

ان عظیم نعت گو شعرا کی فہرست میں گوظہور کے لحاظ سے علامہ اقبالؔ سب سے آخر میں ہیں، لیکن فضیلت کے اعتبار سے مولانا رومؔ کے زیرِ اثر، سب سے اوّل ہیں۔ اس فضیلت کے کئی وجوہ ہیں اور اس درجے تک پہنچنے کے لیے شاعر کو ذہنی ارتقا کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ پہلے تو وہ خاکِ وطن کے پرستار تھے اور ہر چیز میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھتے تھے۔ پھر جب یورپ پہنچے تو ان میں نیا شعور بیدار ہوا اور ان کا شغف قرآن سے بڑھ گیا۔ مطالعۂ قرآن نے درک و بصیرت کے ساتھ مختلف علوم سے آگاہی بخشی۔ انسانِ کامل کے تخیل سے متعلق اقبالؔ کے ذہنی ارتقا کی بنیاد یہیں قائم ہوئی۔ چناں چہ ''مکاتیبِ اقبال''، حصہ اوّل کے آخر میں ڈاکٹر نکلسن کے نام جو مکتوب سخت کوشی سے متعلق ہے، اس میں لکھتے ہیں:[۱]

> وہ (معترض) انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے غلط بحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر نطشے کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل سن ۱۹۰۷ء میں انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔

مطالعۂ قرآن نے علامہ کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا اور اب قرآن ان کی فکر کا محور بن گیا۔ چناں چہ وہ ''رموزِ بے خودی'' میں بہ عنوان ''عرضِ حالِ مصنف بہ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' لکھتے ہیں:

محفل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۲]

قرآن مجید کے متعلق علامہ اقبالؔ کے تأثرات ملاحظہ فرمائیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں
اندر و تقدیر ہاے غرب و شرق
سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق[۳]

مطالعۂ قرآن میں تفکر اور تدبر کے ساتھ یہ احساس بھی علامہ کے شاملِ حال رہا کہ گویا ان پر قرآنِ مجید نازل ہو رہا ہے۔ چناں چہ اسی تعلق سے نزولِ قرآن کے بارے میں اقبالؔ فرماتے ہیں:

> میرے والد نے فرمایا، ''بیٹا قرآن اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔'' میں حیران تھا کہ نبیِ کریم ﷺ کے بعد قرآنِ کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا— فرمایا، '''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضورِ انور ﷺ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہوسکتا؟''

میں پھر حیران ہوا، تو فرمایا، ''انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا مقصود تھا، اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد ﷺ کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی میں محمد ﷺ ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلے Mohammad in the Making (تکمیلِ محمد ﷺ) کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا، البتہ شعورِ انسانی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی، حتیٰ کہ محمد ﷺ مکمل ہوگیا اور نبوت اب بند ہوگئی۔ انسانیت اپنی معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمد ﷺ موجود ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔

اسی مطلب کو ''بالِ جبریل'' میں اس طرح ادا کیا ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف
(ص۱۳)

''اسرارِ خودی'' میں لکھتے ہیں:

شعلہ ہاے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ بر فروخت
(ص۱۳)

قرآنِ مجید کے مطالعے سے علامہ اقبال کی غرض یہ تھی کہ قلب محمدی ﷺ نسبت پیدا کرے۔ چناں چہ نیاز الدین خان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب محمدی ﷺ نسبت پیدا کرے۔''

اقبالؔ کے عشق کے دو رُخ ہیں، ایک عشق قرآن سے ایک عشق خلقِ قرآن سے۔ اس لیے قرآن پڑھنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان کا قلب نسبتِ محمدیہ ﷺ کی

تولید کرے اور وہ محمدی المشرب بن جائیں۔ اس طرح یہ محض فضلِ ایزدی تھا کہ انھیں حقیقتِ محمدی ﷺ سے خاص محبت پیدا ہوگئی جو ساری محبتوں پر غالب آگئی اور یہ غلبۂ محبت اس حد تک بڑھا کہ آخر میں حضورِ کریم ﷺ کا نامِ مبارک زبان پر آتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ چناں چہ اسلم جیراج پوری سے گفتگو کے دوران حج کو جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ فرمایا، ''میں دو سال سے ارادۂ حج میں ہوں۔'' پھر وہ اشعار پڑھے جو حج کے لیے کہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے:

تو باشی اینجا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

تو ان کی آواز بند ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

حبِ رسول ﷺ کا یہ والہانہ جذبہ اس حد تک بڑھا کہ گو مزاجاً ہر حدیث کو قبول کرنے میں احتیاط برتتے، ہر وہ حدیث جو فضیلتِ رسول ﷺ اور معجزے سے متعلق ہوتی، فوراً قبول کرلیتے۔ چناں چہ ایک دن جب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا ذکر آیا کہ حضور رسالت مآب ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ احد تشریف لے گئے اور احد کانپ اٹھا تو علامہ کہنے لگے، یہ محض استعارہ نہیں، اور پھر درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے رہے، ''یاد رکھو یہ محض استعارہ نہیں۔'' [۵]

غرض یہ ہے کہ اب علامہ کی فکر و نظر کا محور حقیقتِ محمدی ﷺ بن گئی جسے ان کے تصورات کا محور کہنا چاہیے۔ رسولِ کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں انھیں کتابِ زیست کی کھلی ہوئی تفسیر نظر آئی جس میں وہ زندگی کے جملہ مسائل کا حل پاتے ہیں۔ وہ عشقِ رسول ﷺ کے مضمون کو سو سو طرح باندھتے ہیں۔ جمالِ محمدی ﷺ سے خود بھی مسحور ہوتے ہیں اور قارئین کو بھی مسحور کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنا دیا اور اپنے فن کو قوم کی مسیحائی کے لیے وقف کردیا۔

مولانا روم کی مثنوی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ہست قرآن در زبانِ پہلوی، اور علامہ اقبال نے بھی آخری عمر میں یہی مشورہ دیا تھا کہ قرآن اور مثنویِ مولانا روم پڑھ لینا،

جلائے ایمانی کے لیے کافی ہے، لیکن علامہ اقبال کے بیش تر کلام پر ہست قرآن در زبانِ پہلوی کا مضمون صادق آتا ہے، اس لیے کہ ان کی شاعری کی اصلی روح خلقِ قرآن کی ترجمانی ہے جس کی بنا پر ان کے افکار کا سررشتہ ذاتِ نبی ﷺ سے کسی نہ کسی طور پر مل جاتا ہے۔ چناں چہ فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کی شانِ نزول بھی وہ خواب ہے جس میں سرسیّد کہہ رہے تھے کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضورِ کریم ﷺ سے کیوں نہیں کرتے۔ چناں چہ در حضورِ رسالت مآب ﷺ کے عنوان سے نعتیہ اشعار لکھے۔ پھر وہ بیرونِ ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث سے ایسے متأثر ہوئے کہ ان کے اشعار نے ایک مستقل مثنوی کی شکل اختیار کر لی۔ ''در حضورِ رسالت مآب ﷺ'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:[۲]

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکر انس و جاں
تو صلواتِ صبح تو بانگِ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خداہا ساختیم از گاوٴ خر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردهٔ احسانِ تست
اے مقام و منزلِ ہر راہ رو

جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رو
در عجم گر دیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لا غالب الا اللہ نیست

آخر میں فرماتے ہیں:

اے پناہِ من حریمِ کوے تو
من بامیدے رمیدم سوے تو
بندۂ را کو نہ خواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ
جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من واے من اے واے من

بوصیریؔ نے ''قصیدۂ بردہ'' لکھ کر فالج کے مرض سے شفا پائی۔ خواب کی تحریک میں علامہ نے بھی بوصیریؔ کی طرح نعت کہی، لیکن دونوں کے مضامین مختلف ہیں۔ یہاں فراقِ رسول ﷺ میں مہجوری کا بھی بیان ہے اور لقاے حبیب کی تمنا کا بھی مضمون ہے۔ دونوں کا انداز جدا ہے۔ قرآن اور صاحبِ قرآن یعنی رسولِ کریم ﷺ کے عشق ہی سے علامہ کے شخصی عناصر کی تعمیر ہوتی ہے۔

علامہ نے نعت گوئی میں روایتی روش سے ہٹ کر ایک نیا انداز اختیار کیا ہے جسے تجدیدی کہنا چاہیے۔ انھوں نے موجودہ دور کے حالات، اس کے مزاج اور تقاضوں کی رعایت کے ساتھ مولانا روم کا شعار اختیار کیا ہے۔ چناں چہ ''ارمغانِ حجاز'' میں لکھتے ہیں:[۲۷]

چو رومی در حرم دادم اذاں من
از او آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

علامہ نے مولانا روم کی تقلید میں شاعرانہ تمثیلات کا طرز اختیار کیا اور زندگی کے بے شمار مسائل حکیمانہ انداز میں پیش کیے جن کی توضیح میں عشق کا عنصر غالب ہے۔ ان کے یہاں فکر اور ذکر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے زورِ بیاں میں عشق کو بڑا دخل ہے۔ مثنوی کے ساتھ کہیں کہیں غزل کو بھی شامل کردیتے ہیں۔ اس آمیزش سے کیف آور فضا پیدا ہوجاتی ہے جو ان کی شاعری کا مقصود ہے۔ وہ زندگی سے متعلق مختلف مسائل کے بیان میں حبِ رسول ﷺ اور اتباعِ رسول ﷺ کا مضمون موقعے کی مناسبت سے شامل کرتے ہیں۔ ان کا یہی اسلوب آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں ملتا ہے۔ چناں چہ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

گفت مالک مصطفیٰ را چاکرم
نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم بستۂ فتراک او
بر نخیزم ار حریمِ پاک او
زندہ از تقبیل خاک یثربم
خوش تر از روزِ عراق آمد شبم[۸]

آگے کی آیت میں پھر نعت کا مضمون پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

زندگانی مثلِ انجم تا کجا
ہستیِ خود در سحر گم تا کجا
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے
ز آتشِ خود سوز گر داری دلے
از پیامِ مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دوں اللہ شو

پھر ''لم یلد ولم یولد'' کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

نیست از روم و عرب پیوند ما
نیست پابند شب پیوند ما

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
رشتہ ما یک تولایش بس است
چشمِ ما را کیفِ صہبایش بس است
عشق او سرمایۂ جمعیت است
ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است
امتِ او مثلِ او نورِ حق است
ہستیِ ما از وجودش مشتق است

ایسی مثالیں بہ کثرت ہیں جو بہ ظاہر ضمنی نعت میں شمار ہوتی ہیں، لیکن نعتیہ مضامین کا اصل منبع وہی ہے جہاں حبِ رسول ﷺ کے بیان کو سیرتِ رسول ﷺ کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی تباہی اور اسلامی تہذیب وتمدن کے آثارِ قدیمہ معنوی اور صوری شکل میں دیکھتے ہیں تو اس کھوئی ہوئی عظمت میں انھیں جمالِ محمدی ﷺ کا پرتو نظر آتا ہے اور ان کا دل پُراُمید ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے کلام کا سررشتہ نبی ﷺ سے جوڑ کر مسلمانوں کو اتباعِ رسول ﷺ اور حبِ رسول ﷺ کی تلقین کرتے ہیں کہ ان کی کھوئی ہوئی دولت پھر ہاتھ آجائے۔ اس کی مثالیں علامہ کے کلام میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ ''اسرار و رموز'' میں ''پیش کش بہ حضورِ ملتِ اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت جو اشعار ملتِ اسلامیہ سے خطاب کے طور پر کہے ہیں، ان کے نعتیہ انداز کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:[۹]

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد
بر تو ہر آغاز را انجام کرد
اے نظر بر حسن تر سازادۂ
اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
اے فلک مشتِ غبارِ روے تو
''اے تماشا گاہِ عالم روے تو''

ہمچو موج آتش تہِ پا می روی
”تو کجا بہرِ تماشا می روی“
طرحِ عشق انداز اندر جان خویش
تازہ کن با مصطفیٰ پیمان خویش

اسی میں 'در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد' کے تحت لکھتے ہیں:[۱۰]

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
مست چشمِ ساقیِ بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم
خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دل بر است

اس کے علاوہ ”ارمغانِ حجاز“ میں حضور رسالت مآب ﷺ کے عنوان سے نہایت پُر جوش اور مؤثر قطعات کہے ہیں:[۱۱]

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ درصحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ
(ص۹۰۶)

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست
بجز دستِ تو مارا دسترس نیست

دگر افسانۂ غم با کہ گویم
کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست
(ص۹۲۷)

در آں دریا کہ او را ساحلے نیست
دلیلے عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست
(ص۹۲۸)

بہ چشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبحِ من رآنی
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست
(ص۹۳۴)

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
کہ او یک جوہر از آئینۂ تست
(ص۹۳۶)

بہ منزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بہ حق دل بند و راہِ مصطفیؐ رو!
(ص۹۴۷)

''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں ''عرضِ حال'' مصنف بہ حضورِ رحمۃ للعالمین ﷺ کے چند ابتدائی اشعار نعت میں اپنے گوناگوں محاسن کی بنا پر بے مثل ہیں:[۱۲]

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خواب زندگی

اے زمیں از بار گاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن ز تاب روے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تو

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

حضورِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق یہ اشعار عجیب و غریب جذبات و کیفیات کا آئینہ ہیں اور علامہ کے اس فطری ذوق کی غمازی کر رہے ہیں جس کی تربیت بچپن ہی سے ہوئی ہے اور ان کے ضمیر میں داخل ہے۔

ایک اور غیر مطبوعہ نعت رسالہ ''اسلامی تعلیم''، لاہور ۱۹۸۴ء میں چھپی تھی، اس کا مطلع یہ ہے:

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای

علامہ اقبال کے نعتیہ کلام کو اس نظر سے دیکھا جائے اور اس کے مختلف اجزا کو ایک ساتھ جوڑ کر اس کی تدوین کی جائے تو بجائے خود یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔

احیاے دین کے تعلق سے علماے دین اور مجددین نے جو ذرائع اختیار کیے، ان میں ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس خصوص میں علامہ اقبال کا فکری سرمایہ

بھی مسلمانوں کے لیے نہایت قیمتی ہے۔ انھوں نے احیاے سنت اور شعارِ مصطفوی کی بحالی کے لیے نثر کے بجائے خاص طور پر نظم کو آلۂ کار بنایا۔ جو خدمت اس خصوص میں انجام دی، اس کی مثال اسلامی شعری ادب میں نہیں ملتی۔ ان کی شاعری نے یہ ثابت کردیا کہ شاعری بھی پیغمبری کا ایک جزو ہے۔ تبلیغ کا یہ انداز اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ قوم نے اصلاح کی راہ میں ان کی کڑی تنقید کو بھی انگیز کرلیا۔ اقبالؔ نے خانقاہی صوفیوں اور علماے دین سے لے کر عام مسلمانوں تک سبھی پر سخت تنقید کی ہے، یہاں تک کہ کافر کہہ دیا:

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

ملاّ اور دو رکعت کا امام ہمیشہ اُن کا ہدف بنے رہے، مگر ان کے شعر کی سحر آفرینی کچھ ایسی ہے کہ سبھی نے داد دی اور سبحان اللہ واہ وا کہنے پر مجبور ہوگئے۔ اس لیے کہ علامہ جس لہجے میں آواز بلند کرتے ہیں وہ دلوں میں اُتر جاتی ہے اور بیان کا جادو بولنے لگتا ہے۔ اگر ان کی شاعری کو ہم پیغمبری کا ایک جزو سمجھ لیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح قرآنِ مجید حضورِ اکرم ﷺ کا معجزہ ہے اسی طرح اقبالؔ کا کلام ہست قرآن در زبانِ پہلوی ان کا معجزہ نہیں تو ان کی کرامت ضرور ہے۔

آخر میں اس قدر اور عرض کروں کہ ناقدین کا خیال ہے کہ اقبالؔ نے خدا کے ساتھ شوخیاں کی ہیں۔ بلاشبہ کی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا کلام پڑھ کر خدا کے ساتھ ان کا تعلق حریفانہ اور مساویانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے، لیکن یہ حقیقت اس جگہ مسلّم ہے کہ بارگاہِ نبوی ﷺ میں وہ جب بھی پہنچتے ہیں تو اس جذبے کے ساتھ کہ:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اس کی وجہ بھی قرآنِ کریم کی وہ ہدایت ہے جو ان کے پیشِ نظر ہے کہ:

اے اہلِ ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہیں اس طرح

ان کے روبہ رو زور سے نہ بولو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال ضائع
ہوجائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

لیکن ایسا حکم اللہ نے اپنے لیے صادر نہیں فرمایا، بلکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ گستاخی پر سرزنش کی تو اللہ تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور تنبیہ کی گئی:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اس لیے اکثر بزرگوں نے ''باخدا دیوانہ باش و بامحمد ہوشیار'' کا مسلک اختیار کیا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کہاں تک درست ہے۔

اگر علامہ کے اس قسم کے اشعار پر اعتراض ہے تو مکتوباتِ ربانی میں دفتر سوم کے مکتوب نمبر ۱۲۱ کی اس عبارت کا کیا جواب ہے:

''محبت من بحضرت حق سبحانہ ازاں جہت ست کہ او تعالیٰ رب محمد ست صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم۔''

غلبۂ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ اقبال کی نعتیہ شاعری کے محاسن بے حد و حساب ہیں۔ ان کے ذکر و فکر دونوں میں حقیقتِ محمدی بسی ہوئی ہے۔ ان کا مردِ مومن، مردِ خودی، مردِ حق اور مردِ قلندر سبھی اس آفتابِ رسالت سے اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی ساری حکمت آفرینی میں روحِ محمدی جاری و ساری ہے۔ ان کا صدق و خلوص، سوز و گداز، جوشِ بیاں اور لطیف تخیلی رنگ اسی بارگاہ کی دین ہیں:

ما ان مدحت محمدا بمقالتی
لکن مدحت مقالتی بمحمد

حواشی

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ''اقبال اور قرآن''، طبعِ اوّل، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۵۔

۲۔ اقبال، ''رموزِ بے خودی''، مشمولہ ''کلیاتِ اقبالؔ'' (فارسی)، طبع سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۶۔

۳۔ اقبال، ''جاوید نامہ'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، ص ۶۶۹۔

۴۔ ''اقبال اور قرآن'' بہ حوالہ رسالہ ''فکر و نظر''، اسلام آباد، اگست ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۹۔

۵۔ رسالہ ''اقبال''، نمبر ۳۷۴، ص ۱۰۷۔

۶۔ اقبال، ''مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق''، مشمولہ ''کلیاتِ اقبالؔ'' (فارسی)، طبعِ سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۸۴۴۔

۷۔ اقبال، ''ارمغانِ حجاز'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، ص ۹۳۸۔

۸۔ اقبال، ''رموزِ بے خودی'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال''، ص ۱۵۹ (در تفسیر سورۂ اخلاص)۔

۹۔ اقبال، ''اسرار و رموز'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، طبع سوم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مارچ ۱۹۷۸ء، ص ۸۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۹ تا ۲۱۔

۱۱۔ اقبال، ''ارمغانِ حجاز'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، ص ۱۶۔

۱۲۔ اقبال، ''اسرار و رموز'' مشمولہ ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، ص ۱۶۶۔

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری

اقبال کی رباعیات میں نعت

اقبالؔ کے آخری مجموعۂ کلام ’’ارمغانِ حجاز‘‘ میں جو رباعیاں نبیِ کریم ﷺ کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہیں، ان کا موضوع کم و بیش وہی ہے جو ’’بالِ جبریل‘‘ میں مشہور نظم ’’ذوق وشوق‘‘ کا ہے۔

’’ذوق وشوق‘‘ کے بارے میں یہ امر متعین ہے کہ وہ سفرِ حجاز کے بدل کے طور پر لکھی گئی تھی اور یہ ایک عظیم نظم ہے۔ اس میں متنوع موضوعات برتے گئے ہیں۔ شعری نقطۂ نظر بھی بدلتا رہتا ہے اور نظم کا سارا تار و پود اور در و بست موضوع کے اعتبار سے بھی اور فنّی اہتمام و انصرام کے لحاظ سے بھی اپنے اندر ایک طرح کی ندرت اور پیچیدگی رکھتا ہے۔ اقبالؔ دیارِ حبیب ﷺ کی زیارت کا شوق اور ولولہ عرصے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھے، مگر انھیں حاضری کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ فرطِ شوق اور عقیدت سے چھلکتے ہوئے اپنے مضطرب اور ناصبور قلب کا مرقع انھوں نے رباعیوں میں اُتارا ہے اور ایک تخیلی سفرنامۂ حج کی تصویر جذبات کے اُتار چڑھاؤ کے آئینے میں جڑ کر پیش کی ہے۔ یہاں تمام تر معاملہ جذباتی پیش کش اور جذباتی رویے کا ہے۔ یہاں ظن و تخمین، شعوری ارادے اور منصوبہ بندی کا گزر نہیں، بلکہ نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے شاعر کو جو بے پایاں عقیدت اور گرویدگی ہے، وہی سب سے بڑا محرک اس سفرِ حج کا ہے اور یہاں جو عنصر سب سے زیادہ اہم ہے، وہ سپردگی اور سپراندازی کا داعیہ ہے جس کا اظہار شروع

ہی میں بہ ایں طور کیا گیا ہے:

خرد از راندن محمل فروماند
زمامِ خویش دارم در کفِ دل

یہی وہ دل ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

نصیبِ او قرارِ یک نفس نیست

یہ رباعیاں عمر کے اس حصے میں لکھی گئیں جسے موسمِ سرما سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دونوں آنکھوں کی بینائی تقریباً زائل ہوچکی تھی، جسمانی سفر کے لیے تاب وتوانائی باقی نہ رہی تھی۔ دل میں شوق و اضطراب کی آگ اسی طرح فروزاں تھی، قلب اسی طرح سیماب آسا تھا۔ اس لیے شروع ہی کی رباعیوں میں سے ایک میں تخاطب کا یہ انداز اختیار کیا گیا ہے:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ان رباعیوں میں دشت، صحرا، راکب، ساربان، خرام، موج، منزل اور لالہ کے فنّی پیکر تواتر کے ساتھ مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ پیکر کچھ تو صحرائے عرب کے سفر کی مناسبت سے لائے گئے ہیں اور کسی حد تک ان کا تعلق عربی شاعری کی اس فضا سے بھی ہے جو ''بالِ جبریل'' کی بعض نظموں میں تہ نشین ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس خاص دوران اندلس کے عربی شاعروں کا کلام اقبال کے لاشعور میں جاگزیں رہا ہوگا۔ اس کا اظہار ایک رباعی میں یوں کیا گیا ہے:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ ترنہ
چو ما ہر ذرّۂ او درد مند است

اس شوق اور عقیدت کی ثمر رسیدگی کے لیے تنہائی ایک لازمی شرط ہے۔ ''لالہ'' کی

علامت سے اقبؔال کی وابستگی اور اس کے مضمرات سے کسبِ فیض مختلف سیاق و سباق میں نمایاں ہے۔ یہاں اس نے یہ روپ دھارا ہے:

بہ راغاں لالہ رست از نو بہاراں
بہ صحرا خیمہ گستر دند یاراں
مرا تنہا نشستن خوش تر آید
کنار آبجوے کوہساراں

تنہائی کی کیفیت مراقبے یعنی meditation اور حضوریِ قلب کے حصول کے لیے اقبؔال کے ہاں اور دوسرے شعرا کے مثل ایک تخلیقی بُعد رکھتی ہے۔ سفرِ حجاز کے تصور سے اپنی خوش نصیبی پر طرح طرح سے فرحت و انبساط کا اظہار کیا ہے:

چہ خوش بختے ، چہ خرم روزگارے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

اس حالتِ اضطراب میں اور اس سرخوشی میں ان کا ذہن رہ رہ کر اپنی قوم کی طرف مراجعت کرتا ہے اور وہ بے اختیار یہ کہتے سنائی دیتے ہیں:

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است

اس سلسلے میں ایک اور شعر کی معنویت بھی قابلِ غور ہے۔ رباعی کے پہلے شعر میں مسلمانوں کی خواری، تنزلی اور پستی کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔ یہاں اندازِ بیاں براہِ راست، بلکہ بڑی حد تک سپاٹ ہے، البتہ دوسرے شعر میں جہاں اس کا سبب نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ان کی محبت اور عقیدت میں کمی بتائی گئی ہے، وہاں تعلیل کا انداز بڑا انوکھا اور نرالا ہے:

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

اقبآل کی شاعری میں جن موضوعات کی تکرار مسلسل ملتی ہے، ان میں یقینِ محکم، دلِ روشن و بیدار اور ضمیرِ آتشیں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ چناں چہ ان کے اظہار کے لیے یہ پیرایۂ بیاں اختیار کیا ہے:

ز سوزِ ایں فقیرِ رہ نشینے
بدہ او را ضمیرِ آتشینے
دلش را روشن و پائندہ گرداں
ز امیدے کہ زاید از یقینے

یہاں یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ 'اُو' کی ضمیر اپنی ملت اور قوم کی طرف راجع ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، اقبآل اس تخیلی سفرِ حج میں تنہائی اور عزلت گزینی کے جویا اور مشتاق تھے، کیوں کہ یہ غالباً ان کے ذہن کو اس کے مقصد پر مرتکز رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ چناں چہ ایک جگہ اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب ، کجا مے خانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اس سفر کے لیے ان کی اپنی پونجی اتنی کم اور ہیچ مقادر ہے، یعنی دودِ نفس سے زیادہ نہیں ہے اور یہ ان کے سفر کی کفیل نہیں ہوسکتی، لیکن سینے کے اندر اپنے محبوب سے قربت اور یک جائی کا سودا سمایا ہوا ہے:

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست
بجز دستِ تو ما را دسترس نیست
دگر افسانۂ غم با کہ گوئم
کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست

اس کے بعد کی رباعی میں بڑے اندازِ سرمستی کے ساتھ اپنے اندرونی سوز و گداز

کی حالت کو واضح کیا ہے۔ دل کی اصلی حالت تو صرف نبیِ کریم ﷺ ہی پر منکشف ہوسکتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کا رازداں نہیں۔ اپنے مدعا کو زبان پر لانے یعنی اسے حرف وصوت کے وسیلۂ ابلاغ کی مدد سے ظاہر کرنا ممکن نہیں:

غریبے ، درد مندے ، نے نوازے
ز سوزِ نغمۂ خود در گدازے
تو می دانی چہ می جوید ، چہ خواہد
دلے از ہر دوعالم بے نیازے

آرزو تمام تر صرف درِ محبوب تک رسائی کی ہے۔ دل اسی درد سے مضطرب اور روح اہتزاز میں اسی تصور کی بنا پر ہے اور اس معاملے میں صبر کرنا اور جذبات کو قابو میں رکھنا غیر ضروری اور غیر فطری سی شے ہے۔ اس لیے کہ جانِ مدعا تو یہی ہے۔ درد کی انتہائی شدت اور فرطِ شوق کا منتہا حضور کا حصول ہے:

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم
از آں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفر ماہر چہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از دے دو صد فرسنگ دوریم

اس جذبے کو ذرا زیادہ دل نشیں انداز میں اور شعری کنائے کا سہارا لے کر اس طرح بیان کیا ہے اور اس طرح شعری تشدید پوری طرح وجود میں آگئی ہے:

فقیرم از تو خواہم ہر چہ خواہم
دلِ کوہے خراش از برگ کاہم
مرا درس حکیماں درد سر داد
کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم!

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں دلِ کوہ پر برگِ کاہ کی خراش ایک لطیف اشارہ ہے، اس تاثیر کے جذب ونفوذ کا، جو شاعر کے دل پر محبوب کی فرقت سے پیدا ہوسکتی ہے۔

دوسرے شعر میں تضاد ہے عقل و حکمت اور فیضِ نگاہ، دو مختلف محرکات کے درمیان، اور مؤخر الذکر کو اوّل الذکر پر ترجیح حاصل ہے کہ اس کے ذریعے دل کے معاملات کا کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچنا ممکن ہے۔ اسی سے منسلک دو اور رباعیاں ہیں۔ افزونیِ عمر کے باوجود دل حرارت اور شدت سے لب ریز ہے۔ ان معنوں میں کہ اس میں محبوب سے قربت طلب کرنے کا ولولہ توانا اور بیدار ہے۔ اسی لیے پوری شخصیت اپنی تمام تر قوتوں کی یک جائی کے ساتھ روضۂ پاک کی زیارت کے تصور سے سرشار ہے:

ہماں سوزِ جنوں اندر سرِ من
ہماں ہنگامہ ہا اندر برِ من
ہنوز از جوشِ طوفانے بہ گذشت
نیا سوداست موجِ گوہرِ من

دوسرے ہی لمحے میں لہجے اور پیکر کی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ یوں نوا سنج ہیں:

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلی ریز بر چشمم کہ بینی!
بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

منزل جتنی قریب آتی جاتی ہے، شوق و آرزو کے برومند ہونے کے امکانات روشن ہونے لگتے ہیں۔ اس فضا میں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جہانِ عشق و مستی کے دروازے کھل رہے ہیں اور دیارِ حبیب ﷺ سے مستفیض ہونے پر ایک جہانِ نو میں داخل ہونے کا احساس تازہ ہونے لگتا ہے:

چو خود را درکنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبح گاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم

اس دوران اقبال اپنے محبوب موضوع کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں یعنی کائنات کی تکوین اور تقویم میں عشق کا مقام اور مرتبہ، قلب کا عشقِ نبی ﷺ کی آماج گاہ ہونا اور خود شاعر کے عشق کے جذبے سے سرشار ہونے کے باعث نبیِ کریم ﷺ سے قربت کی خواہش اور جستجو۔ یہاں جبریل دراصل اس نقطۂ اتصال کا اعلامیہ ہے جو اُلوہی اور انسانی خودی کے درمیان موجود ہے:

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
کہ او یک جوہر از آئینہ تست

اس منزل پر پہنچ کر اب یہ فکر سر پر سوار ہوتی ہے کہ دل کی یہ سوغات قبول ہو تو کیوں کر ہو۔ پس ایک دل ہی ہے جو کبھی لالہ بن کر اُگتا ہے اور دمکتا ہے اور کبھی قطرۂ خون کی صورت اس کی تراوش ہوتی ہے۔ دراصل دل، جذبات کی کشید سے عبارت ہے اور یہی وہ پیش کش ہے جسے وہ نبیِ کریم ﷺ کے قدموں میں ڈالنا چاہتے ہیں:

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می ترادد از کنارم
قبولش کن ز راہِ دل نوازی
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

ملتِ بیضا سے اقبالؔ کا جو معاملہ رہا ہے، اسے دلِ ناصبور کی نسبت سے نوائے دل گداز، بلند کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اپنی ساری کد و کاوش اور جستجو کو مختصر طور سے تین افعال کے ذریعے اس طرح ظاہر ہے: ''تپیدم، آفریدم، آرمیدم۔'' آغازِ گفتگو میں کہا گیا تھا کہ ''زمامِ خویش دادم در کفِ دل'' اور بعد کی ایک رباعی میں اس کا اعادہ اس طرح کیا ہے، ''بہ بادِ دشت وا کردم درِ دل۔'' دشت ایک طرح سے فیضان کا اشارہ ہے۔ آخری رباعیوں میں سے ایک میں پھر اسی کو دُہرایا ہے اور اس کے پہلو بہ پہلو اپنی تنہائی کے

شدید احساس کو بھی، کہ یہ تنہائی اکتسابِ فیض کے لیے ایک غیر معمولی شرط ہے:

دلے برکف نہادم ، دلبرے نیست
متاعے داشتم غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من منزلے گیر
مسلمانے ز من تنہا ترے نیست

اس میں یہ اشارہ بھی پوشیدہ ہے کہ محبوب سے اتصال کا جذبہ ابھی کامرانی کی منزل تک نہیں پہنچا۔ یہ ابھی ناتمام بھی ہے اور ناآسودہ بھی۔ گو تگ و تاز کا عمل عرصے سے جاری ہے۔ یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ جلوت اور خلوت دونوں حالتوں میں نبیِ کریم ﷺ سے وابستگی اور پیوستگی کا یہ جذبہ تند و تیز اور تازہ و توانا رہا ہے۔ اس فقر کی دولت کی بنا پر جو شاعر اقبالؔ کو اپنے روحانی پیش رووں سے حاصل ہوئی ہے، ان میں سے رومیؔ سے اپنا سلسلہ یوں ملایا ہے:

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

یہاں یہ اشارہ شاید غیرضروری نہ سمجھا جائے کہ اقبالؔ کے اشارتی نظام میں فقر اور عشق ہم معنی اصطلاحات ہیں اور ان کے تضادات خرد اور سلطانی ہیں۔ چناں چہ اس طرف اشارہ یہ کہہ کر کیا ہے:

بہ جلوت نے نوازی ہاے من بیں
بہ خلوت خود گدازی ہاے من بیں
گرفتم نکتۂ فقر از نیاگاں
ز سلطاں بے نیازی ہاے من بیں

ایک اور رباعی میں لالہ کا استعارہ، جو اندرون کی زندگی کا استعارہ ہے، بڑی خوبی سے مستعمل ہوا ہے، لیکن یہاں بھی لالہ کی نسبت سے اپنی داخلی اور تخیلی زندگی کی تنہائی پر زور دیا ہے جو اس امر پر پوری طرح دلالت کرتا ہے کہ نکتۂ شوق کو سننے اور اس پر

جوابی ردِعمل یا تأثر ظاہر کرنے والا کوئی دوسرا موجود نہیں ہے:

شریکِ درد و سوز و سازِ لالہ بودم
ضمیرِ زندگی را وا نمودم!
ندانم بہ کہ گفتم نکتۂ شوق
کہ تنہا بودم و تنہا سرودم

نبیِ کریم ﷺ سے قربت حاصل کرنے کے تصور سے شاعر کو وہ نورِ بصیرت حاصل ہوا ہے جو مہر و ماہ کے بطون تک رسائی حاصل کرنے اور اسرارِ زندگی کو بہ تمام و کمال فاش کرنے کی استعداد بخشتا ہے اور اس کے یہ انکشاف بھی کہ مشکلاتِ ''لا الٰہ'' کے شعور سے پوری شخصیت میں ایک اضطراب کی کیفیت نمودار ہو جاتی ہے:

بنورِ تو بر افروزم نگہ را
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم ، بلرزم!
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

آخری شعر کا آخری مصرع ''بالِ جبریل'' کے اس شعر کی یاد تازہ کرتا ہے:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اس شعر میں مولوی حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبالؔ کے مابین گرم و تند بحث و تمحیص کی طرف اشارہ مخفی ہے۔ ایک آخری اہم رباعی سے اس پیچ و تاب اور جذباتی وفور اور شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اس تخیلی سفرِ حج کی زبردست اور قوی محرک رہی ہے اور جس نے اس سفر کے لیے اقبالؔ کو آمادہ بھی کیا اور انھیں سہارا بھی دیا، یہ وہ جذبۂ شوق ہے جس کا ہر تخلیقی کارنامے اور عظیم کام کے پسِ پشت موجود ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس رباعی کا شعری آہنگ حافظؔ کی یاد دلاتا ہے:

بیاباہم در آویزیم و رقصیم
ز گیتی دل برانگیزیم و رقصیم
یکے اندر حریمِ کوچۂ دوست
ز چشماں اشک خوں ریزیم و رقصیم

ان رباعیوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا مذہبی شعور اور جذبے کی شاعری اچھی شاعری ہوسکتی ہے؟ کیا یہ شاعری ایسی وابستگی یعنی commitment کا مطالبہ کرتی ہے جو آزادانہ اظہارِ رائے میں رکاوٹ بنے؟ یعنی کیا یہ تجربے کی بھرپور تجسیم پر کسی طرح کی پابندی عائد کرتی ہے؟ کیا اچھی شاعری کے لیے محض جذبے کی تندی اور اس کا اخلاص اور کھرا پن یعنی nenuineness کافی ہے؟ کیا فنّی تزئین اور آراستگی اس جذبے کے اظہار کی ضد ہے؟ دو اصناف جن کے مابین فرق کرنا ضروری ہے، وہ ہیں devotional شاعری اور مذہبی شعور کی گہرائیوں سے برآمد ہونے والی شاعری۔ یہ رباعیاں ان معنوں میں نعتیہ کلام نہیں ہیں، جو ہماری زبان کے بعض معروف شاعروں کے قلم سے وجود میں آیا ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ ان رباعیوں کی بساط وسیع ہے، یہاں کلام کا وہ مروّجہ ڈھانچا بھی استعمال نہیں کیا گیا جو نعتیہ کلام کے لیے متعین شدہ ہے۔ یہاں دو امور غور طلب ہیں: اوّل شاعر اور اس تجربے کے درمیان کامل جذباتی ہم آہنگی اور ارتباط جس کا ابلاغ اس کا اصل مقصد ہے، اور دوسرے اس خاص تجربے کا حد درجے کا ارتکاز اور موضوعاتی انداز۔ ان رباعیوں میں جس طرح کے پیکر استعمال کیے گئے ہیں، ان کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے جو جذبہ اس سفرِ حج کا محرک ہے، وہ انتہائی شغف اور شوق و اضطراب کا جذبہ ہے اور نفس سے ماورا ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مذہبی جذبے کی شاعری ناکام اس وقت ہوتی ہے جب جذبے اور تخیل کے درمیان مکمل ارتباط نہ پایا جائے، اور یہ ارتباط تجربے کے شعری پیکر میں ڈھلنے کی بجائے محض رسمی اور مقررشدہ خیالات واحساسات اور لفظیات کے سانچوں میں ادا ہوکر رہ جائے۔ یہی صورت نامذہبی یعنی secular شاعری کے سلسلے میں بھی پیش آسکتی ہے اور اس کی ساکھ کو گھٹا سکتی ہے۔ نعتیہ کلام کے پسِ پشت

جذبہ چاہے جتنا بھی حقیقی اور بے میل کیوں نہ ہو، لیکن وہ اکثر و بیش تر بندھے ٹکے سانچوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ خود شاعر کی جانب سے کسی انکشافِ قدر کی غمازی نہیں کرتا۔ معروف نعتیہ نظموں میں نبیِ کریم ﷺ سے عقیدت اور آپ کے محاسنِ اعلیٰ پر اظہارِ رائے تو ہوتا ہے، لیکن ایک تیسرا عنصر اور بھی ہے اور وہ ہے شاعر کی شخصیت اور نبیِ کریم ﷺ کی شخصیت میں اندرونی جذباتی سطح پر ادغام اور انضمام۔ اس کے ساتھ ہی جذبے اور فارم کی مقتضیات کے درمیان مؤثر اور معنی خیز ردِ عمل۔ ان سب کی غیرموجودگی منتج ہوتی ہے داخلیت کی کمی اور اندازِ بیاں کے محدود اور مروّجہ ہونے کے تأثر پر۔ اقبالؔ کی ان رباعیوں میں صورتِ حال مختلف ہے۔ ایلیٹ نے مذہبی شاعری کو minor poetry کی ایک نوع قرار دیا ہے۔ شاید اس کا اشارہ Hymns اور Carols کی طرف ہو، لیکن اعلیٰ درجے کی مذہبی شاعری بھی حقیقتِ مطلقہ کے ادراک ہی کی پیداوار ہوتی ہے اور وہ نامذہبی سیاق و سباق میں بھی پائی جاسکتی ہے، اقبال کی ان رباعیوں میں والہانہ پن بھی ہے، فنی پختگی اور ثمر رسیدگی بھی اور موضوع اور اس کے خارجی اظہار کے درمیان ایک ناگزیر مناسبت اور تعلق بھی۔ یہاں جذبے کی کشید کے ساتھ خارجی عوامل بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو روح ان رباعیوں میں نغمہ سنج ہے، وہ ایک عظیم ترین روح کے حضور ہمہ تن اضطراب ہی نہیں، بلکہ ہمہ تن عاجزی اور فروتنی بھی ہے اور محبت کے اتھاہ جذبے سے سرتا سرلب ریز اور سرشار بھی۔ یہ بہ یک وقت ایک نذرانۂ عقیدت بھی ہے اور ایک نجی اور شخصی معاملہ بھی، جس میں دوسروں کو بھی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

فکرِ اقبال میں مدحتِ رسول ﷺ

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دِیا ، تُونے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ لطف سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے یہ اشعار، جو آپ نے ابھی پڑھے، ان کی نظم ''ذوق وشوق'' میں آئے ہیں۔ انھیں آپ چاہیں تو نعتیہ اشعار کہہ لیجیے، چاہیں تو فکرِ اقبال کا اظہار کہہ لیجیے۔ چاہیں تو انھیں شاعری کا خوب صورت و منفرد نمونہ کہہ لیجیے۔ ان اشعار کو پڑھتے یا سنتے ہوئے ہمارے باطن میں سوزِ دروں کی ایک لہر موج زن ہوجاتی ہے اور ہم مدحتِ رسول ﷺ کی لَے میں فکرِ اقبال سے ہم کنار ہوجاتے ہیں۔ دُنیا کی ان ساری زبانوں میں جنھیں

مسلمان بولتے ہیں، نعت گوئی کا عام رواج ہے۔ نعت گوئی کا تعلق اظہارِ عقیدت سے بھی ہے اور عشقِ رسول ﷺ سے بھی۔ چودہ سو سال سے شاعروں نے مدحتِ رسول ﷺ کے نئے نئے اور اچھوتے پہلو تلاش کیے ہیں اور اپنے دِلی جذبات کا گہری عقیدت اور عشق کی سرشاری کے ساتھ اِظہار کیا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی مدحتِ رسول ﷺ موجود ہے۔ مدحتِ رسول ﷺ کی یہ لَے ''بانگِ دَرا'' سے لے کر ''پیامِ مشرق'' و ''ارمغانِ حجاز'' تک تسلسل کے ساتھ ملتی ہے۔ جس میں حد درجہ رنگا رنگی بھی ہے اور تنوع بھی۔ ''بانگِ درا'' کی معروف نظم ''بچوں کا قومی گیت'' میں اس کی صورت یہ ہے:

وحدت کی لَے سنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

ایک اور شعر میں اقبال مدحتِ رسول ﷺ اس طرح کرتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

ان اشعار کو دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ اقبال کی شاعری میں مدحتِ رسول ﷺ ہوتے ہوئے بھی عام نعت گوئی سے الگ قسم کی شاعری ہے۔ عام نعت گوئی میں رسولِ مقبول ﷺ کے کسی پہلو کو عقیدت و عشق کی نظر سے بیان کیا جاتا ہے جس میں عشق کی گرمی، محبت کا سوز، عقیدت کی حرارت اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات شعر میں اثر و تاثیر کو جنم دیتے ہیں۔ اقبال کے ہاں مدحتِ رسول ﷺ کی یہ صورت نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں مدحتِ رسول ﷺ ان کی فکر کا بنیادی حوالہ بن جاتی ہے۔ اقبال جو کچھ سوچتے ہیں، جو کچھ محسوس کرتے ہیں، جس زاویے سے حیات و کائنات کے مسائل اور خدا و انسان کے رشتوں کو دیکھتے ہیں، ان سب میں رسولِ خدا ﷺ کی فکر ونظر شامل و موجود ہے۔ جب اقبال اسلام کی، اس کی روایت کی، اس کی موجودہ صورتِ حال کی، مسلمانوں کی حالتِ زار کی، اُمت کی زبوں حالی کی بات کرتے ہیں تو ان کا بنیادی حوالہ رسولِ خدا ﷺ

کی ذاتِ گرامی اور ان کا فلسفۂ حیات رہتا ہے، اور یہی وہ پہلو ہے جو اقبال کی شاعری کو دوسرے نعت گویوں کی شاعری سے الگ کر دیتا ہے۔ مدحتِ رسول ﷺ ان کے ہاں صرف عقیدت مندی کا اظہار نہیں ہے، بلکہ ساری زندگی اور کائنات کا حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ رسول ﷺ اقبال کے لیے فکر و عمل کا وہ آفتابِ عالم تاب ہیں جس کی روشنی سے کائنات کی ظلمات دُور ہوتی ہیں اور آج بھی ہوسکتی ہیں۔ وہ عشقِ رسول ﷺ میں سرشار ہونے کے باوجود اپنی شاعری میں صرف اظہارِ عشق نہیں کرتے، بلکہ رسولِ خدا ﷺ کے مقاصدِ جلیلہ کو، حیات و کائنات کے بارے میں ان کے ابدی تصورات کو، ان کے مشن کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کی شاعری میں مدحتِ رسول ﷺ اقبال کی فکر کا ناگزیر حصہ بن جاتی ہے۔ مدحت کی ایک شکل تو یہ ہے کہ آپ شہنشاہِ کونین ﷺ کی براہِ راست مدحت کریں یا پھر شہنشاہِ کونین ﷺ کے اُن جلیل مقاصد کو جدید زندگی کے حوالے سے بیان کریں جن کو آگے بڑھا کر زندگی کو نیا رُوپ دیا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت سے نعت گوئی پیدا ہوتی ہے اور دوسری صورت سے اقبال کی شاعری تخلیق ہوتی ہے۔

اقبال کے سارے بنیادی تصورات میں، ان کی ساری فکر میں، خواہ وہ خودی کا تصور ہو یا عشق و عقل کا، جلال و جمال کا تصور ہو یا علم و عمل کا، خدا کا تصور ہو یا ابلیس کا، ان سب میں بنیادی حوالہ رسولِ پاک ﷺ کی ذاتِ مقدس کا حوالہ ہے اور یہ رسول ﷺ کا بنیادی حوالہ ہوتے ہوئے بھی جدید دور کا حوالہ ہے۔ مجازی و حقیقی کی تخصیص کے بغیر عشق ان کے ہاں دِلِ مصطفیٰ بن جاتا ہے۔

عشق دمِ جبرئیل عشق دِلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ اقبال کی شاعری میں مدحتِ رسول ﷺ رُوحِ محمد ﷺ بن کر ان کی ساری فکر اور ان کے سارے کلام میں سرائیت کیے ہوئے ہے۔ وہ الگ سے نعت گوئی کی طرح وجود نہیں رکھتی۔ فکرِ رسول ﷺ ان کے لیے صرف عقیدت ہی نہیں، بلکہ ساری زندگی ہے۔ اقبال کی شاعری اسی لیے رُوحِ محمد ﷺ کے

اظہار و اعلان کی شاعری ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں تخلیقی قوت پیدا ہوئی ہے اور اسی سے ان کی شاعری میں ساحرانہ اثر انگیزی پیدا ہوئی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اقبال کی شاعری، مدحتِ رسول ﷺ سے گہرے تعلق کے ساتھ ایک نئے قسم کی شاعری ہے۔ وہ دوسرے نعت گویوں کی طرح رسول ﷺ کی مدح نہیں کرتے، بلکہ رسول ﷺ کی فکر کو، اُن ﷺ کی رُوح کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ اس سے اسلام کی حقیقی رُوح، اُمتِ مسلمہ کو بیدار کرنے کا جذبہ اور قوتِ عمل کو اُبھار کر اسلام پر چلنے کا راستہ سامنے آتا ہے، جس سے رُوحِ محمد ﷺ کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب اقبال کہتے ہیں:

تو اے مولاے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی ، مرا ایماں ہے زُناری

تو اس میں مدحتِ رسول ﷺ کا ایک نیا فکری پہلو موجود و مضمر ہوتا ہے۔ اقبال دورِ جدید میں فکرِ محمد ﷺ کو سمو کر ایک بالکل نئی قسم کی شاعری تخلیق کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا بنیادی حوالہ اسلام ہے۔ وہ اسلام جسے رسولِ مقبول ﷺ نے رسولِ خدا ﷺ بن کر دُنیا کے سامنے پیش کیا:

وہ دانائے سُبل ختم الرّسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین ، وہی طٰہٰ

(۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اقبال ایک ممتاز اور اہم نعت گو

حالؔی کے بعد نعت کے موضوعات اور اسلامی قدروں کے مؤید شعرا میں سب سے ممتاز اور اہم نام اقبالؔ کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حالؔی کی طرح علامہ اقبالؔ کو بھی رسمی معنی میں نعت گو شاعر نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ ان کے یہاں رسمی انداز کی صرف ایک دو نعتیہ غزلیں ملتی ہیں۔ وہ بھی ان کے بالکل ابتدائی دور کی ہیں، مثلاً ان کی وہ نعت جس کا مطلع ہے:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اسی دور کی یادگار ہے، لیکن نعت کے غیر رسمی معنوں میں علامہ اقبالؔ اردو کے اہم ترین نعت نگار ہیں۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کہ اپنی شاعری میں سیکڑوں جگہ آنحضرت ﷺ کی سیرت و کمالات کا والہانہ اظہار کیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی پوری شاعری کا حقیقی محور سیرتِ محمدی اور اسوۂ رسول ﷺ ہے حتیٰ کہ ان کے فلسفۂ خودی کا اصل الاصول بھی یہی ہے۔ ''اسرارِ خودی'' سے لے کر ''جاوید نامہ'' تک اُن کے فکر و فن کا نقطۂ آغاز بھی رسالت ہے اور نقطۂ ارتقا و اتمام بھی رسالت ہے۔ رسالت کی تعریف ''رموزِ بے خودی'' کے ابتدائی صفحوں میں انھوں نے اس طور پر کی ہے:

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است

از میانِ بحرِ او خیزیم ما
مثلِ موج از ہم نمی زیزیم ما

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ایں کہ یک جانیم از احسانِ اوست

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو

جب کہ یہ بات صرف رسالت کی توصیف و تعریف تک نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے فلسفۂ خودی کے عناصرِ ترکیبی میں بنیادی عنصر عشقِ رسول ہی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جب خودی دوسری ارتقائی منازل سے گزر کر آنحضرت ﷺ کی محبت سے سرشار اور فقر و استغنا سے مستحکم ہوجاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں اس کے قبضے میں آجاتی ہیں:

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماں دۂ عالم شود

پنجہ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود

اس قسم کے اشعار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبالؔ نے خودی کے ذریعے جو فلسفۂ حیات پیش کیا ہے، وہ حقیقتاً دینِ مصطفوی ہی کی شاعرانہ تعبیر و تفسیر ہے۔ خودی کی تربیت و تکمیل کے لیے جب وہ آئینِ فطرت کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں تو ان کی مراد اخلاقِ محمدی اور اسوۂ رسول ﷺ کی پابندی و پیروی سے ہی ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ کریم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیر و ثبات
غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ
گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ ﷺ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

اقبالؔ کے کلام میں رسالت یا نعت کا موضوع کس حد تک دخیل ہے، ان اشعار کی روشنی میں اس کا جواب کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ اس دخل کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی شاعری رسمی انداز کی نعتیہ شاعری نہیں رہی، بلکہ ذات و صفاتِ محمدی کے بیان کے ساتھ ساتھ دینِ مصطفیٰ ﷺ کے اساسی پہلوؤں کی بھی مظہر بن گئی ہے۔ ان پہلوؤں کی تشریح و توضیح میں اکثر جگہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و سیرت کا ذکر آیا ہے اور اقبالؔ کی طبعِ عاشقانہ اور مزاجِ شاعرانہ نے ہر جگہ اس ذکر میں خاص قسم کا لطف و کیف سمو دیا ہے۔ چناں چہ اس ذکر میں اقبالؔ کے یہاں بہت سے اشعار، بہت سے ٹکڑے اور بہت سے قطعات مل جاتے ہیں جو اقبالؔ کو ایک بلند پایہ نعت گو ثابت کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان پہلوؤں کے ذکر و اذکار میں اقبالؔ نے اردو سے زیادہ فارسی سے کام لیا ہے یعنی ان کے نعتیہ اشعار زیادہ تر فارسی ہی میں ہیں۔ جرمن شاعر گوئٹے کی مشہور نظم (نغمۂ محمدی ﷺ) کا آزاد ترجمہ بھی اقبال نے فارسی میں کیا ہے۔ یہ نظم ''پیامِ مشرق'' میں ''جوئے آب'' کے نام سے شامل ہے۔ چار

شعروں کے چار بند ہیں اور اسلامی تخیل و تصورِ خیال کے حقیقی ترجمان ہیں، صرف دو بند بہ طورِ نمونہ دیکھیے:

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید
نرگس و مید و لالہ و مید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست
خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش
صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید
زی بحر بے کرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود
دریائے پر خروش! ز بند و شکن گزشت
از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گزشت
یکساں چو سیل گردہ نشیب و فراز را
از کاخ شاہ و بارہ دکشت و چمن گذشت
بے تاب و تند تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت
زی بحرِ پیکرانہ چہ مستانہ می رود
ور خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

گوئٹے کی یہ نظم جس میں اس نے اسلامی تخیل کو نہایت خوب صورت پیرایے میں جگہ دی ہے، دراصل اس کے ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی، لیکن اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔ اقبالؔ نے المانی شاعر کے نازک ولطیف خیالات کو حد درجہ شگفتہ و سادہ فارسی میں منتقل کر کے غیر معمولی کمالِ شاعرانہ کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں بھی ایک نہایت خوب صورت نعتیہ ٹکڑا ملتا ہے:

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تابِ رُوے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی
بے تو از نابود مندیہا خجّل
پیکرانِ ایں سرائے آب و گل
تا دمِ تو آتشے از گل کشود
تو وہ ہاے خاک را آدم نمود
ذرّہ دامن گیر مہر و ماہ شد
یعنی از نیروئے خویش آگاہ شد
تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب و ام گشتۂ محبوب تر

ان اشعار کے بعد اقبالؔ نے اپنے اضطرابِ عشق اور ملتِ اسلامیہ کی بدحالی کا ذکر بڑے دردمند لہجے میں کیا ہے۔ آخری شعروں میں بہ طورِ مناجات حضور اکرم ﷺ سے اُمتِ محمدی پر نگاہِ خاص کی دعا مانگی ہے۔

''جاوید نامہ'' میں جا بہ جا بڑے دل کش اور معنی خیز نعتیہ اشعار نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں فلکِ مشتری پر حلاجؔ و غالبؔ اور قرۃ العین طاہرؔہ و زندہ رود کے مکالمات کی صورت میں اقبالؔ نے جو کچھ کہا ہے، خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ''زندہ رود'' نے نظامِ حیات کی

کش مکش کے بارے میں سوال کیا تھا:

صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیا و انبیاست

اقبالؔ نے غالبؔ کی زبان میں جواب دیا:

نیک بنگر اندریں بود و نبود
پے بہ پے آید جہانہا در وجود
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمت للعالمینے ہم بود

''زندہ رود'' نے اس نکتے کو فاش تر الفاظ میں بیان کرنے کی گزارش کی تو جواب میں غالبؔ نے کہا:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمت للعالمینی انتہا است

''زندہ رود'' نے اسی قسم کا سوال حلاجؔ سے کیا۔ اقبالؔ نے حلاجؔ کی طرف سے جواب میں کہا:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

''زندہ رود'' نے مزید وضاحت کے لیے سوال کیا:

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست
سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجود

اس کے جواب میں علامہ اقبالؔ نے حلاجؔ کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے،

توحید و رسالت کے ایک نہایت نازک اور اہم پہلو کو زیرِ بحث لے آتا ہے۔ اس میں اقبال نے عبد و معبود کے رشتے سے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات و صفات کا بیان جس حسن کاری کے ساتھ کیا ہے، وہ نعتیہ شاعری کی تاریخ میں آپ اپنی مثال بن گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا معبود سے کیا اور کس نوعیت کا رشتہ ہے، اس سلسلے کے چند اشعار دیکھتے چلیے:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہمِ تو بالا تر است
زانکہ اوہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گر تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجا ست
کس ز سرِ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دمِ او عبدہٗ

فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

''ارمغانِ حجاز'' کے بعض قطعات بھی اقباؔل کی نعتیہ شاعری کے بہترین اجزا میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ ایک قطعہ تو انھوں نے آنحضرت ﷺ سے محبت اور خوف کے باب میں کچھ اس انداز سے کہہ دیا ہے کہ صاحبِ دل مسلمان کو اندر سے پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔آپ نے یہ قطعہ ضرور سنا ہوگا:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن سوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

اقباؔل کی اردو شاعری کی بھی یہی صورت ہے یعنی اساسی طور پر ان کا سارا کلام توحید و رسالت کے پاکیزہ تصورات وحکیمانہ نکات کا مظہر ہے،لیکن رسمی انداز کی نعتیہ نظمیں یا غزلیں ان کے یہاں نہیں ملتیں۔ ہاں مختلف نظموں میں درجنوں ایسے اشعار اور ٹکڑے مل جاتے ہیں جو اعلیٰ درجے کی نعتیہ شاعری کے زمرے میں آتے ہیں، مثلاً سناؔئی کے مزار کے سلسلے کی نظم میں بعض ایسے اشعار ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی محبت وعقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں:

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ
عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بعض جگہ غزلوں میں بھی نعت کے بلند پایہ شعر مل جاتے ہیں، مثلاً ''بالِ جبریل'' کی ایک غزل میں ہے:

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اقبالؔ نے حضورِ اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے اپنی بات کہی ہے اور اس انداز سے کہ نعت کے سوا ان کے اشعار کو اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا، اس مخاطبے کی ایک مثال دیکھیے:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

پروفیسر فتح محمد ملک

اقبال حضور رسالت مآب ﷺ میں

ہر چند اقبال نے رسمی معنوں میں کبھی نعت نہیں کہی، تاہم عشقِ رسول ﷺ کا یہ عالم ہے کہ اُن کا تخیل بار بار انھیں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں لے جاتا ہے، جہاں وہ ملتِ اسلامی کی زبوں حالی پر فریاد کناں نظر آتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ جب وہ قومی، ملّی اور انسانی مصائب پر غور و فکر میں منہمک ہوتے ہیں تو اچانک اُنھیں آنحضور ﷺ کی ذاتِ والا صفات تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی محسنِ انسانیت شخصیت کے رُوپ میں اچانک یاد آ جاتے ہیں اور وہ زیرِ نظر موضوع کی مناسبت سے نہایت والہانہ انداز میں آنحضور ﷺ کے فیضان کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ اِس کی ایک مثال ''بالِ جبریل'' کی وہ غزل ہے جس کے پہلے دو شعر انسانی شخصیت و کردار پر غلامی اور آزادی کے اثرات پر غور و فکر سے عبارت ہیں:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حُسنِ زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

بعد کے اشعار میں برطانوی استعمار سے پنجہ آزمائی میں یدِ بیضا کی اہمیت اُجاگر کرتے وقت اُنھیں اچانک وہ مبارک ہستی یاد آ جاتی ہے جس نے انسان کو ہر نوع کی

غلامی سے آزاد کر دیا تھا۔ چناں چہ اُن کی زبانِ قلم پر درجِ ذیل مقبولِ عام نعتیہ اشعار رواں ہو جاتے ہیں:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کُل ﷺ جس نے
غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قُرآں، وہی فرقاں، وہی یسیں، وہی طٰہٰ

اِسی طرح جب وہ فلسطین کانفرنس کے دوران دُنیائے اسلام کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں اور نام ور دانش وروں سے مل کر اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ: 'قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں' تو وہ تڑپ اُٹھتے ہیں اور اُن پر درجِ ذیل نعتیہ اشعار نازل ہونے لگتے ہیں:

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جُنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری ﷺ نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے!

ہماری دُنیا نورِ مصطفیٰ ﷺ سے محروم ہو کر تیرہ و تار ہو چکی ہے۔ چناں چہ ہمارا جہاں 'ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است'۔ اقبال سراپا نگاری کے سے رسمی موضوعات سے اعتنا

نہیں کرتے۔ اُن کی توجہ ہمیشہ باطنی اور خارجی زندگی میں اُس انقلاب پر مرکوز رہتی ہے جو آنحضور ﷺ کی مبارک زندگی اور تعلیمات سے پھوٹا تھا۔ درجِ بالا حوالہ جات میں: ’ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب‘، اور: ’غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا‘ کے سے مصرعے اُس انقلاب کے نقیب ہیں جس کے اعجاز سے گری پڑی اور پامال خلقِ خدا میں خدا کا جلوہ دیکھا جانے لگا تھا۔ حریّت، اخوت اور مساوات کی انسانی اقدار کی بازیافت کی تمنا اقبال کو بار بار آنحضور ﷺ کی انقلابی تعلیمات کی جانب متوجہ کرتی ہے اور وہ بار بار مگر ہر بار بہ اندازِ دگر آنحضور ﷺ کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں:

طرحِ عشق انداز، اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش

اقبال آنحضور ﷺ کے ظہور کو شبابِ زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ارتقاے حیات کے ساتھ ساتھ ہر خطۂ زمین اور ہر عہد کی روحانی ضروریات کے پیشِ نظر وقتاً فوقتاً انبیاے کرام ظہور کرتے رہے۔ آنحضور ﷺ نے زندگی کے ارتقا کی اُس منزل پر ظہور فرمایا جب زندگی شعور کی پختگی کی منزل پر پہنچ چکی تھی:

شعلہ ہاے اُو صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمد بر فروخت

(مثنوی اسرار و رموز)

یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ ایک ایسا پیغامِ ربانی لے کر تشریف لائے جو آئندہ تمام زمانوں اور دُنیا کی ساری زمینوں کے لیے ابدی پیغامِ ربانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم المرسلین ﷺ تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہیں اور اس انداز سے کرتے ہیں کہ علامہ اقبال اسلام کے ظہور کو عقل کا ظہور قرار دیتے ہوئے تمام انسانوں کو اسلام کے پیغام کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

اپنی شاعری کے دورِ اوّل میں وہ ملتِ اسلامیہ کی انتہائی اندوہ ناک صورتِ حال کی چارہ گری کی تمنا میں کبھی تو آنحضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں سراپا فریاد نظر آتے

ہیں اور کبھی اللہ میاں کے حضور شکوہ سنج :

حضور ﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو ، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو شے ہے اِس میں وہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

(حضورِ ﷺ رسالت مآب میں)

اللہ میاں سے اسی نوع کے شکوے کا جواب فریاد کی بجائے عمل کی تلقین ہے اور عمل بھی وہ جس سے پستی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی مخلوق بلند و بالا مقام پر فائز کی جا سکے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اور:

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ما سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

(جوابِ شکوہ)

یہاں سے اقبال کی فکر و نظر کا دُوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب اُنھیں شعوری ارتقا

کے اُس مقام پر رسائی حاصل ہو چکی ہے جہاں اُنھیں اِس حقیقت کا عرفان حاصل ہے کہ دُنیاے اسلام کی تمام تر زبوں حالی کا سبب محمد ﷺ سے بے وفائی ہے اور اس زوال کو عروج میں بدلنے کا واحد ذریعہ محمد ﷺ سے وفا ہے۔اس وقت مجھے ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں شامل وہ نظم یاد آ رہی ہے جس کے آغاز میں اقبال اس بات پر نازاں نظر آتے ہیں کہ اُن کی فکر نے آنحضور ﷺ کے احسانات کی گود میں پرورش پائی ہے۔ یہاں وہ اپنی زندگی میں آنحضور ﷺ کے فیضان کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے فقط اقبال کی ذات ہی نہیں، بلکہ پوری کائنات آنحضور ﷺ کے احسانات کی ثناخواں ہے۔ ان سارے احسانات کو اگر ہم ایک فقرے میں بیان کرنا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہوگا کہ آنحضور ﷺ اسلام کا جو انقلابی پیغام لائے ہیں اُس نے دُنیاے انسانیت کو روشن خیالی اور سائنسی شعور کی نعمت سے مالامال کر دیا ہے، پرانے بُت جلا کر راکھ کر دیے ہیں اور یوں پرانی کائنات کو فرسودگی کے چنگل سے رہائی دلا کر اسے تجدید وارتقا کے نِت نئے مراحل سے آشنا کر دیا ہے:

سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کر دی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح ، تو بانگِ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشۂ نور از لا الٰہ
نے خداہا ساختیم از گاؤخر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردہ احسانِ تست

ان اشعار میں اسلام کا تاریخی کردار نمایاں کرتے وقت اقبال نے بہ طورِ خاص اس حقیقت کو اُجاگر کیا ہے کہ آنحضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات نے اِنسان کو پتھروں اور درختوں کی پوجا سے آزاد کرایا، صرف لات و منات ہی نہیں، بلکہ گائے اور گدھے کی عبادت میں مصروف آدمی کو لا الٰہ کا نعرہ بلند کر کے اِن جھوٹے خداؤں کے جادو سے رہائی بخشی اور سب سے بڑھ کر بادشاہوں، ملاؤں اور جاگیرداروں کی خدائی سے انکار کا حوصلہ بخشا۔ گویا اسلام کا ظہور انسانی مساوات اور سلطانیِ جمہور کے تصورات کا عملی ظہور ہے۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر اپنی کتاب بہ عنوان: The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں لکھتے ہیں:

> The Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Qur'an, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality."

درجِ بالا پیراگراف میں ختمِ نبوت کے تصور کی تہذیبی اور سائنسی تفسیر کرتے وقت اقبال نے اپنے ایمان پرور اور محکم استدلال کے ساتھ یہ کہا ہے کہ اسلام میں نبوت ختم ہونے کے ساتھ ہی خاندانی بادشاہت اور ملاّئیت کے ادارے بھی ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ چناں چہ اسلام کا ظہور عقل کے ظہور سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے۔ ''مثنوی اسرار و رموز''

میں اس موضوع کو مختلف اور متنوع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ درجِ ذیل اشعار میں اسلام کا مقصود انسانی اخوت، مساوات اور حریّت کی اقدار کا فروغ و استحکام بتایا گیا ہے:

بود انساں در جہان انسان پرست
ناکس و نابود مندو زیردست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہریک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ او رنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت
از غلامی فطرت او دون شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خون شدہ
تا امینِ حق بحق داران سپرد
بندگاں را مسندِ خاقان سپرد

(درمعنی اینکہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات اخوتِ بنی نوع آدم است)

کلامِ اقبال میں ایک بڑی نادر و نایاب نظم جلوہ گر ہے جس میں ہجو بلکہ واسوخت کے پیرایۂ اظہار میں عالمِ انسانیت پر آنحضور ﷺ کے احسانات گنوائے گئے ہیں۔ یہ نظم ''جاوید نامہ'' میں فلکِ قمر کی وادیِ طواسین میں اُس مقام پر دی گئی ہے جہاں مختلف پیغمبروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں طاسینِ محمد اُس انقلاب کے فیوض و برکات کی آئینہ دار ہے جو ظہورِ اسلام کی دین ہیں۔ یہاں اقبال نے ابوجہل کی رُوح کو حرمِ کعبہ میں نوحہ کناں دکھایا ہے۔ ابوجہل اسلام کے اعجاز سے دورِ جاہلیت کے انسانیت سوز اصول و اقدار کے نیست و نابود ہو جانے پر نالہ زنی میں مصروف ہے۔ اس طویل نظم کے فقط چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود
نوجواناں را ز دستِ مار بود
ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
تابساطِ دینِ آبا در نورد
با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وی بگیر ای کائنات
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خوان نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمران با اسودان آمیختند
آبروے دودمانی ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلمان مزدکی است

دورِ جاہلیت میں رنگ ونسل، آقا و غلام اور عرب وعجم کے امتیازات انسانی زندگی کو جہنم زار بنائے ہوئے تھے۔طلوعِ اسلام نے انسانوں کے درمیان ان طبقاتی، جغرافیائی اورنسلی امتیازات کو مٹا کرانسانی مساوات، اخوت اور حریّت کی اقدار کو رائج کیا۔ اس اسلامی انقلاب نے جہاں خاک نشینوں کو سربلندی اور سرفرازی بخشی وہاں دورِ جاہلیت کی معاشرت اورمعیشت کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اِس نظم میں ابوجہل کوماضی کے اُس استحصالی

اور استبدادی نظام کی موت پر واویلا کرتے ہوئے یوں دکھایا گیا ہے کہ جہاں دورِ جاہلیت کی انسانیت سوز روایات کی موت برحق ثابت ہوگئی ہے وہاں اسلام کی انسانیت پرورنئی روایات کے زندگی بخش اثرات نمایاں تر ہو گئے ہیں۔ یہ بلاشبہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں ایک نادر و نایاب نذرانۂ عقیدت ہے۔ ایک ایسا نذرانۂ عقیدت جو آنحضور ﷺ کی قیادت میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب کے معاشی، معاشرتی اور روحانی خدوخال کو روشن کر کے اپنے زمانے اور آنے والے زمانے کو اسلام کی حقیقی انقلابی تعلیمات کی جانب متوجہ کرتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اقبال کی فکر اور اُن کا فن نورِ مصطفیٰ سے مستنیر ہے۔ نسیمِ حجاز ہی اُن کے افکار کی کھیتی کو پروان چڑھاتی اور سرسبز و شاداب رکھتی چلی آئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے دمِ واپسیں بڑی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ:

نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرودِ رفتہ بازآید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہر چند ہمارے ہاں ابھی تک اقبال کے بعد کوئی اور دانائے راز نہیں آیا، تاہم ہماری دُنیا بھی اُمید پر قائم ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

علامہ اقبال کی نعت گوئی

علامہ اقبال نے روایتی نعت نہیں لکھی، حالاں کہ انھیں رسولِ اکرم ﷺ سے الفت، محبت، عقیدت اور شیفتگی ہمارے بعض قابلِ احترام نعت گو شاعروں سے کہیں زیادہ تھی۔ آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے غیر معمولی وابستگی کے باوجود یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ وہ روایتی نعت لکھنے سے قاصر رہے، کیوں؟ اس لیے کہ وہ روایتی شاعر نہیں تھے۔ اگرچہ انھوں نے شاعری میں روایت کا دامن نہیں چھوڑا، مگر روایت سے الگ ایک اجتہادی راہ اختیار کی۔

روایتی نعت تو نہیں لکھی مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نعتیہ شاعری کی ہے، اور ایسی نعتیہ شاعری کہ بایدوشاید۔ دراصل ان کا شعری ورثہ اپنے فکری مزاج اور باطنی تاثیر کے حوالے سے بہ ذاتِ خود ایک نعت ہے پھر ان کے کلام کا خاصا بڑا حصہ نعتیہ مفاہیم کا حامل ہے۔

علامہ اقبال کی سوانح، شخصیت، شاعری اور نثری اشعار کا مطالعہ کریں تو نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ آپ کا تعلقِ خاطر اور ایک والہانہ شیفتگی، حیاتِ اقبال کا ایک زرّیں باب ہے۔ اقبال کی زندگی کے ہر دور میں محبتِ رسول ﷺ کا یہ جذبہ ایک زندہ، توانا اور ایک انقلاب انگیز قدر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ یہ حکایت دراز ہے اور لذیذ بھی، لیکن فی الوقت اس کے چند پہلو پیش کیے جارہے ہیں۔

''نالۂ یتیم'' (فروری ۱۹۰۰ء) ان کی قدیم ترین اور اوّلین قومی و ملی نظم ہے۔

رُوئے سخن آنحضور ﷺ کی طرف ہے۔ جذبۂ عشقِ رسول ﷺ کے والہانہ اظہار کے لیے شاعر نے اس نظم میں مختلف پیرایے اختیار کیے ہیں۔ ایک شعر میں اس دور کے اقبال کا یہ مخصوص رنگِ عقیدت بھی نمایاں ہے: ☆۱

اس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُر انوار کو
جو نہ سمجھا احمدِؐ بے میم کے اسرار کو ☆۲

جذبۂ عشق کے اس رسمی اور روایتی اظہار نے بہ قول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ''حضور کی شانِ کمال و جمال کو بشریت کی حد سے بڑھا کر اُلوہیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔'' ☆۳ مگر جب وہ اس عبوری دور سے آگے بڑھتے ہیں تو آنحضور ﷺ کی پیغمبرانہ اور بشری عظمت اور آپ ﷺ کی رحمت و شفقت کا پہلو اُن کے لیے سب سے زیادہ جذب و کشش کا باعث بن جاتا ہے:

درد، جو انسان کا تھا، وہ مرے پہلو سے اٹھا
قلزمِ جوشِ محبت، تیرے آنسو سے اٹھا ☆۴

پھر ''فریادِ اُمت'' (۱۹۰۳ء) کے کئی شعروں میں عشق و محبت سے اقبال کی مراد دردِ انسانیت ہے اور یہ درد، عشقِ رسول ﷺ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ☆۵ مثلاً: اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''
یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا ☆۶

''نالۂ یتیم'' (۱۹۰۰ء) کے بعد نظم ''بلال'' حُبِ رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار ہے۔ آخری شعر میں اقبال کس نادر انداز میں اپنی محرومی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی خوش بختی کا ذکر کرتے ہیں:

خوشا وہ دور کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا ☆۷

اسی ابتدائی دور کی ایک غزل کا یہ شعر قابلِ غور ہے:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے[۸☆]

یہ شعر بتا رہا ہے کہ سرزمینِ حجاز، اقبال کے لیے ایک خاص معنویت رکھتی ہے۔ انھوں نے اوائلِ عمر ہی سے ''حجاز'' سے ایک خاص تعلق اور لگاؤ پیدا کرلیا تھا۔ حجاز سے اسی تعلق کے حوالے سے ان کی ۱۹۰۵ء کی ایک نثری تحریر دیکھیے، جو دراصل اُن کا ایک خط ہے جو یورپ جاتے ہوئے، انھوں نے سمندری سفر کے دوران میں لکھا تھا۔

۴ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو اقبال بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہوئے۔ جب ان کا جہاز ساحلِ عرب (حجاز) کے قریب پہنچا تو ان کے دل پر آنحضور ﷺ اور مدینے کے تصور سے ایسی کیفیت طاری ہوئی، جیسے دل پھڑ پھڑا رہا ہو۔اس تصور نے اقبال کے قلب کو کس درجہ گداز کردیا،اس کا اندازہ ان کی نثر کے درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق شوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں:
>
> اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
> خورشید بھی گیا ، تو اُدھر سر کے بل گیا*
>
> اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔تو ایک پتھر تھی، جس کو دنیا کے معماروں نے رد کردیا تھا،مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں

*خیال رہے کہ کعبۃ اللہ ہمارے مغرب میں واقع ہے،ہم اس کی طرف سر جھکاتے ہیں۔ مدینہ بھی اسی سمت میں ہے اورسورج بھی ''سر کے بل'' اُدھر ہی جاتا ہے۔

اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میرے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش، میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہوکر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا، اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں، جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال رضی اللہ عنہٗ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔[☆۹]

یہ اقتباس ہے، اقبال کے اس خط سے جو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہوئے اثنائے سفر مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر ''وطن'' کو لکھا تھا اور زمانہ ہے ۱۹۰۵ء کا۔ حصولِ علم کا ذوق وشوق انھیں کشاں کشاں دیارِ فرنگ کی طرف لے جا رہا تھا:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو[☆۱۰]

رخ سوئے فرنگ ہے، مگر دل نواحِ کاظمہ کے تصور میں اٹکا ہوا ہے۔ درجِ بالا اقتباس کو ایک ''نثری نعت'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اوپر عرض کیا گیا کہ (ابتدائی دور کو مستثنیٰ سمجھتے ہوئے) علامہ اقبال کے ہاں نعت کا روایتی انداز نہیں ملتا، بلکہ روایت کے تتبع میں انھوں نے کبھی نعت نہیں لکھی۔ بایں ہمہ ان کی اردو اور فارسی شاعری میں نعتیہ شاعری کے خوب صورت نمونے ملتے ہیں، مثلاً ''جوابِ شکوہ'' کے آخری پانچ بند، جن کا اختتام حسبِ ذیل بے مثل نعتیہ شعر پر ہوتا ہے:

کی محمد سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں[☆۱۱]

تقریباً اُسی زمانے کی تخلیق ''حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں''[☆۱۲] ایک بے پایاں تاثیر کی حامل نظم ہے، یہ نعت نہیں مگر محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے سے سرشار دلوں کو تڑپانے والی شاعری ہے۔ اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ بیس ویں صدی کے دوسرے عشرے میں

جب طرابلس پر اٹلی کے حملے کی خبر ہندستان پہنچی، جس میں بہت سے مسلمان بھی جامِ شہادت نوش کر گئے تھے تو مسلمانوں کے جذبات میں زبردست ہل چل مچ گئی۔ اقبال نے بھی اس خبر سے گہرا اثر قبول کیا اور مذکورہ نظم لکھی جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت ﷺ میں لے گئے مجھ کو
حضور آیۂ رحمت ﷺ میں لے گئے مجھ کو

یعنی شاعر دنیا سے رخصت ہو کر، عالمِ خیال و تصور میں دربارِ رسالت ﷺ میں پہنچتا ہے تو آنحضور ﷺ پوچھتے ہیں:

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

اقبال، جواباً عرض کرتے ہیں:

حضور ﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی

یہ نظم انھوں نے شاہی مسجد لاہور میں منعقدہ ایک جلسے میں پڑھی تھی، اور لوگوں کو رُلا دیا تھا۔ اس موقعے اور منظر کی جو تصویر ایک چشم دید گواہ حکیم محمد یوسف حسن (مدیر: ''نیرنگِ خیال'') نے پیش کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جلسے میں عام زندہ دلانِ لاہور کے علاوہ سر محمد شفیع، سر فضل حسین، میاں نظام الدین، مولوی محبوب عالم اور میاں عبدالعزیز جیسے مسلم راہ نما بھی موجود تھے۔ پہلے چند ریزولیشن پڑھے گئے۔ پھر علامہ اقبال سے

درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ہجوم میں پندرہ بیس ہزار مسلمان ہوں گے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جذبات پر قابو رکھنا محال ہو رہا تھا۔ نظم پڑھنے سے پہلے سر محمد شفیع، میاں فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایڈیٹر روزنامہ ''پیسہ اخبار'' نے بڑی آتشیں تقریریں کیں، جن میں اٹلی کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کیا گیا تھا۔ جب علامہ نے نظم پڑھنی شروع کی تو مجمعے پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ اس وقت فرش پر ایک سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ کلام کے علاوہ اقبال کی آواز میں ایک عجیب سوز تھا۔ حضرت علامہ نے مذکورہ نظم سنائی۔ علامہ نے جب پوری دل سوزی اور سرشاری سے یہ شعر پڑھا:

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسّس بڑھا، سوال پیدا ہوا، بھلا وہ کیا چیز ہوگی، جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔ اس کے بعد علامہ نے یہ شعر پڑھا:

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ چیخ پکار، نالہ و بکا اور آہ و فغاں سے مسجد کی دیواریں لرزنے لگیں۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے سے فضا گونجنے لگی۔ لوگ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑنے لگے۔ کوٹ اُتار کر پھینک دیے اور ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں۔ زمین پر اس طرح لوٹنے اور تڑپنے لگے جیسے ان کو کسی نے ذبح کر ڈالا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی موت کے سانحے پر یا کسی بھی موقعے پر ایسا دل خراش منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔[۱۳]☆

پھر اقبال کے ہاں بہت سارے متفرق نعتیہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ (یہاں ''متفرق اشعار'' کہہ کر، ان کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا رہا۔) یہ متفرق اشعار اپنی نوعیت میں لاجواب و یکتا ہیں، مثلاً:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل ، وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں ، وہی یٰسیں ، وہی طٰہٰ[☆۱۴]

علامہ کے نزدیک، بیس ویں صدی کے مادّہ پرستانہ ماحول میں، جب دانشِ فرنگ کی چکاچوند سے ہماری آنکھیں چندھیا رہی ہیں، اور ضلالت وگمراہی کی بادِصرصر، ایمان و ایقان کا چراغ گل کرنے کے درپے ہے، رسولِ کریم ﷺ سے نسبت وتعلق ایک کارگر دفاعی حربہ ہے:

تو اے مولاے یثرب ، آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی ، مرا ایمان زُنّاری[☆۱۵]

یہ ''بالِ جبریل'' (۱۹۳۵ء) کا شعر ہے۔ اسی مجموعے کی نظم ''ذوق وشوق'' میں چند بے مثال نعتیہ اشعار ملتے ہیں،خصوصاً:

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب[☆۱۶]

''مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا ایک حصہ بہ عنوان: ''در حضورِ رسالت مآب ﷺ'' بھی ان کی نعتیہ شاعری کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔[☆۱۷]

علامہ اقبال کے حُبِ رسول ﷺ کے جذبے پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ محبتِ رسول ﷺ اور عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ ہمارے معاشرے میں چند ظاہری آداب و رسوم (نعت گوئی، نعت خوانی، مجلسِ میلاد، میلاد النبی ﷺ کا جلوس وغیرہ) تک محدود ہوکر رہ گیا ہے اور اب یہ ہمارا ایک ثقافتی مظہر بن گیا ہے۔خصوصاً ماہِ ربیع الاوّل میں اخبارات، خاص ایڈیشن شائع کرکے، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر خصوصی پروگرام نشر کرکے اور نعت خواں گھنٹوں مجالس منعقد کرکے حُبِ رسول ﷺ کا اظہار کرتے ہیں۔[☆۱۸] ایک اعتبار سے تو ایسی مجالس کا اہتمام کرنے والے قابلِ داد ہیں،مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زبانی کلامی توصیف وتحسین یا درود و سلام یا نعت خوانی سے محبتِ

رسول ﷺ کے تقاضے پورے ہوجاتے ہیں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ سچی محبت صرف آپ ﷺ کی زبانی تعریف و توصیف اور گفتگو سے مطمئن نہیں ہوتی، وہ عمل کا تقاضا کرتی ہے اور رسولِ اکرم ﷺ نے بھی یہی تعلیم دی ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے کہ ایک دن نبیِ کریم ﷺ نے وضو کیا۔ آپ ﷺ کے کچھ اصحاب، آپ ﷺ کے وضو کا پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، تمھارے اس کام کا محرک کیا ہے؟ لوگوں نے کہا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جن لوگوں کو اس بات کی خوشی ہو کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ سے محبت کرتے ہیں، تو انھیں چاہیے کہ جب بات کریں تو سچ بولیں، جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس کو (بہ حفاظت) مالک کے حوالے کریں، اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔[19]☆ یعنی محبتِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے اعمال درست کریں۔ مذکورہ حدیث میں تین باتوں کی تلقین کی گئی ہے:

۱۔ سچ بولنا (جھوٹ اور دروغ گوئی سے اجتناب)

۲۔ امانت (خیانت سے پرہیز)

۳۔ پڑوسی سے حسنِ سلوک

ان باتوں پر عمل درآمد اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان کے باطن میں تبدیلی نہ ہو۔ سو، محبتِ رسول ﷺ، انسان کے باطن میں تبدیلی و پاکیزگی کی طالب ہے۔

وہی تزکیے والی بات، فرمایا گیا: یُزَکِّیھِمْ یعنی نبیِ اکرم ﷺ اپنے ساتھیوں کا تزکیہ کرتے ہیں، اور اس طرح ان کے باطن کو صاف اور پاکیزہ بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ انھیں ''اندر سے بدلنے'' کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

نبیِ کریم ﷺ پر درود بھیجنا حُبِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے اور تزکیے کا ایک طریقہ بھی، چناں چہ علامہ اقبال نے نبیِ کریم ﷺ پر بہ کثرت درود شریف پڑھنے کی تلقین کی ہے، لیکن اقبال اسے بھی کافی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اس سے آگے بڑھ کر محبتِ رسول ﷺ کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین کی خدمت کی جائے۔

کیوں کہ دینِ نبی ﷺ مسلمان معاشروں میں اجنبی ہو کر رہ گیا ہے۔

آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی باطل کے خلاف سراپا جہاد تھی۔ آپ ﷺ شب و روز، اپنے دور کی گمراہیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ عصرِ حاضر میں بھی گوناگوں باطل نظریات، اسلام کے راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ چناں چہ ان کے خاتمے کے لیے کوشش و کاوش ایک طرح سے سنتِ نبوی ﷺ ہے، خدمتِ رسول ﷺ بھی اور خدمتِ دینِ اسلام بھی۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایک مومن کی زندگی کا یہی مشن ہونا چاہیے۔

اپنی زندگی میں اقبال کو ''نازک زمانے میں اسلام کی حفاظت'' کی فکر برابر دامن گیر رہی اور وہ ''اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کے مستقبل کو محفوظ'' کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ ۲۲/اپریل ۱۹۳۱ء کو مولوی صالح محمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس ملک ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے، اور اگر وقت پر موجودہ حالت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل، اس ملک میں کیا ہو جائے گا؟ ہم تو اپنا زمانہ، حقیقت میں ختم کر چکے، آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا ہو جائے۔ اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے اپنے کام چھوڑنے پڑے تو ان شاء اللہ چھوڑوں گا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی ایک مقصدِ جلیل کے لیے وقف کر دوں گا۔ آپ خواجہ صاحب کے دل میں تڑپ پیدا کریں کہ وہ اپنے دیگر احباب میں بھی یہی تحریک کریں، ورنہ ہم سب لوگ قیامت کے روز خدا اور رسول ﷺ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ ☆[۲۰]

اسی تسلسل میں ۳۰/جولائی ۱۹۳۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''اس وقت مسلمان کا

فرض ہے کہ جو قوت، خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے، اسے اسلام کی خدمت اور اقوام وملل اسلامیہ کے احیا و بیداری میں صرف کر دے۔"[۲۱]

خود علامہ اقبال اپنے تئیں احیائے اسلام کے لیے جدوجہد کی سعی کرتے رہے اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے خدمتِ اسلام اور خدمتِ رسول ﷺ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ خدمتِ رسول ﷺ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ محبتِ رسول ﷺ کا دعویٰ کرنے والے افراد سب سے پہلے اپنی زندگیوں کو اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالیں، اپنے ظاہر وباطن میں یکسانی پیدا کریں اور رسولِ اکرم ﷺ جس مقصدِ عظیم کے لیے دنیا میں مبعوث ہوئے، اس کے حصول کے لیے جسم و جاں کی پوری توانائی اور قلب و ذہن کی جملہ صلاحیتیں وقف کر دیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیں۔ اس اعتبار سے اقامتِ دین اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کاوشِ پیہم ہی خدمتِ رسول ﷺ ہے۔

علامہ کو آنحضور ﷺ سے ایک اور نسبت بھی بہت عزیز تھی، اس کا اظہار ایک شعر میں یوں کیا ہے:

عجمی خم ہے تو کیا ، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ، لے تو حجازی ہے مری[۲۲]

نسبتِ حجازی پر انھیں فخر ہے اور بجا طور پر وہ آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے خود کو "اے عندلیبِ باغِ حجاز"[۲۳] کہلوا کر ایک طرح کی روحانی لذت وسرشاری میں ڈوب جاتے ہیں۔

حجازِ مقدس کے سفر اور زیارتِ مدینہ کی تمنا ان کے ہاں ابتدا ہی سے موجود تھی۔ ۶/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

خدا آپ کو اور مجھ کو بھی زیارتِ روضۂ رسول ﷺ نصیب کرے۔ مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھیے! کب جوان ہوتی ہے"[۲۴]

آرزو پرورش پاتی رہی، جوان ہوتی رہی اور وہ سفرِ حجاز کے بارے میں مسلسل سوچتے رہے۔ فی الحقیقت حجِ بیت اللہ اور زیارتِ مدینۃ النبی ﷺ کی تمنا، اقبال کے حُبِ رسول ﷺ

کا ایک ایسا پہلو ہے جس کا بیان کچھ جداگانہ لطف و لذت رکھتا ہے۔

جناب غلام رسول مہر ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء کے زمانے میں علامہ کی خدمت میں اکثر و بیش تر حاضر ہوتے تھے اور علامہ اقبال سے جو گفتگو ہوتی تھی، اس کے نکات روزنامچے میں لکھ لیتے تھے۔ اسی حوالے سے ان کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ہر ملاقات پر سفرِ حجاز کا ذکر چھڑ جاتا اور گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو رہتی۔ ان گفتگوؤں میں سفر کے مصارف کا تخمینہ، حمل و نقل کے مسائل اور انتظامات کے متفرق امور زیرِ بحث آتے۔ ایک دو بار انھوں نے مہر صاحب سے کہا کہ وہ جملہ امور پر غور و فکر اور تحقیق کر کے بتائیں کہ سفر عملاً کیوں کر ممکن ہوگا،☆۲۵ لیکن بعض وجوہ سے ارادۂ سفر ملتوی ہوتا رہا۔

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن کا سفر درپیش ہوا۔ واپسی پر مؤتمر عالمِ اسلامی میں شرکت کے لیے بیت المقدس گئے۔ وہاں سے مصر گئے اور پھر براہِ راست ہندوستان چلے آئے۔ اس حوالے سے بعض لوگوں نے سوال اُٹھایا ہے کہ علامہ نے عمرے اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے اس موقعے سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟ کہنے لگے: ''فقیر! میں کس منہ سے روضۂ رسول ﷺ پر حاضر ہوتا۔''☆۲۶

دراصل انھیں ضمناً دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہونا اچھا نہ لگا۔ حضور ﷺ کے ہر اُمتی کی طرح علامہ اقبال کو بھی اپنی لغزشوں، گناہوں اور کوتاہیِ فکر و عمل کا شدید احساس تھا۔ احساسِ ندامت کے سبب وہ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری سے گریزاں تھے، اور غالباً اسی لیے وہ بارگاہِ خداوندی میں اس طرح التماس کرتے ہیں:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہاے من پذیر
درحسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر☆۲۷

(اے اللہ! تو سراپا غنی ہے اور میں تہی دست ہوں۔ روزِ محشر مجھے جواب دہی سے معاف رکھنا، لیکن اگر جواب دہی ناگزیر ہو تو پھر

آنحضور ﷺ کی نظروں سے اوجھل ہو کر حساب لیجیو۔ [تاکہ آپ ﷺ کے سامنے، میری رسوائی نہ ہو۔])

بہرحال انھوں نے سفرِحجاز کا ارادہ ترک نہیں کیا، مگر سوے اتفاق سے۱۹۳۳ء میں یورپ سے واپسی کے تقریباً دس ماہ بعد وہ علیل ہوگئے۔ انھیں وکالت ترک کرنی پڑی، بہت سے معمولات متأثر ہوگئے، علاج معالجے کے لیے بار بار دہلی اور بھوپال جانا پڑا۔ بیماری کے نتیجے میں طرح طرح کے تفکرات اور غم ہاے روزگار نے گھیر لیا، مگر اس عالم میں بھی سفرِحجاز کے لیے ان کے عزم وارادے میں فرق نہیں آیا۔ ان کے دیرینہ اور قریبی دوست میرغلام بھیک نیرنگ بتاتے ہیں کہ زندگی کے آخری تین چار سال میں وہ حجِ بیت اللہ اور زیارتِ رسول اللہ ﷺ کی تجویزیں اور تدبیریں سوچتے رہے۔

جب کبھی زیارتِ حرمین شریفین کا تذکرہ ہوتا تو وہ ایک عجیب لطف وکیف اور سرشاری وبےخودی کی کیفیت میں ڈوب جاتے۔

مناسب ہوگا یہاں علامہ اقبال کے اس ذوق وشوق کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے جس کی بنا پر آنحضور ﷺ کا ذکر آتے ہی وہ آبدیدہ ہوجاتے اور اکثر ان پر رقت طاری ہوجاتی۔ اس سلسلے میں ان کے قریبی دوستوں اور ملاقاتیوں کے متعدد بیانات ملتے ہیں۔ غلام رسول مہر کا بیان ہے:

> سرورِ کائنات ﷺ کا اسمِ پاک تو زبان پر آتے ہی چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ حضورِانور ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ حضرتِ علامہ کا عشق، بیان کا متحمل نہیں۔ ان کی تصانیف میں جو اشعار حضور ﷺ کے متعلق ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے انھوں نے سنایا ہو اور اس پر بے اختیار اشک بار نہ ہوئے ہوں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ خود خوشی خوشی شعر سنانے لگتے، لیکن کوئی نعتیہ شعر یا حضورِانور ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے متعلق کوئی اشارہ آجاتا تو رِقّت طاری ہو جاتی۔ پندرہ پندرہ بیس بیس منٹ تک یہ

کیفیت باقی رہتی۔ یہاں تک کہ باقی شعر بھی ناشنیدہ ہی رہ جاتے۔[☆۲۸]

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں غلام رسول مہر کا بیان مذکور ہوا، علامہ اقبال سفرِ حج کے لیے دیرینہ آرزو رکھتے تھے، لیکن زندگی کے آخری دوتین برسوں میں اس خواہش کا اظہار زیادہ کرنے لگے تھے۔ یوسف سلیم چشتی بتاتے ہیں کہ ۱۷/ دسمبر ۱۹۳۶ء کو حاضرِ خدمت ہوا، باتیں ہورہی تھیں۔ ماسٹر عبداللہ چغتائی ملنے کے لیے آگئے۔ وہ فرانس جا رہے تھے۔ علامہ ان کو مفید مشورے دیتے رہے۔ چلتے وقت انھیں دعا دی اور کہا، ''اگر اللہ نے مجھے صحت عطا فرمادی تو ۱۹۳۸ء میں، میں حج کرنے جاؤں گا۔''[☆۲۹]

خیال رہے کہ علامہ کی اہلیہ دوسال پہلے فوت ہوگئی تھیں، اور اب دونوں بچوں (جاوید اور منیرہ) کی نگہداشت انھی کے ذمے تھی۔ ان کی اپنی صحت روز بہ روز گرتی جارہی تھی اور ڈاکٹروں نے آنکھ کا آپریشن بھی تجویز کیا تھا۔ اس زمانے میں سفر کی دشواریاں گوناگوں تھیں۔ بایں ہمہ وہ عزمِ سفر سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے حج پر جانے کے لیے مختلف جہاز راں کمپنیوں سے خط کتابت شروع کردی تھی۔[☆۳۰] ایک بار گھر میں ان کے سفرِحجاز کا ذکر چھڑا تو علامہ کی ہمشیرہ نے کہا، ''آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اُتر رہا ہے، ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر رکھے، اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔'' اس پر بڑے درد انگیز مگر پُرشوق لہجے میں فرمایا، ''آنکھوں کا کیا ہے، آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں۔''[☆۳۱]

سفرِحجاز کی آرزو برابر بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے ایک میٹھی خلش بن گئی جس نے علامہ کو مستقلاً بے چین اور مضطرب رکھا۔ تصور ہی میں وہ بار بار عزمِ سفر کرتے اور رختِ سفر باندھتے۔ انھوں نے مقدس سفر کی مناسبت سے متعدد قطعات ورباعیات بھی قلم بند کرلی تھیں۔ جو اب ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' کی ان رباعیوں میں سوز وگداز کی کیفیت انتہائی درجے پرنظر آتی ہے۔ یہ علامہ کی نعتیہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ دربارِ رسالت ﷺ میں حاضری کا تصور علامہ کو بے چین کیے ہوئے ہے۔ بہ سببِ علالت، جسمانی طور پر سفر ممکن نہیں، چناں چہ وہ عالمِ تصور ہی میں مدینہ طیبہ کی جانب

رواں دواں ہیں۔ انھیں اب مدینۃ النبی ﷺ ہی ملجا و ماویٰ نظر آتا ہے:

به این پیری رهِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانه
چوں آں مرغے که در صحرا سرِشام
کشاید پر به فکرِ آشیانه ☆۴۲

(اس بڑھاپے میں، میں مدینے کی طرف سرورِ عاشقی سے مست گاتا چلا جارہا ہوں اور میری مثال اس پرندے سے مختلف نہیں ہے جو شام کے وقت صحرا میں آشیانے کی تلاش میں مستعد ہوتا ہے۔)

سوزِ عشق سے بیمارِ عشق کی حالت خستہ و ماندہ ہے:

سحر با ناقه گفتم : نرم تر رو
که راکب خسته و بیمار و پیر است
قدم مستانه زد چنداں که گوئی
به پایش ریگِ ایں صحرا حریر است ☆۴۳

(بہ وقتِ صبح میں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا آہستہ چل کہ سوار خستہ، بیمار اور بوڑھا ہے۔ اس پر وہ اس طرح مستانہ انداز میں قدم زن ہوئی کہ گویا اس کے پاؤں کے نیچے پھیلی ہوئی ریگِ صحرا ریت نہیں، ریشم ہے۔)

مگر اثنائے سفر کی لذت ایسی سرور انگیز اور وجد آفریں ہے کہ مسافر ساربان کو راہِ دراز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ سفرِ شوق میں مسرت کے لمحات دراز تر ہوسکیں:

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راهِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن ☆۴۴

(اے ساربان! تو مسافر کے غم میں نشاط اور کیف کی آمیزش بڑھا دے

اور اس کی آہ و زاری میں جنوں کا عنصر زیادہ کردے۔ اے ساربان! لمبا راستہ اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو تیز تر کردے۔)

تنم واماند و جانم در تگ و پوست
سوے شہرے کہ بطحا در رہِ است
تو باش ایں جا و باخاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست ☆۳۵

(میرا بدن تھکن سے چور ہوگیا ہے اور میری روح اس شہر کی جانب کھنچی چلی جارہی ہے، جس کے راستے میں مکہ آتا ہے۔ (اے مخاطب!) تو یہیں رہ اور خواص سے گھل مل، میں تو حضور اکرم ﷺ کے شہر میں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔)

مدینۃ النبی ﷺ علامہ اقبال کے خوابوں کا شہر تھا اوائلِ عمر ہی سے وہ مدینۃ النبی ﷺ سے ایک دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ ''اسرارِ خودی'' (۱۹۱۵ء) کا شعر ہے:

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دل بر است ☆۳۶

ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ انھیں حجاز جانے کا موقع ملے تو وہ سرزمینِ یثرب ہی میں پیوندِ خاک ہوجائیں۔ غالباً ۱۹۱۲ء کی نظم ''شفاخانۂ حجاز'' کا شعر ہے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں ☆۳۷

''رموزِ بے خودی'' میں ہے:

ہست شانِ ''رحمت'' گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز ☆۳۸

(آپ ﷺ کی شانِ رحمت ایک زمانے کو نوازتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ مجھے موت آئے تو سرزمینِ حجاز میں۔)

اردو میں نعت وہ صنفِ سخن ہے جس میں حضورِ اکرم ﷺ کا ذکر ہوتا ہے، ان سے اظہارِ محبت وعقیدت ہوتا ہے اور نعت گو آپ ﷺ کے شخصی محاسن بیان کرتا ہے۔

علامہ اقبال ایک ایسے نعت گو ہیں جن کی پوری شاعری آپ ﷺ کی عقیدت و محبت سے مملو ہے۔ بے شک انھوں نے روایتی انداز کی نعت نہیں کہی یا بہت کم کہی، مگر ان کا رواں رواں آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ خصوصاً ''ارمغانِ حجاز'' کی رباعیوں کو دیکھیں تو ان کی نعت گوئی اپنی معراج پر نظر آتی ہے۔ ایسی معراج کہ اردو کا کوئی اور نعت گو اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا اور شاید آئندہ کبھی نہ پہنچ سکے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ''عروجِ اقبال'': ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۱۳۲۔

۲۔ ''باقیاتِ اقبال''، (مرتبین: عبدالواحد معینی + محمد عبداللہ قریشی)، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص۴۳۔

۳۔ ''عروجِ اقبال''، ص۱۴۰۔

۴۔ ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال''، مرتب: صابر کلوروی۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۴۱۔

۵۔ ''عروجِ اقبال''، ص۱۴۳۔

۶۔ ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال''، ص۱۰۸۔

۷۔ ''بانگِ درا''، ص۸۰۔

۸۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

۹۔ ''اخبارِ وطن'' لاہور، ۶ /اکتوبر ۱۹۰۵ء، بحوالہ ''خطوطِ اقبال''، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۹۱-۹۲۔

۱۰۔ ''بانگِ درا''، ص۹۶۔

۱۱۔ ایضاً ص ۲۰۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص۱۹۷۔

۱۳۔ ''مجالسِ اقبال''، (مرتب: جعفر بلوچ) دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۶۱-۶۲۔

۱۴۔ ''بالِ جبریل''، ص۷ ۲۵/۳۱۔

۱۵۔ ایضاً، ص۳۸/۳۳۰۔

۱۶۔ ''بالِ جبریل''، ص۱۱۳۔ بعض شارحین اور ناقدین ''ذوق و شوق'' کے اس بند کو نعتیہ کے بجائے حمدیہ قرار دیتے ہیں۔ ان میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی اور ڈاکٹر اسرار احمد شامل ہیں۔ پروفیسر غلام رسول ملک کے خیال میں اس کا مطالعہ حمد کی حیثیت سے بھی کیا جا سکتا ہے اور نعتیہ قصیدے کی حیثیت سے بھی۔ رسالہ ''اقبالیات'' سری نگر، شمارہ ۸، ص۲۲-۳۔

۱۷۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق''، ص۴۸-۵۰

۱۸۔ ڈاکٹر انیس احمد: ''حبِ رسول ﷺ اور اس کے تقاضے''۔ منشورات، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۴

۱۹۔ ایضاً، ص۴۔

۲۰۔ ''اقبال نامہ''، دوم، (مرتب: شیخ عطاء اللہ) شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص۳۸۷-۳۸۸۔

۲۱۔ ''انوارِ اقبال''، مرتب: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص۱۹۲۔

۲۲۔ ''بانگِ درا''، ص۱۷۰۔

۲۳۔ نظم ''حضورِ رسالت ماب ﷺ میں: ''بانگِ درا''، ص۱۹۷۔

۲۴۔ ''اقبال نامہ''، دوم، ص۳۶۔

۲۵۔ ''اقبالیات'': غلام رسول مہر (مرتب: امجد سلیم علوی)، مہر سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۔۲۵۱-۲۶۹ (مختلف مقامات)۔

۲۶۔ ''روزگارِ فقیر'' اوّل، ۱۹۶۶ء، ص۳۷۔

۲۷۔ ''اقبال نامہ'' اوّل، ص۳۳۸، اس رباعی کا تیسرا مصرع اس طرح ہے۔

ور اگر بینی حسابم ناگزیر

علامہ اقبال نے یہ رباعی محمد رمضان عطائی کو بخش دی تھی، اسی لیے یہ ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل نہیں ہے، البتہ یہی مفہوم ''ارمغانِ حجاز'' (ص۱۸) کی درج ذیل رباعی میں موجود ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجۂ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

۲۸۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور، ۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء بحوالہ: ''حیاتِ اقبال کے مخفی گوشے''، مرتب: محمد حمزہ فاروقی۔ ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۵۶۷۔

۲۹۔ ''اقبال ریویو''، لاہور، جولائی ۱۹۶۴ء، بہ حوالہ: ''مجالسِ اقبال''، مرتب: جعفر بلوچ، دار التذکیر، لاہور،س ن،ص۱۰۶۔

۳۰۔ ''زندہ رود'' سوم،لاہور،۱۹۸۴ء،ص۶۳۱۔

۳۱۔ روایت شیخ اعجاز احمد: ''روزگارِفقیر'' دوم، (مرتب: فقیرسیّد وحید الدین)،ص۲۰۵۔

۳۲۔ روزنامہ ''انقلاب'' لاہور، ۲۶/اپریل ۱۹۳۸ء بہ حوالہ: ''حیاتِ اقبال کے مخفی گوشے'' مرتب: محمدحمزہ فاروقی۔ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۸۸ء،ص۵۶۱-۵۶۲

۳۳۔ ایضاً،ص۲۵۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۹۔

۳۵۔ ''اقبال کے حضور''،ص۳۷-۳۸،لیکن ''ارمغانِ حجاز'' فارسی،ص۱۹، میں اس رباعی کا پہلا مصرع اس طرح ہے:

بہ تنم واماند و جانم در تگ و پوست

۳۶۔ ''اسرارِخودی''،ص۲۱۔

۳۷۔ ''بانگِ درا''،ص۱۹۸۔

۳۸۔ ''رموزِ بےخودی''،ص۱۷۰

ڈاکٹر اسلم انصاری

اقبال اور عشقِ رسول ﷺ

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی ، تمام بولہبی است!
(اقبالؔ)

آنحضرت ﷺ کے محامد و محاسن کی مدح و ثنا ظہورِ قدسی کے بعد ہر صاحبِ فکرِ سلیم و طبعِ مستقیم کے لیے وجہِ نشاط و سرمایۂ افتخار رہی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ظہور سے پیش تر ہی آپ ﷺ کی تعریف و توصیف کا آغاز ہو چکا تھا۔ کتبِ سماوی اور صحائفِ انبیاے پیشیں میں آپ ﷺ کی آمد کی مصدقہ اور مسلمہ پیش گوئیوں میں آپ ﷺ کے لیے جو الفاظ ستعمال ہوئے ہیں اُن میں صریحاً آپ ﷺ کی مدح و تحسین ہے۔ انجیل میں آپ ﷺ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے فارقلیط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ یونانی میں بری کلیطاس (بمعنی تشفی دہندہ) کیا گیا، لیکن فی الحقیقت اس کا ترجمہ ''انجیلِ برناباس'' کی رُو سے بری کلیو طاس ہی ہے جس کے معنی محمد ﷺ اور احمد ﷺ ہیں، فارقلیط (فرء کے معنی عبرانی میں بوجھ اُٹھانے والے کے ہیں، اور رسالت سے بڑا بوجھ اور کون سا ہوسکتا ہے) پار یا فار عبرانی میں ایک کثیر الاستعمال مادّہ ہے جس کی رُو سے اس کے معنی جمیل و جلیل ومفخر و مہذب وحمید ومحمود ومحمد ہیں۔[1]☆

محققین کے نزدیک فرء قلیط کے معنی ہیں رسولِ مکہ[2]☆ اور فارقلیط کے معنی ہیں محمدِ مکہ، انجیل ہی میں آپ ﷺ کا نام ایک جگہ (عبرانی میں) حِمدَہ بھی آیا ہے جس

کے معنی ہیں بہت تعریف کیا گیا۔[۳]☆

تمام علماے بلاغت اس بات پر متفق ہیں کہ لفظ محمد، حمد سے مبالغے کا صیغہ ہے، اور حمد کے معنی ہیں کسی بہت اچھی چیز کی بہت ہی اچھی تعریف و تحسین۔قرآنِ کریم کی رُو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آپ ﷺ کا نام احمد بتایا گیا ہے... یَاتِیْ مِنْ بَّعْدِی اسمہٗ احمد۔ (آیت:۶۱۔۶)

احمد کے معنی ہیں بہت زیادہ حمد و ستائش کرنے والا اور محمد کے معنی ہیں جس کی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے، اور وہ جو مسلسل اور پیہم وجہِ حمد وستائش ہو[۴]☆ آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت پر جب حضرت عبدالمطلب نے آپ ﷺ کا نام محمد ﷺ رکھا تو اہلِ مکہ نے حیرت سے استفسار کیا کہ آپ نے اپنے خاندان کے مروّجہ ناموں کو چھوڑ کر یہ نام کیوں رکھا؟ انھوں نے کہا، ''میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ دنیا بھر کی ستائش اور تعریف کے شایاں قرار پائے۔''[۵]☆

اگر ظہورِ قدسی کے وقت سے متعلقہ تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو اس میں شک نہیں رہتا کہ دنیا میں آپ ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی پیہم تعریف و توصیف شروع ہوگئی تھی۔ یہ تسمیہ (یعنی حضرت عبدالمطلب کا محمد ﷺ نام رکھنا) بہ ذاتِ خود حضرت عبدالمطلب کی طرف سے تعریف و ستائش ہے۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب نے، جنھوں نے آپ ﷺ کی پرورش میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا، آپ ﷺ کی شان میں اُس وقت شعر کہہ دیے تھے جب آپ ﷺ ابھی کم سِن تھے۔ حضرت ابو طالب کا ایک شعر ہے:

وَاَبیَضُ یستَسقَی الغَمَامُ بِوَجھِہ
ثِمال الیَتٰمٰی ، عِصمَۃ للارامل

وہ گورے مکھڑے والا جس کے رُوے تاباں سے بارش کی دعا کی جاتی
ہے یتیموں کا ملجا وماویٰ اور بیواؤں کی خبر گیری کرنے والا ہے۔ (ﷺ)[۶]☆

بعثت سے بہت پہلے ہی آپ ﷺ کے اخلاقِ ستودہ کے باعث آپ ﷺ کو

الصادق اور الامین کہا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کے لیے اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم (اے پیغمبر، آپ ﷺ بے شک اعلیٰ صفات پر پیدا کیے گئے ہیں) فرمایا، آپ ﷺ نے اپنی بعثت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)، نیز فرمایا: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچا دوں) آپ ﷺ کے پیروکاروں اور جاں نثاروں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے آپ ﷺ کی مدح و توصیف میں جو کچھ کہا، اس سے کتبِ احادیث و تاریخ و سیر لب ریز ہیں۔ شاعری میں اگرچہ آپ ﷺ کی تعریف و تحسین کے معاملے میں اوّلیت کا سہرا حضرت ابو طالب کے سر رہا جنھوں نے آپ ﷺ کی کم سنی ہی میں آپ ﷺ کی شان میں شعر کہے، لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم میں یہ فوقیت حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کے حصے میں آئی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت فرماتے ہیں:

صَلی الاِلٰه وَمَن یَحفُّ بِعَر شِه
والطَیّبون عَلَی المبارکِ اَحمَد

اسلام جب اقصائے عالم میں پھیلا تو حبِ رسول ﷺ کے چراغ بھی چار دانگِ عالم میں روشن ہوئے، عربی، فارسی، ترکی اور اردو، جو زیادہ تر مسلمانوں کی علمی، ادبی اور تہذیبی زبانیں رہی ہیں، نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کے خزینوں سے مالا مال ہیں۔ فارسی میں (اور اُردو میں) سنائی، سعدی، نظامی اور جامی سے لے کر غالب اور اقبال تک ہر قابلِ ذکر شاعر نے نعت کو وجہِ افتخار سمجھا ہے۔ متأخرین میں اقبال ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جنھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مدحتِ رسولِ اکرم ﷺ کو ایک نئے اُسلوب اور نئے آہنگ کے ساتھ اختیار کیا، چناں چہ اقبال کے فکری اور فنی امتیازات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے نعتیہ شاعری میں غیر معمولی شیفتگی، والہانہ پن اور خلوصِ فکر کو ظاہر کیا، اقبال کے باطن میں عشقِ رسول ﷺ کے سرچشمے جس طرح رواں دواں تھے اس کے پیشِ نظر اس نوع کی نعتیہ شاعری کا وجود میں آنا ایک بالکل قدرتی بات تھی۔ شاعر اور مفکر سے بڑھ

کر اُن کے لیے اگر کوئی اور چیز وجہِ افتخار و انبساط ہوسکتی تھی تو وہ عاشقِ رسول ﷺ کا لقب ہے۔ عشقِ رسول ﷺ میں اُن کی شیفتگی کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر اور کوئی لفظ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ اقبال کی حینِ حیات میں بے شمار لوگوں نے انھیں رسولِ اکرم ﷺ کے ذکرِ مبارک پر اشک بار ہوتے ہوئے دیکھا ہے، مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> (وہ) مشرق و مغرب کے علومِ معقول پر حاوی تھے، یورپ میں فلسفہ کے متعلق کوئی قابلِ ذکر تصنیف شائع ہوتی تو اُن کی خدمت میں فی الفور پہنچ جاتی۔ مذہب، تاریخ، عمرانیات کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس پر انھوں نے انتہائی دِقّتِ نظر صرف نہیں کی، لیکن اس کے باوجود ان کے گداز قلب اور رقّتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ جہاں ذرا حضور سرورِ کون ومکاں ﷺ کی رافت و رحمت یا حضور کی سروریِ کائنات کا ذکر آتا، حضرت علامہ کی آنکھیں بے اِختیار اَشک بار ہوجاتیں اور دیر تک طبیعت نہ سنبھلتی۔ وہ حضور ﷺ کی ذاتِ والا کو ساری کائنات سے افضل مانتے تھے۔ (وہ) تحقیقاً اس عقیدے کو تسلیم کرتے تھے، اور جب اس پر گفتگو فرماتے تو القاو الہام، مقامِ نبوت، انسانیتِ کاملہ، توازنِ جذبہ و ادراک اور حریتِ انسانیت کے مسائل پر نفسیاتِ جدید کی رُو سے ایسی سیر حاصل بحث فرماتے کہ کسی مخالف کو بھی حضور ﷺ کے انسانِ کامل ہونے میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی۔☆

مرزا جلال الدین بیرسٹر اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

> (اقبال) خواجہ حالی مرحوم کے مسدّس کے تو عاشق تھے۔ میرے پاس ریاست ٹونک کا ایک شائستہ مذاق ملازم تھا، اسے ستار بجانے میں خاص دسترس تھی اور وہ ''مسدسِ حالی'' ستار پر ایک خاص طرز سے سنایا کرتا۔ ڈاکٹر صاحب التزام کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے اس سے مسدس سننے کی خواہش کرتے۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ کی

تعریف میں وہ بند جو ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' سے شروع ہوتے ہیں جو مسدس حالی کے آخر میں ہیں، انھیں بہ طورِ خاص مرغوب تھے۔ اس کو سنتے ہی اُن کا دِل بھر آتا اور وہ اکثر بے اِختیار رو پڑتے۔اسی طرح اگر کوئی عمدہ نعت سنائی جاتی تو اُن کی آنکھیں ضرور پُرنم ہو جاتیں۔[۸]☆

اِسلام اور شارعِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اُن کی والہانہ شیفتگی کی لاتعداد مثالیں اُن کی سوانح میں بکھری نظر آئیں گی۔ اقبال کا اپنا ادعا بھی ہمیشہ یہی رہا اور اَمرِ واقع بھی یہی ہے کہ اُن کے افکار و خیالات کا سرچشمہ قرآنِ کریم اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ طیبہ تھی۔ اُن کے کلام کے ایک معتد بہ حصے سے جنابِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جس بے پایاں عقیدت کا اِظہار ہوتا ہے،اسے عشقِ رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کے کلام میں عشق، جنوں، جذب و فراق، سوز و سرور اور کیف و مستی کی جو کیفیات جا بہ جا نظر آتی ہیں، اقبال کی ذاتی زندگی میں ان کیفیات و جذبات کا مرجع حضورِ اکرم ﷺ ہی کی ذاتِ والا صفات تھی۔ یہ عقیدت یا قلبی لگاؤ ان کے بعض اشعار میں اتنے بھرپور اور مؤثر انداز میں ظاہر ہوا ہے کہ اقبال — نظامی، جامی، سعدی، قدسی اور دوسرے اعلیٰ درجے کے نعت گو شعرا کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ذات سے وابستگی اور لگاؤ اقبال کے لیے صرف ایک ذاتی رجحان یا صرف ایک اعتقادی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ ایک طرزِ احساس اور طرزِ فکر تھا جو اُن کی پوری زندگی پر محیط تھا۔ اور وہ اس جذبے کو پوری اُمتِ مسلمہ کا طرزِ احساس اور طرزِ فکر بنا دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے کہا:

به مصطفیٰؐ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نه رسیدی ، تمام بولهبی است

''بانگِ دَرا'' کے حصہ اوّل میں جو کلام شامل ہے وہ ۱۹۰۵ء تک کا لکھا ہوا ہے۔ یعنی یہ تمام شاعری اقبال کے سفرِ یورپ سے پہلے کی ہے، اس کے حصۂ غزلیات میں ایک غزل کا مقطع ایسا ہے کہ اسے ہم اقبال کی شاعری میں اُن کے جذبۂ عشقِ رسول ﷺ

کے اظہار کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں، وہ مقطع ہے:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

''بانگِ درا'' کے حصہ دوم میں، جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے زمانے میں لکھی گئی منظومات پر مشتمل ہے، اگرچہ، صقلیہ جیسی نظم بھی شامل ہے، جس میں اقبال کے ملّی جذبات پہلی بار بھرپور انداز میں ظاہر ہوئے ہیں، نعت کا کوئی ایک شعر شامل نہیں ہے۔ تاہم ستمبر ۱۹۰۵ء میں سفرِ یورپ کے آغاز میں، بحری جہاز میں لکھے ہوئے ایک نسبتاً نو دریافت خط کے ایک حصے سے بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ اقبال کی زندگی کے ہر مرحلے میں ایک شدید، گہری اور ذاتی معنویت کی حامل جذباتی وابستگی کے طور پر موجود رہا، یہ خط جو ''اخبارِ وطن'' لاہور کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں کے نام لکھا گیا اور انھیں کے اخبار میں شائع بھی ہوا، اقبال کی داخلی اور ذہنی زندگی کے لطیف جذباتی محرکات میں عشقِ رسول ﷺ کی مرکزی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک طویل خط ہے، بلکہ اسے اقبال کا طویل ترین مکتوب بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس خط میں اقبال نے اپنے سفر کے ابتدائی حصے کے احوال تفصیل سے لکھے ہیں (یہ خط اُن کی کامیاب جزئیات نگاری کا نمونہ بھی ہے)۔ یہ خط جو ساحلِ عدن سے ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لکھا گیا، ساحلِ عدن ہی کے تذکرے کے ساتھ اس طرح ختم ہوتا ہے:

> اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق وشوق اس وقت دل میں پیدا کردیا ہے، اس کی داستاں کیا عرض کروں، بس یہی دِل چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منوّر کروں:
>
> اللہ رے خاکِ پاک مدینہ کی آبرو
> خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا
>
> اے عرب کی سرزمین! تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا

کے معماروں نے رد کردیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔[۹]☆ باغ کے مالک نے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا، لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ پر آہ! اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو اُن کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہوکر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال رضی اللہ عنہ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

از عدن مؤرخہ ۱۲؍ستمبر　　　　راقم محمد اقبال[۱۰]☆

اقبال کی تمام نثری تحریروں میں یہ سب سے زیادہ انوکھی تحریر ہے۔ اسے اقبال کی شاعرانہ اور جذباتی نثر کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں اقبال کی زندگی کا سب سے عمیق جذبہ اس طرح سے منعکس ہوگیا ہے، 'جس طرح عکسِ گُل ہو شبنم کی آرسی میں'۔ اس عکسِ گُل نے اقبال کی شاعری میں وہ باغِ ہمیشہ بہار کھلا دیا جسے ہم اُن کی نعتیہ شاعری کہہ سکتے ہیں۔ 'اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا۔ کاش میں تیرے بیابانوں میں لُٹ جاؤں۔' اذانِ بلال رضی اللہ عنہ کو عاشقانہ آواز، کہہ

کر اقبال نے اس 'صدائے حق' کو نہ صرف ہمارے گوشِ تخیّل کے قریب کردیا ہے، بلکہ دنیا کی آوازوں میں اس کی نوعیت اور اس کا مابہ الامتیاز بھی بتا دیا ہے۔ غالبًا اس سے کچھ ہی عرصہ پیش تر اقبال اپنے اِبتدائی دورِ شاعری کی شہرۂ آفاق نظم ''فریادِ اُمت'' میں ایسے ہی جذبات کا اِظہار کر چکے تھے، گو یہ نظم اقبال کے متروکاتِ شعری میں سے ہے، لیکن اس کا نعتیہ حصہ اب بھی اقبال کے شعری شہ پاروں میں رکھا جاسکتا ہے۔ ''فریادِ اُمت'' ترکیب بند کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، اور اس کے اِبتدائی چار طویل بند، تمہید، کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان چار اِبتدائی بندوں کو ہم ایک خاص نوع کی طویل غزلیں بھی کہہ سکتے ہیں جن کا آہنگ بلند، مگر لَے حُزنیہ ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس حُزنیہ لے کی تہ میں جذبات و احساسات کا ایک زبردست طوفان کروٹیں لے رہا ہے۔ چوتھے بند کا آخری شعر (خفیف سے تصرّف کے ساتھ) مشہور نعت گو شاعر قدسی کا ہے:

المدد سیّدِ مکّی مدنی العربی
دِل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اِس طویل نظم میں نعتیہ اشعار کی تعداد خاصی ہے، اگرچہ اکثر اشعار پر روایت کا پرتو ہے، لیکن شاعر کی طباعی اور مدحتِ رسول ﷺ میں آنے والے برسوں میں اُن کا منفرد اُسلوب ان شعروں میں بھی جھلک جاتا ہے:

تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دِل میں
''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''
کبھی یثرب میں اویسِ قرنی سے چھپنا
کبھی برقِ نگہِ موسیٰؑ عمراں ہونا
قابِ قوسین بھی ، دعویٰ بھی عبودیت کا
کبھی چلمن کو اُٹھانا ، کبھی پنہاں ہونا
لطف دیتا ہے مجھے مِٹ کے تری الفت میں
ہمہ تن شوق ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا ، یہی ایماں میرا
تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا
خندۂ صبحِ تمنّاے براہیم استی
چہرہ پرداز بجیرت کدۂ میم استی
پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا
میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا
ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری
قابِ قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری
حسن تیرا مِری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھ کو
موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو
ہمہ حسرت ہوں ، سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں
اے کہ تھا نوح کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیم کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا ظلمتِ عالم میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پرتَو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پا کے اِشارہ تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں

ہے عیاں معنیِ لولاک سے پایہ تیرا
ناز تھا حضرتِ موسیٰؑ کو یدِ بیضا پر
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
کیا کہوں اُمتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم ، وہ مصیبت کیا ہے

تقریباً اسی زمانے میں اقبال نے وہ نعت لکھی جس کا مطلع ہے:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

یہ نعت بھی بہت حد تک روایتی خیالات پر مشتمل ہے، اگر ''مدینے کے کبوتر کی فریاد'' کی نسبت اقبال سے درست ہے تو یہ نظم بھی اُن کے اُسی دورِ شاعری سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ تمام اقبال کے شعری متروکات ہیں جنھیں بہ وجوہ انھوں نے اپنے مرتبۂ کلام میں شامل نہیں کیا۔ ''بانگِ درا'' کی اُن نظموں میں جو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان لکھی گئیں، اُن میں ''شکوہ'' کی تخلیق پر مقدم ایک نظم ہے ''ایک حاجی مدینے کے راستے میں'' جس میں بہ ظاہر تو اس زمانے کے سفرِ مدینہ کے خطرات ومہلکات کا تذکرہ ہے، لیکن بالواسطہ شاعر کے شوقِ زیارت کا بیان ہے، اس نظم میں لاشعوری طور پر عرب لینڈ اسکیپ کی یاد متشکل ہوتی ہے۔ یہ نظم ہر عہد کے مسلمانوں کی زیارتِ مدینہ کی آرزو کی آئینہ دار بھی ہے۔ تخلیقی سطح پر یہ نظم انیس ویں صدی کے اواخر اور بیس ویں صدی کے اوائل میں سفرِ حجاز کے عمومی اور مکے سے مدینے کے سفر کے خاص حالات کی ایک خیالی بازیافت ہے:

قافلہ لُوٹا گیا صحرا میں ، اور منزل ہے دور
اس بیاباں ، یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دور
ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو ہو کے بیدل سوئے بیت اللہ پھرے
اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی

موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی!
خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
''ہائے یثرب'' دِل میں لب پہ نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ تُو مسلم ہے، بے باکانہ چل
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفون یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جاں کاہی میں ہے
آہ! یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے
اور تأثر آدمی کا کس قدر بے باک ہے

جس دور میں اقبال نے ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' جیسی نظمیں تخلیق کیں وہ مسلمانانِ عالم کے لیے ایک عالم گیر انحطاط و انتشار کا زمانہ تھا، اقبال مسلمانانِ عالم کی اس عمومی صورتِ حال پر ہمہ وقت بے تاب و بے قرار رہتے تھے۔ ''جوابِ شکوہ'' لکھنے سے کچھ ہی عرصہ پیشتر اقبال نے طرابلس کے شہیدوں کے حوالے سے ایک نظم ''حضورِ رسالت مآب ﷺ میں'' لکھی یہ نظم بارگاہِ نبوی ﷺ میں شاعر کی ایک خیالی حضوری کو بیان کرتی ہے، فرشتے شاعر کو بزمِ رسالت ﷺ یعنی حضورِ آیۂ رحمت ﷺ میں لے جاتے ہیں، بارگاہِ نبوی ﷺ سے شاعر سے خطاب کیا جاتا ہے:

کہا حضور ﷺ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوشِ جامِ وِلا ہے دِل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اُڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟
حضورﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

نظم ''جوابِ شکوہ'' جو بارگاہِ ایزدی سے ''شکوہ'' میں بیان کیے گئے خیالات وسوالات کا جواب ہے، اقبال کے عشقِ رسول ﷺ کی ایک بھرپور جھلک پیش کرتی ہے۔ اس میں خداوندِ قدوس کی طرف سے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تمھاری فوز و فلاح کا تمام تر انحصار اتباع و عشقِ رسولِ مقبول ﷺ میں ہے:

قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کردے

اگلے دو بندوں میں نظامِ تکوین میں 'اسمِ محمدؐ' کے فیضان اور برکات کا تذکرہ کیا ہے:

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

''جوابِ شکوہ'' کا اِختتام جس شعر پر ہوتا ہے وہ بھی اسی سلسلۂ خیال کا ایک نقطۂ عروج ہے، یعنی:

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے، تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

''اسرارِ خودی'' (مطبوعہ ۱۹۱۵ء) اور ''رموزِ بے خودی'' (مطبوعہ ۱۹۱۸ء) اقبال کی فکری اور فنی پختگی کے اوّلیں شاہکار ہیں۔ یہی دو عظیم الشان مثنویاں ہیں جن میں اقبال کے تمام اہم خیالات وافکار یک جا اور مربوط انداز میں بیان ہوئے ہیں، اگرچہ اقبال نے ان دو مثنویوں کے بعد بہت کچھ لکھا، لیکن اُن کے فلسفۂ خودی اور نظریۂ حیات کی اساسی تشکیل انھی مثنویوں میں ہوئی۔ اُن کے فلسفیانہ فکر اور فلسفۂ اجتماعیت کے تمام اساسی نکات ان مثنویوں میں موجود ہیں۔ آگے چل کر اقبال نے جو کچھ کہا، وہ ایک اعتبار سے انھی نکات کی تشریح وتفسیر ہے۔ یہی وہ مثنویاں ہیں جن کی بہ دولت اقبال 'رومیِ عصر' کہلائے، انھی میں اقبال کا وہ انقلاب آفریں پیغام ہے جس نے بیس ویں صدی میں ملتِ اسلامیہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک عظیم تغیر برپا کردیا۔ ان مثنویوں کی تخلیق کے زمانے میں

اقبال کے جذبۂ حب رسول ﷺ میں مزید پختگی و گہرائی اورفکری و معنوی وسعت پیدا ہوئی۔ ’’اسرارِ خودی‘‘ چوں کہ خودی کے استحکام سے بحث کرتی تھی، اس لیے اس میں اس موضوع کا حوالہ صرف ایک جگہ موجود ہے یعنی خودی کی بقا و استحکام کے لیے ضبطِ نفس اور اطاعتِ شریعت کا حوالہ، لیکن ’’رموزِ بے خودی‘‘ میں اقبال نے اطاعتِ شریعت اور عشقِ رسول ﷺ کے نفسیاتی، فلسفیانہ، اخلاقی اور تمدنی مضمرات کو پہلی بار اس شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ’’رموزِ بے خودی‘‘ میں ’’ارکانِ اساسی ملتِ اسلامیہ‘‘ کے عنوان سے رُکنِ اوّل کے ذیل میں توحید اور رُکنِ دوم کے ذیل میں رسالت کے مفہوم و معنویت کی تشریح کی ہے، ’رسالت‘ کے تحت وہ لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بُدیم
از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است
جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
آں کہ شانِ اُوست یَہدِی مَن یُرید
از رسالت حلقہ گردِ ماکشید
حلقۂ ملّت محیط افزاستے
مرکزِ اُو وادیِ بطحاستے
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم
از میانِ بحرِ اُو خیزیم ما

مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
اُمتش در حرزِ دیوارِ حرم
نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم

(اللہ تعالیٰ نے ہمارا پیکر تخلیق کیا، اور اس کے بعد رسالت کے ذریعے ہمارے جسم میں رُوح پھونکی۔ ہم اِس دنیا میں بے آواز الفاظ تھے۔ رسالت (کے فیض) سے ہم مصرعِ موزوں بن گئے۔ ہماری تشکیل و تکوین دنیا میں رسالت ہی سے ہے۔ یہ رسالت ہی ہے جس سے ہمارا دِین— ہمارا آئینِ زندگی بھی ہے۔ رسالت کے سبب ہم لاکھوں بھی ہوں تو ہم ایک ہیں، اور ہمارا ہر جزو، دوسرے جزو سے پیوست ہے۔ وہ خداوندِ قدوس کہ جس کی شان یَھدِی مَنۡ یُرید ہے، یعنی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اس نے (خطِ) رسالت سے ہمارے اِردگرد دائرہ کھینچ دیا ہے، ملت کا دائرہ اپنے محیط کو وسیع کرتا ہے اور اس کا مرکز وادیِ بطحا ہے، ہم اسی (مرکز) کی نسبت سے ایک قوم (ملّت) ہیں اور اسی نسبت سے ہم دنیا والوں کے لیے پیغامِ رحمت ہیں، ہم اس کے سمندر کے درمیان سے اُبھرتے ہیں اور موج کی طرح بکھرتے نہیں۔ رسولِ اکرم ﷺ کی اُمت (کے افراد) دیوارِ حرم کی پناہ گاہ میں جنگل کے شیروں کی طرح گرجتے ہیں۔)

اس شعر کا مضمون، جس میں اقبال نے افرادِ ملتِ اسلامیہ کو جنگل کے شیروں سے تشبیہ دی ہے، حضرت امام بوصیریؒ[۱۲☆] کے قصیدۂ بردہ کے ایک شعر سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس شعر کا حوالہ اقبال نے خود ہی حاشیے میں دے دیا ہے۔ جنگل کے معنوں میں لفظ اَجَم جو کہ ایک غریب لغت ہے، اسی شعر کے زیرِ اثر اِختیار کیا گیا ہے، وہ شعر قصیدۂ بردہ کی الفصل الثامن فی ذکرِ جهاد النّبی صلی الله علیه وسلم میں قصیدے کا ایک سو انتالیسواں شعر ہے:

اَحَلُّ اُمَّتَه فِی حِرُز مِلَّتِه
کَا لَّلیث حَلَّ مَعَ الاَ شَبَالِ فِی اَجَمَ

(آپ ﷺ) نے اپنی اُمت کو اپنی شریعتِ حقہ کے محفوظ حصار میں اُتارا (اور

مخالفوں اور دشمنوں سے اُن کی اس طرح حفاظت کی) جیسے وہ شیر (لیث) جو اپنے بچوں (اشبال جمع شبل بمعنی بچہ شیر) کے ساتھ اپنے بیشے (اَجَم: گھنا جنگل) میں مقیم ہو۔

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں:

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ
قلبِ مومن را کتابش قوت است
حکمتش حبل لوریدِ ملت است
دامنش از دست دادن مردن است
چوں گل از بادِ خزاں افسردن است
زندگی قوم از دمِ اُو یافت است
ایں سحر از آفتابش تافت است
فرد از حق ، ملت ازوی زندہ است
از شعاعِ مہر او تابندہ است
دینِ فطرت از نبی ﷺ آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اُوست
ما کہ یک جانیم ، از احسانِ اُوست
تانہ ایں وحدت زدستِ ما رود
ہستیِ ما با ابد ہم دم شود
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ﷺ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را

(اے مخاطب، اگر تو میرے الفاظ کی تحقیق کرے، اور اگر تو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہٗ کی نظر سے دیکھے تو (تو دیکھے گا) کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام (مومن کے لیے) قلب وجگر کی قوت بن جاتے ہیں، بلکہ وہ خدا سے بھی زیادہ محبوب ہوجاتے ہیں۔ (آپ ﷺ کی لائی ہوئی) کتاب مومن کے دِل کے لیے قوت (کا سرچشمہ) ہے اور آپ ﷺ کی حکمت (سنّت) ملت کی رگِ زندگانی ہے۔ آپ ﷺ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا (فی الحقیقت) مرجانے کے مترادف ہے، یہ پھول کے خزاں کی ہوا سے مرجھانے کے مترادف ہے۔ قوم (مسلم) نے آپ ﷺ ہی کے نفسِ جاں فزا سے زندگی پائی ہے (ملتِ اسلامیہ کی یہ) صبحِ درخشاں آپ ﷺ (کی رحمت) کے سورج سے طلوع ہوئی ہے۔ فرد حق تعالیٰ سے اور ملت آپ ﷺ سے زندہ ہے، اور آپ ﷺ ہی کے آفتابِ رحمت سے تابندہ ہے۔ ہم نے دینِ فطرت کی تعلیم آپ ﷺ ہی سے حاصل کی ہے جس کے نتیجے میں ہم نے راہِ حق میں مشعل جلائی ہے۔ یہ موتی اُنھیں کی رحمت و رافت کے بحرِ بے پایاں سے ہے، اور ہم (افرادِ ملتِ مسلمہ) اگر ایک ہیں تو یہ بھی آپ ﷺ ہی کا احسان ہے۔ اگر ہم اس وحدت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، تو یہ ہماری ہستی لازوال (ابد کی ہم سفر) ہوجائے گی۔ چناں چہ خداوند تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسولِ مقبول ﷺ پر رسالت و نبوت ختم کردی، زمانے کی محفل کی رونق اب صرف ہمیں سے ہے۔ اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ انبیا و رسل کے خاتم ہیں اور ہم اقوام کے۔)

ان شعروں میں آخری دو شعروں کا مضمون بھی حضرت امام بوصیری کے ایک شعر سے لیا گیا ہے، جسے اقبال نے خود ہی حاشیے میں نقل کردیا۔ یہ شعر الفضل السابع فی ذِکرِ مِعراجِ النَّبیِّ ﷺ کا آخری اور قصیدے کا ایک سو اُنیس واں شعر ہے:

لَمَّاَ دَعَی اللہ دَاعِیْنَا لِطَاعَتِہٖ
بِاَکرَمِ الرُّسُلِ کُنَّا اَکرَمَ الْاُمَمِ

چوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے داعی (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کو اکرم الرسل

(نبیوں میں سب سے مکرم) کہہ کر اپنی اطاعت کے لیے بلایا ہے اس لیے(اس نسبت سے) ہم (افرادِ اُمتِ مسلمہ) بھی تمام اُمتوں میں سب سے مکرم قرار پاتے ہیں۔

''رموزِ بے خودی'' کے ایک باب میں جس کا عنوان ہے:'' در معنیِ ایں کہ چوں ملتِ محمدیہ مؤسس برتوحید ورسالت است، پس نہایتِ مکانی ندارد'' (اس مفہوم کی تشریح میں کہ چوں کہ ملتِ محمدیہ توحید ورسالت کے تصورات پر اُستوار ہے،اس لیے اس کے لیے کوئی مکانی یعنی جغرافیائی حد نہیں ہے)، کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کے مشہور قصیدۂ نعت کے حوالے سے اقبال کہتے ہیں:

پیشِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چو کعب رضی اللہ عنہ پاک زاد
ہدیۂ آورد از بانت سُعاد
در ثنایش گوہرِ شب تاب سفت
سیفِ مسلول از سیوف الہند گفت
آن مقامش بر تر از چرخِ بلند
نامدش نسبت بہ اقلیمی پسند
گفت سیفِ من سیوف اللہ گو
حق پرستی جز براہِ حق مپو
ہم چناں آں راز دانِ جزو و کُل
گردِ پایش سرمۂ چشمِ رُسل
گفت با اُمت ، ''ز دنیاے شما
دوست دارم طاعت و طیب و نسا''
گر ترا ذوقِ معانی رہ نما است
نکتۂ پوشیدہ در حرفِ ''شما'' ست
یعنی آں شمعِ شبستانِ وجود
بود در دنیا و از دنیا نبود

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز
بود اندر آب و گِل آدم ہنوز

(پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں جب پاک زاد کعب رضی اللہ عنہ (بن زہیر) اپنے قصیدے ''بَانَت سُعادُ'' کا تحفہ لائے، تو گویا انھوں نے مدحِ رسول ﷺ میں شب تاب موتی پروئے۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو سیوف الہند (ہندوستان کی تلواروں) میں سے سیفِ مسلول کہا۔ تو رسولِ اکرم ﷺ، کہ جن کا مقام آسمانِ بلند سے بھی بلند تر ہے، انھیں ایک خطۂ زمین سے اپنی نسبت پسند نہ آئی، چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کی تلواروں میں سے تلوار کہو، اور چوں کہ تم حق پرست ہو، اس لیے سوائے حق پرستی کی راہ کے اور کوئی راہ اِختیار نہ کرو۔ چناں چہ آپ ﷺ نے، جو ہر جزو وکُل کے رازداں ہیں، اور آپ ﷺ کے قدموں کی خاک انبیا کی آنکھوں کا سُرمہ ہے، اُمت سے فرمایا کہ میں تمھاری دنیا میں سے خوش بو اور عورت کو پسند کرتا ہوں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، تو اے مخاطب! اگر ذوقِ معانی تیرا رہنما ہو تو حرفِ شما (تم یا تمھاری دنیا) میں ایک نقطہ پوشیدہ ہے، یعنی وہ شمعِ شبستانِ وجود ﷺ، دنیا میں تو تھے، لیکن دنیا کے نہیں تھے۔ ابھی آدم علیہ السلام، آب وگِل ہی میں تھے کہ آپ ﷺ کا جلوہ قدسیوں کے لیے سینہ سوز (آتشِ عشق کا باعث) بن چکا تھا۔)

آخری شعر کی وضاحت کے لیے اقبال نے حاشیے میں اس حدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں: کُنتُ نبیّاً وَ آدمَ بَینَ المَاءِ والطِیَنَ۔ (آدم ابھی مٹی اور پانی کے درمیان تھے کہ میں نبی تھا) کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر کے قصیدے کے حوالے کی تشریح اقبال نے حاشیے میں ان الفاظ میں کی ہے:

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم ﷺ کو بہت ایذا دیا کرتے تھے۔ فتحِ مکہ کے بعد مکہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے وہاں سے قصیدہ بَانَت سُعاد لکھ کر حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگی۔ حضورِ اکرم ﷺ نے انھیں معاف کردیا اور قصیدے کے صلے میں اپنی چادر عطا فرمائی۔ اس قصیدے میں کعب رضی اللہ عنہ نے

حضور ﷺ کو سیف مِن سیوف الھند (ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کے الفاظ سے مخاطب کیا، مگر حضور ﷺ نے کعب رضی اللہ عنہ کے مصرعے میں اِصلاح دے کر فرمایا سیف مِن سیوف اللّٰہ" کہنا چاہیے (یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار)[۱۳۱]

"رموزِ بے خودی" کے ایک باب کا عنوان ہے "در معنیِ ایں کہ حسنِ سیرت ملیہ از تادب بآداب محمدیہ ﷺ است"۔ (اس مفہوم کے بیان میں کہ— ملتِ اسلامیہ کا حسنِ سیرت نبیِ اکرم ﷺ کے آداب و اخلاق سے خود کو آراستہ کرنے میں ہے) اس باب میں اقبال اپنی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے، جو اُن کے عنفوانِ شباب کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، کہتے ہیں کہ ایک روز ایک سائل ہمارے گھر کے دروازے پر قضائے مبرم کی طرح آ کھڑا ہوا اور پیہم صدائیں دینے لگا، میں نے غصے میں آ کر اس کے سر پر لکڑی دے ماری، جس سے اُس کی دِن بھر کی کمائی گر گئی۔ میرے والد اس پر بے حد آزردہ ہوئے اور اُن کے چہرے کا گلشن مرجھا گیا، اُن کے سینے میں دِل تڑپنے لگا اور دم بدم آہِ سرد بھرنے لگے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ میں شدتِ انفعال سے لرزنے لگا۔ اور بے چین ہوگیا۔ میرے والد نے کہا، "کل روزِ قیامت جب خیرالرسل ﷺ کی اُمت اُن کے گرد جمع ہوگی۔ نمازی اور علمائے اُمت، شہدائے اُمت جو دِین کی حجت اور آسمانِ ملت کے درخشندہ ستارے ہیں، زاہدانِ پاک باز، عاشقانِ دل فگار اور عاصیانِ شرمسار (سب جمع ہوں گے) اس وقت جب اس غم نصیب فقیر کی فریاد بلند ہوگی تو میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو کیا جواب دوں گا، جب وہ استفسار فرمائیں گے:

"حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گِلِ آدم نشد"

(حق تعالیٰ نے ایک نوجوان مسلمان کو تیرے سپرد کیا تھا، جو میرے دبستان سے مستفید نہ ہوسکا۔ تجھ سے اتنا سا کام بھی نہ ہوسکا، یعنی اس مٹی کے تودے کو انسان بھی نہ بنا سکا۔)

اند کے اندیش و یاد آر اے پسر
اِجتماعِ اُمتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر
لرزۂ بیم و اُمیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رُسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ
گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ ﷺ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت
مرشدِ رُومی چہ خوش فرمودہ است
آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
''مگسل از ختم الرسل ﷺ ایامِ خویش
تکیہ کم کن بر فن و برگامِ خویش''
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است،
درجہان دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دونیم
رحمتِ اُو عام و اخلاقش عظیم
از مقامِ اُو اگر دور ایستی
از میانِ معشرِ ما نیستی

(میرے بچے، کچھ سوچ اور روزِ جزا اُمتِ خیرالبشر ﷺ کے اِجتماع کو یاد رکھ، پھر میری سفید ڈاڑھی کو بھی دیکھ، اور میری اس اُمید وبیم کو بھی نظر میں رکھ، باپ پر ایسا ستمِ ناروا نہ کر، ایک غلام کو اپنے آقا ﷺ کے سامنے رُسوا نہ کر، تو شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ کا ایک

غنچہ ہے، تو اس باغ کی بہار کی ہوا سے پھول بن جا۔ باغِ رسالت کی بہار سے رنگ و بُو حاصل کرنا چاہیے اور آپ ﷺ کے خلقِ عظیم سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔ مرشدِ رُومی نے کیا اچھا کہا ہے، مرشدِ رُومی کہ اس قطرے میں سمندر سما گیا ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اپنے زمانے کو ختم الرسل ﷺ سے منقطع نہ کر، اور اپنے علم و ہنر اور اپنی رفتار و گام پر بھروسا نہ کر، مسلمان کی فطرت سراپا شفقت ہے، دنیا میں مسلمان کی زبان اور اس کے ہاتھ مخلوقاتِ عالم کے لیے باعثِ رحمت ہیں (باعثِ زحمت نہیں)، آپ ﷺ کے سرِانگشت سے چاند دوٹکڑے ہوگیا، اُن کی رحمت عام اور ان کے اخلاق عظیم ہیں۔ اگر تو اُن کے مقام سے دور جا کھڑا ہوگا تو تُو ہم میں سے نہیں ہوگا۔)

رموزِ بےخودی کا اختتام، عرضِ حالِ مصنف بہ حضورِ رحمۃ للعالمین ﷺ پر ہوتا ہے، یہی وہ منظومۂ بے مثال ہے جس میں اقبال کا فکر اور فن دونوں تکمیل کی بلندی پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان اشعار میں اقبال نے اپنے جذباتِ عقیدت، آنحضرت ﷺ کے مکارمِ اخلاق اور عالمِ کون و مکاں میں آپ کے ظہور و بعثت کی معنویت کو کمالِ فن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی وہ حقیقتِ منتظرہ تھی جس کی آمد کی نوید تمام آسمانی کتابیں دیتی چلی آرہی تھیں۔ بحرِامکاں کی موج موج اس گوہرِ نایاب سراغ کی جستجو میں بے تاب تھی جو ابھی محیطِ کائنات کی پہنائیوں میں مضمر تھا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک آیۂ کائنات کا مفہومِ کُلی تھی جو دیر یاب تھا:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہاے رنگ و بُو
اے ظہورِ تُو شبابِ زندگی
جلوہ اب تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن زتابِ رُوے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تو

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تُو سرمایۂ ایں کائنات
در جہان شمعِ حیات افروختی
بندگان را خواجگی آموختی
بے تو از نابودمندی ہا خجل
پیکرانِ ایں سرائے آب و گِل
تادمِ تُو آتشے از گِل کشود
تودہ ہاے خاک را آدم نمود
ذرّہ دامن گیرِ مہر و ماہ شد
یعنی از نیروے خویش آگاہ شد
تا مرا اُفتاد بر رویت نظر
از اب و ام گشتۂ محبوب تر
اے بصیری را رِدا بخشندۂ
بربطِ سلما مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
اینکہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ مَا فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

(اے وہ ہستی کہ آپ ﷺ کا ظہور زندگی کا شباب ہے، آپ ﷺ کا جلوہ

زندگی کے خواب کی تعبیر ہے، اے وہ ہستی کہ زمیں آپ ﷺ کی بارگاہ کی بہ دولت ارجمند ہے، اور آسماں بھی آپ ﷺ کے بامِ بلند کو بوسہ دینے سے ہی بلند ہوا ہے۔ شش جہت آپ کے رُوے منور سے روشن ہوتے ہیں، (آپ ﷺ آقا ہیں اور) ترک و تاجیک وعرب آپ ﷺ کے غلام ہیں۔ کائنات کا مرتبہ آپ ﷺ ہی سے بلند ہوا ہے، آپ ﷺ کا فقر اس کائنات کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ آپ ﷺ ہی نے دنیا میں زندگی کا چراغ روشن کیا، آپ ﷺ ہی نے غلاموں کو سرداری سکھائی ہے۔ آپ ﷺ کے بغیر اس دنیاے آب و گِل کے تمام پیکر اپنی بے بضاعتی پر نادم اور شرمندہ تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے نفسِ پاک سے مٹی میں آگ روشن کی ہے، اور تودۂ خاک کو آدم بنا دیا ہے۔ آپ ﷺ ہی کے الطاف وعنایات سے ذرّوں نے مہروماہ کا دامن جا پکڑا ہے، یعنی ذرّہ اپنی حقیقت وقوت سے آگاہ ہوگیا ہے۔ جب سے آپ ﷺ کے رُوے منوّر پر میری نظر پڑی ہے، آپ ﷺ مجھے ماں، باپ سے زیادہ محبوب ہوگئے ہیں۔ اے بوصیری کو چادر عطا کرنے والے! آپ ﷺ ہی نے مجھے بربطِ سلمٰی (مراد ہے جوہرِ شاعری) عطا کیا ہے۔ آپ ﷺ مجھ غلط اندیش کو ذوقِ حق عطا فرمائیے اس لیے کہ میں اپنی متاع کو نہیں پہچانتا۔ اگر میرا دِل ایک آئینۂ بے جوہر ہے (یعنی روشن نہیں) اور اگر میرے حرف (میری شاعری) میں سواے مطالبِ قرآن کے اور کوئی چیز مضمر ہے تو اے وہ ہستی کہ آپ ﷺ کا جمال زمانوں کی صبح ہے اور آپ ﷺ کی چشمِ مبارک سینے کے بھیدوں کو بھی دیکھ لیتی ہے، میرے فکر کے ناموس کا پردہ چاک کر دیجیے، اور مجھ ایسے کانٹے سے اس باغ (اُمتِ مسلمہ) کو پاک کر دیجیے۔)

—۲—

تہذیبِ اِسلامی کی تاریخ میں فکروعمل کی سطح پر دوتحریکیں بے حد اہمیت کی حامل ہیں، ایک تصوّف کی ہمہ گیر تحریک جو قرونِ اولیٰ سے ہی مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے انفرادی پہلو پر محیط ہوگئی تھی۔ دوسرے وہ عقلی تحریک جو مسلمانوں میں یونانی علوم کی اشاعت سے پیدا ہوئی، اور بالآخر مسلمانوں کے مخصوص دینی فلسفے، یعنی علم الکلام پر منتج ہوئی۔ یہ دونوں تحریکیں مسلمانوں کے دینی علوم، تفسیر و حدیث، فقہ اور تاریخ و سیر پر مستزاد

تھیں، اور فی الحقیقت (بعض عقلی تحریکوں کو چھوڑتے ہوئے) اِسلامی طریقِ زندگانی اور اِسلامی طرزِ فکر ہی میں پیوست تھیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ تصوف اور علم الکلام کو صرف دو تحریکیں قرار دینا بھی کچھ ایسا صحیح نہیں، اس لیے کہ بہت جلد یہ دونوں تحریکیں بے شمار دوسری تحریکوں اور دبستانوں میں منشعب ہوئیں۔ تاہم اس سے ہماری مراد دو اساسی طریقوں کی نشان دہی ہے۔ خود تصوف نے بہت جلد فلسفے کے بے شمار تصورات و دقائق کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا، بہرصورت تصوف اور علم الکلام کی تحریکوں کے آغاز سے جہاں اور معتقدات کی عقلی توجیہات پیش کی گئیں، وہاں مقامِ نبوت، منصبِ رسالت اور حقیقتِ رسالت و نبوتِ محمدیہ ﷺ کو بھی بعض عقلی ذرائع سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ان عقلی ذرائع کی تہ میں صوفیا کے روحانی واردات بھی یقیناً کارفرما تھے، اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں فلاسفۂ متصوفین سب سے پیش پیش رہے۔ چناں چہ جوں جوں فلاسفۂ متصوفین اِسلام کے اعتقادات کی عقلی اور نفسیاتی توجیہوں کو ایک مابعد الطبیعیاتی نظام میں ڈھالتے چلے گئے، ''حقیقتِ محمدیہ ﷺ'' کا تصور اس نظام کا جزوِ اعظم بنتا چلا گیا۔ ''حقیقتِ محمدیہ ﷺ'' کے تصور کی عقلی، نفسیاتی اور اعتقادی توجیہ وتشریح سب سے پہلے اُندلس کے صوفی مفکر اور فلسفۂ وحدت الوجود کے بانی شیخِ اکبر حضرت محی الدین ابن العربی نے کی، فی الحقیقت ''حقیقتِ محمدیہ ﷺ'' کے تصور کے بانی ابن العربی ہی ہیں جن سے صدرالدین قونیوی یا قونوی کے ذریعے عبدالکریم الجیلی نے اثر قبول کرتے ہوئے 'اِنسانِ کامل' کا نظریہ پیش کیا۔ ایران کے مذہبی فلاسفۂ متأخرین میں میر باقر داماد، اور اُن کے شاگرد رشید مُلا صدرالدین شیرازی عرف مُلا صدرا نے اس تصور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ماہیتِ وجود کی تشریح کے سلسلے میں (بالخصوص وحدت الوجود کے بعض اصطلاحی مباحث کے نقطۂ نظر سے) اقبال کو ابن العربی سے کتنے ہی فروعی یا بنیادی اِختلافات کیوں نہ ہوں، ''حقیقتِ محمدیہ ﷺ'' کے معاملے میں اُن سے (ابن العربی سے) کلیتاً متفق نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اقبال نے نبوت و رسالتِ محمدیہ ﷺ کی تشریح میں کہیں بھی حقیقتِ محمدیہ ﷺ کی اصطلاح استعمال نہیں کی، لیکن جو کچھ انھوں نے اس سلسلے میں کہا ہے اسے 'حقیقتِ محمدیہ ﷺ' کے تصور کے بہت قریب یا اس کی تشریح کہا جاسکتا ہے۔ عرفا کے نزدیک حقیقتِ محمدیہ ﷺ کی تشریحات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب بے حد

تفصیل طلب ہے اور اس مختصر مضمون کے دامنِ مطالب سے بہت حد تک افزوں بھی، اس لیے اس تصور کو اشارتاً مرزا عبدالقادر بیدل کے ان اشعار کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے جو اُن کی مثنوی ''طلسمِ حیرت'' میں شامل ہیں:

محمد ﷺ صافیِ آئینۂ قُدس!
ہماں سرمایۂ گنجینۂ قُدس
نوای عشرتِ نُہ پردۂ ساز
نشاطِ محفلِ انجام و آغاز
چہ واجب ، نشّۂ سرجوشِ نورش
چہ ممکن ، دُردِ مینای ظہورش
خمِ امکاں کہ ہستی نام دارد
زجوشِ او مئے در جام دارد
ظہورش غازۂ تقییدِ آفاق
بطونش بی نیازی ہاے اطلاق
جہاں ، مرآتِ انوارِ جمالش
دلِ ہر ذرّہ فانوسِ خیالش
یقیں تا بُرد در آئینہ اش راہ
نشد بے پردہ نقشے جز ہو اللہ
زبانم قابلِ حمدِ خدا شُد
کہ با نامِ محمد ﷺ آشنا شد
زہے نامی کہ جاں دیوانۂ اوست
بم و زیرِ جہاں پروانۂ اوست
دراں خلوت کہ دور از کیف و کم بود
نگاہ و جلوہ در خوابِ عدم بود

چو شد حسنِ حقیقت جلوہ اندیش
محمد دید در آئینۂ خویش
ز آغوشِ احد یک میم جوشید
کہ بیرنگی لباسِ رنگ پوشید
ز احمد بر احد چیزی نیفزود
اگر میمی فزود، آں ہم یکی بُود
صدا و ساز یک تار است اینجا
گہر یک موجِ ہموار است اینجا![14]

کائنات کی تشکیل و تکمیل، یعنی ارتقائی حرکت میں ایک حقیقتِ منتظرہ کے تلاش و انتظار کے خیال کو مرزا بیدل اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

بحرِ بے تاب کہ آں گوہرِ نایاب کجاست
چرخِ سرگشتہ کہ خورشیدِ جہاں تاب کجاست
دَیر زیں غصہ در آتش کہ چورنگ است صنم
کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

اقبال نے 'حقیقتِ محمدیہ ﷺ' کے تصور اور اس سے متعلقہ دوسرے تصورات کی طرف ان اشعار میں اِشارہ کیا ہے:

لوح بھی تُو ، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دِیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم ، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے ، دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

''عالم آب وخاک میں تیرے ظہور سے فروغ'' کہہ کر اقبال نے نبوت اور بالخصوص 'نبوتِ محمد ﷺ' کی طرف ایک خاص اِشارہ کیا ہے۔اس قسم کے اِشارے اُن کی نعتیہ شاعری میں اور اُن کے کلام میں اکثر ملتے ہیں، 'اے مقام ومنزل ہر راہرو' 'گردِ تو گردد حریمِ کائنات'، 'اے وجودِ تو جہانِ نوبہار'— ان اشارات کی تشریح گو کسی قدر تفصیل کی متقاضی ہے، تاہم اجمالاً اِتنا کہا جاسکتا ہے کہ زندگی اور کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں، ایک تو اُصولِ مادّہ جسے قانونِ علّت ومعلول بھی کہا جاسکتا ہے اور دوسرا نفسِ اِنسانی۔ اقبال کے تصوراتی نظام میں نفسِ انسانی کو، جس کا اِصطلاحی نام اُنھوں نے ''خودی'' رکھا ہے، مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال ذہنِ اِنسانی یا نفسِ اِنسانی کو مادّے پر مقدم سمجھتے ہیں اور حقیقت کی توجیح (مادّے کے مقابلے میں) ذہن ہی سے کرتے ہیں۔ عقل اُن کے نزدیک محدود ہے، اس لیے مطلق حقیقت کا علم اُس کے بس کی بات نہیں، وجدان البتہ ایک ایسی صلاحیت ہے جس کے ذریعے مطلق حقیقت کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وجدان کے سلسلے میں ان کے خیالات وہی ہیں جو مولانا رُوم اور برگساں کے ہیں، لیکن وجدان بھی چوں کہ محدود انا سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اس کی بھی حدود ہیں۔ البتہ جب وجدان ''عشق'' کے درجے تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں انکشافِ حقیقت کی وسعتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔عشق اور وحی کو اسی لیے اُنھوں نے بہ طورِ مترادف بھی استعمال کیا ہے:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دِلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام

اگر فلاسفۂ متصوفین اور بالخصوص شیخ اکبر ابن العربی کی اصطلاحات استعمال کریں[۱۵] تو کہا جاسکتا ہے کہ زمانِ دہری[۱۶] اور زمانِ عصری[۱۷]، زمانِ سرمدی[۱۸] کی اِظہاری صورتیں ہیں۔ زمانِ سرمدی ایک مفہومِ کلی ہے، اس کا اِظہار واقعات وحوادثِ کائنات کی صورت میں ہورہا ہے، یہ اس کی تکوینی صورت ہے۔ تکمیلی صورت وہ ہے جس میں یہ موضوعی یا داخلی[۱۹] صورت اختیار کرتا ہے، یہی داخلی یا موضوعی صورت نفسِ اِنسانی ہے۔ زمانہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے

حیات و کائنات کے اغراض ومقاصد کا حامل ہے۔ زمانے کے ان تصورات کی روشنی میں اقبال کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔ ''تشکیلِ جدید' کے پانچ ویں خطبے میں اقبال لکھتے ہیں کہ ''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبرِ اسلام ﷺ کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیاے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے دنیاے جدید سے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔ اسلام میں چوں کہ نبوت اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی تھی، اس لیے اس کا خاتمہ ضروری ہوگیا۔'' سلسلۂ وحی و ہدایت اور سیرت و اخلاق میں رسولِ اکرم ﷺ کی یگانہ اور بے مثال حیثیت کے علاوہ اقبال کو 'ختمِ نبوت' کے مسئلے سے مابعدالطبیعیاتی نقطۂ نظر سے بھی دِل چسپی تھی اور عمرانی نقطۂ نظر سے بھی۔ خاتم النّبیین، یا تصورِ خاتمیت کا مسئلہ غالب کے زمانے کی الٰہیات کا بھی اہم ترین مسئلہ تھا، اس لیے انھوں نے ایک فارسی مثنوی میں اپنے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کی تشریح کی، اس مثنوی کا ایک اہم شعر ہے:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینے ہم بود

یعنی جہاں کہیں بھی ہنگامۂ ہست وبُود اور نظامِ وجود ہوگا، اس کی تکمیل کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ کا وجودِ مسعود بھی ہوگا۔ اقبال کو خاتمیت کے مسئلے سے مدت العمر دل چسپی رہی تھی، وہ ختمِ نبوت کے فلسفیانہ اور عمرانی بنیادوں پر قائل تھے۔ اس لیے اپنی عظیم مثنوی ''جاوید نامہ'' میں، جسے انھوں نے پایانِ عمر میں تصنیف کیا، اور جو اُن کے فکروفن کے کم و بیش تمام اِرتقائی مراحل کا ماحصل بھی ہے، وہ زندہ رُود کی صورت میں مسئلۂ خاتمیت پر غالب کے ساتھ طالب علمانہ انداز میں مباحثہ کرتے نظر آتے ہیں، اور غالب سے مذکورہ بالا شعر کی وضاحت طلب کرتے ہیں، غالب کا کہنا ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

یعنی ہر سلسلۂ تخلیق کی ابتدا تقدیر و ہدایت سے ہوتی ہے، تقدیر سے مراد قوانینِ فطرت اور ہدایت سے مراد سلسلۂ وحی و نبوت، قوانینِ فطرت کائناتِ خارجی کی علامت ہیں اور ہدایت، حیاتِ داخلی کی۔ غرض معروض و موضوع، مادّہ اور ذہن، انفس و آفاقی کی تکمیلِ معنوی کا آخری نقطہ رحمۃ للعالمینی ہے، یہ شعر سن کر اقبال، غالب سے مزید تشریح کا مطالبہ کرتے ہیں، غالب اعتراف کرتے ہیں کہ اس نکتے کی مزید تشریح مشکل ہے، اس کا اِظہار خطا سے خالی نہیں (ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست، نکتہ را بر لب رسیدن مشکل است)، بلکہ کفریات کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے (آنچہ تو از من بخواہی کافری است)، اس پر حلّاج واشگاف انداز میں کہتا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یاز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

(جہاں کہیں بھی تم رنگ وبُو (عالمِ امکاں) کا ہنگانہ دیکھو گے، یعنی وہ دنیا کہ جس کی خاک سے آرزو اُگتی ہے، تو تم دیکھو گے کہ یا تو وہ عالمِ نبوتِ مصطفیٰ کے نور سے فیض یاب ہو چکا ہوگا، یا ابھی اس فیضان کی تلاش میں ہوگا۔)

لیکن اقبال کی تسلی اس جواب سے بھی نہیں ہوتی اور وہ غالب کو چھوڑ کر حلّاج سے پوچھتے ہیں:

از تو پرسم ، گرچہ پرسیدن خطاست
سِرّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ ﷺ است
آدمی یا جوہری اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجود

([اے حلّاج!] ''میں تجھ سے پوچھتا ہوں، اگرچہ پوچھنا غلطی ہے (تاہم میں پوچھتا ہوں) کہ وہ جوہر، جس کا نام مصطفیٰ ﷺ ہے، کیا وہ آدمی (کوئی معین شخص) ہے یا وجود میں چھپا ہوا جوہر ہے جو کبھی کبھی وجود کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے؟) عبدالکریم الجیلی

کے نزدیک حقیقتِ محمدیہ ﷺ، ایک جوہر ہے جو کبھی کبھی معین اشخاص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال اسی تصور کے حوالے سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ُحلاج ایک بلیغ اور پرزور جواب دیتا ہے، (جو فی الحقیقت اقبال ہی کے خیالات ہیں، یعنی تاریخی اعتبار سے ان خیالات کا حسین بن منصور حلاّج کے خیالات سے کوئی تعلق نہیں، یا کم از کم حسین بن منصور حلاّج نے ان خیالات کا کہیں اِظہار نہیں کیا)۔ حلاّج کہتا ہے:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہمِ تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ، ہم جانستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر ، عبدہٗ چیزے دِگر
ما سراپا اِنتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم ، او بے رنگ و بوست،
عبدہٗ با ابتدا ، بے انتہا ست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست

عبدہٗ جز سرِّ اِلا اللہ نیست
لا اِلٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ
فاش تر خواہی ، بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ مارَمَیت!

(اُس کے سامنے زمین نے اپنا ماتھا رگڑا ہے، اس نے اپنے آپ کو عبدہٗ فرمایا ہے۔ عبدہٗ تیرے فہم سے بالاتر ہے اس لیے کہ وہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی۔ اس کا جوہر نہ عربی ہے نہ عجمی— وہ آدمی بھی ہے، اور آدم سے پیش تر بھی، عبدہٗ تقدیر کی صورت بناتا ہے، اس کے دائرۂ فیضان میں ویرانے بھی تعمیر میں بدل جاتے ہیں۔ عبدہٗ جاں فزا بھی ہے، اور جانستاں (جان لینے والا) بھی، وہ شیشہ بھی ہے، اور سنگِ گراں بھی۔ 'عبد' اور چیز ہے، اور عبدہٗ اور چیز۔ ہم اس کے لیے سراپا اِنتظار ہیں، اور وہ منتظر ہے (یعنی جس کا اِنتظار کیا جارہا ہے) عبدہٗ دہر ہے اور دہر عبدہٗ سے ہے۔ ہم سراپا رنگ ہیں اور وہ بے رنگ و بُو ہے۔ عبدہٗ کی اِبتدا تو ہے، لیکن اس کی کوئی اِنتہا نہیں ہے۔ عبدہٗ کے صبح و شام، ہمارے صبح وشام سے بہت مختلف ہیں۔ عبدہٗ کے راز سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہے۔ عبدہٗ الا اللہ کے بھید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لا الٰہ اگر تلوار ہے تو عبدہٗ اس کی دھار ہے۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ کھلی ہوئی بات چاہتا ہے تو کہہ: وہی عبدہٗ ہے، عبدہٗ کائنات کا کیف وکم ہے۔ عبدہٗ کائنات کا رازِ دروں ہے۔ اس کے باوجود ان چند شعروں سے مفہوم واقعی ظاہر نہیں ہوسکتا جب تک کہ ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رما (اے نبی ﷺ! آپ نے نہیں ماریں وہ کنکریاں جب کہ ماریں تھیں، بلکہ اللہ نے ماری تھیں) کا مقام تری نظر میں نہ ہو۔)

اس جواب کو سن کر اقبال نے ذوقِ دیدار کے تقاضوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حلّاج کہتا ہے:

معنیِ دیدارِ آں آخر زماں
حکم او بر خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولِ ﷺ انس و جاں
تاچو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را بیں ، ہمیں دیدارِ اوست
سنتِ او سرّے از اسرارِ اوست

(اُس نبیِ آخر الزماں ﷺ کے دیدار سے مراد یہ ہے کہ تو اس کے حکم کو اپنی ذات پر نافذ کردے، تو دنیا میں اُس رسولِ ﷺ انس وجاں کی طرح زندگی بسر کر، تاکہ اُسی کی طرح توانس و جاں میں مقبول ہوجائے (جب تو اس کے احکامات کو اپنے اُوپر نافذ کرچکے) تو پھر اپنے آپ کو دیکھ، یہی اس کا دیدار ہوگا، اس لیے کہ اس کی سنّت بھی اس کے اسرار میں سے ایک سِرّ [بھید] ہے۔)

آنحضرت ﷺ نے اپنی رحمت ورافت، اپنے مکارمِ اخلاق اور اپنے اُسوۂ حسنہ سے عالمِ انسانیت کو کیا کچھ عطا کیا، اس کی ایک جھلک اقبال نے ہمیں ''رموزِ بےخودی'' کے ایک باب میں دِکھائی ہے، اس باب کا عنوان ہے: ''درمعنی ایں کہ مقصودِ رسالت محمدیہ ﷺ تشکیل وتاسیسِ حُریت و مساوات واخوت بنِی نوعِ آدم است۔''

اس باب کی تمہید میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان، اِنسان پرست تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ غلام و زیر دست تھا، قیصر وکسریٰ کی سطوت اس کے لیے (سفرِ حیات میں) رہزن تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں غلامی کے حلقے تھے، کاہن، پادری، سلطان، بادشاہ یہ سب اس کے شکاری تھے اور وہ تنہا شکار تھا۔ بادشاہ بھی، اور کلیسا کا بوڑھا پادری بھی، اس کی کھیتی کے لیے خراج کے حکم نامے لکھتے تھے۔ اس ضعیف شکار کے لیے کلیسا کا جنت فروش اسقف جال بُنتا تھا۔ برہمن اس کے باغ سے پھول لے جاتے تھے۔ اور مُغ زادہ اس کے خرمن کو آگ لگاتا تھا۔ غلامی سے اس کی فطرت پست ہو چکی تھی اور اس کی (فطرت کی) بانسری میں بےشمار نغمے خون ہوچکے تھے۔

تا امینے حق بہ حق داراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد
کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبارِ کاربنداں را فزود
خواجگی از کارفرمایاں ربود
قوتِ اُو ہر کہن پیکر شکست
نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر دمِ آدم دمید
بندہ را باز از خداونداں خرید
زادنِ اُو مرگِ دنیاے کہن
مرگِ آتش خانہ و دیر و شمن
حریت زاد از ضمیرِ پاکِ اُو
ایں مَے نوشیں چکید از تاکِ اُو
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است
چشم در آغوشِ اُو وا کردہ است
نقشِ نَو بر صفحۂ ہستی کشید
اَمتے گیتی کشاے آفرید
اُمتے از ماسوا بیگانۂ
بر چراغِ مصطفیٰ پروانۂ
اُمتے از گرمیِ حق سینہ تاب
ذرّہ اش شمعِ حریمِ آفتاب

(تب ایسا ہوا کہ ایک امین (ﷺ) نے حق داروں کو ان کا حق دے دیا، یعنی

غلاموں کو خاقانوں (بادشاہوں) کی مسند عطا کردی۔ اُس ﷺ نے ٹھنڈی راکھ سے شعلے اُٹھا دیے اور پہاڑ کاٹنے والے کو پرویز کا رُتبہ عطا کردیا۔ اس نے کام کرنے والوں کی عزت کو بڑھایا اور کارفرماؤں سے سرداری چھین لی۔ اُس ﷺ کی قوت نے ہر پرانے پیکر کو توڑ دیا، اُس ﷺ نے آدمیت کے گرد ایک تازہ حصار قائم کیا۔ اس نے آدم کے پیکرِ خاکی میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور غلاموں کو اُن کے آقاؤں سے دوبارہ خرید لیا۔ اس کا ظہور دراصل پرانی دنیا کی موت تھی، یعنی آتش کدوں اور بُت کدوں کی موت، آزادی (کا تصور) اُس ﷺ کے ضمیرِ پاک سے پیدا ہوا۔ یہ حیات بخش شراب اُسی کے ہاں سے ٹپکی۔ عہدِ حاضر جو ہزاروں چراغ روشن کرلایا ہے، اس عہدِ نو نے بھی اُس ﷺ کے آغوشِ رحمت وحکمت میں پرورش پائی ہے۔ اُس ﷺ نے زندگی کے ورق پر ایک بالکل نئی تصویر کھینچ دی، اور ایک ایسی اُمت پیدا کی جو زمین کی فاتح تھی، ایسی اُمت جو ماسوی اللہ سے بیگانہ تھی، اور چراغِ مصطفیٰ ﷺ کی پروانہ تھی۔ اس اُمت کا سینہ حق کی گرمی سے گرم تھا۔ اس کے ذرّے کو بھی آفتاب کے گھر میں چراغ کی حیثیت حاصل تھی۔)

مختصر یہ کہ عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ اقبال کے رگ وپے میں، اور اُن کی ساری زندگی کے تاروپود میں جاری تھا اور جاری وساری رہا۔ ''جاوید نامہ'' کی تکمیل کے بعد ۱۹۳۶ء میں انھوں نے جو دو فارسی مثنویاں لکھیں (''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' اور ''مسافر'') وہ بھی اس جذبے اور مسلسل فکری رَو کی گونج سے خالی نہیں۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کے اِختتام پر انھوں نے اپنی نظم ''جوابِ شکوہ'' اور مسدسِ حالی کے انداز میں مسلمانوں کی حالتِ زار پر آنسو بہائے ہیں، اور حضورِ رسالت مآب ﷺ میں اس صورتِ حال پر فریاد کی ہے۔ نظم کے اس حصے کا نام ہے۔ ''در حضورِ رسالت مآب ﷺ''۔ اس پر ایک نوٹ بھی دِیا ہے جس کا مفہوم ہے کہ ۳؍اپریل ۱۹۳۶ء کو میں دارالاقبال بھوپال میں تھا، سیّد احمد خاں کو خواب میں دیکھا، اُنھوں نے فرمایا کہ اپنی بیماری کے بارے میں حضورِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کرو۔ نظم کا یہ حصہ گویا خواب میں سرسیّد احمد خاں کے ایما کی تعمیل میں حضورِ رسالت مآب ﷺ میں ایک عرض داشت، بلکہ فریاد کی حیثیت رکھتا

ہے، لیکن اس نظم میں بھی اقبال نے اپنی بیماری کے احوال کے بیان اور آرزوے شفا پر اُمتِ مسلمہ کے احوالِ زبوں کے بیان کو مقدم رکھا ہے تاہم یہاں ہم صرف وہی اشعار نقل کرتے ہیں جنھیں نعت یا مدحت کہا جاسکتا ہے:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را
درجہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح ، تو بانگِ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خدا ہا ساختیم از گاؤخر
بے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودِ پیش معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست
ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور
اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو
گردِ تو گردَد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

اے پناہِ من حریمِ کوے تو
من بہ اُمیدی رمیدم سوے تو

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہرِ مادر است
با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز
اے وجودِ تو جہانِ نوبہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار
تا ز غیر اللہ ندارم ، ہیچ اُمید
یا مرا شمشیر گرداں یا کلید
گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است
چیزِ کے دارم کہ نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں
کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں
اے کہ وادی گُرد را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب

(اے وہ ہستی کہ ہم بے چاروں کے چارہ ساز اور متاعِ حیات ہیں۔ اس قوم کو خوفِ مرگ سے نجات عطا فرمایئے۔ آپ نے پرانے بتوں یعنی لات ومنات کو جلا دیا اور پرانی دنیا کو نیا بنا دیا۔ جنوں اور انسانوں کے ذکر وفکر کی دنیا میں آپ ہی صبح کی نماز ہیں اور آپ ہی اذان کی آواز ہیں۔ لا الٰہ ہی سے سوز و سرور کی ساری لذتیں ہیں،غم کی رات میں لا الٰہ ہی سے روشنی پھوٹتی ہے۔ ہم نے (آپ کی تعلیمات کی بہ دولت) نہ تو گاؤ، خر (جانوروں) کو اپنا خدا بنایا، نہ ہی کاہنوں اور جادوگروں کے آگے سر جھکایا۔ نہ ہم نے

پرانے بتوں کے آگے سجدے کیے۔ نہ سلطان و امیر کی کوشک کے گرد طواف کیا، لیکن یہ سب کچھ آپ ہی کے لطفِ بے پایاں سے ہے، ہماری سوچ آپ ہی کی پروردۂ احساں ہے۔ آپ کا ذکر، ذوق و سرور کا سرمایہ ہے جو آپ کی اُمت کے افراد کو فقر میں بھی غیور رکھتا ہے۔ اے وہ ہستی کہ آپ ہر راہرو کی منزل بھی ہیں اور مقام بھی، ہر مسافر کے دِل میں آپ ہی کی کشش ہے۔ حریمِ کائنات آپ کے گرد طواف کرتا ہے۔ میں آپ سے صرف ایک نگاہِ التفات کا خواہاں ہوں۔ آپ کا کوچہ میری پناہ گاہ ہے، میں اُمیدِکرم سے آپ کی طرف دوڑ کر آیا ہوں۔ گنہ گاروں کے لیے آپ کی محبت کچھ زیادہ ہی ہے، خطائیں معاف کرنے میں آپ کی محبت ماں کی محبت سے بھی افزوں ہے۔ میں دراصل رات (اندھیرے) کے پرستاروں (یعنی مغرب اور مغرب پرستوں) سے جنگ کر رہا ہوں، اس لیے میرے چراغ میں تھوڑا سا تیل اور ڈال دیجیے، چوں کہ میں اللہ کے سوا کسی اور سے کوئی اُمید نہیں رکھتا، اس لیے یا مجھے تلوار بنا دیجیے یا کلید۔ اگرچہ میری عمر کی کھیتی بے حاصل رہی ہے، لیکن میرے پاس ایک چھوٹی سی چیز ہے جسے دِل کہتے ہیں، اسے میں نے دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے، اس لیے کہ اس پر آپ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ہے، اے وہ ہستی کہ آپ نے کُردوں کو بھی عربوں کا سا سوز عطا کر دیا ہے، مجھے بھی اپنے حضور میں طلب فرمائیے۔)

ان تمام مسلمان مفکرین کی طرح جو مختلف ادوار میں احیا و تجدیدِ روحِ اسلامی میں کوشاں رہے، اقبال کی بھی یہی کوشش رہی کہ انسانیتِ کبریٰ کے اس نصب العین کو جو رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی میں مجسم ہوا، ایک دفعہ پھر مسلمانوں کے سامنے بالخصوص اور عالمِ انسانیت کے سامنے بالعموم پیش کریں۔ ان کی تمام فلسفیانہ، متصوفانہ اور مصلحانہ کاوشوں کا جوہرِ اصلی یہی ہے کہ صاحبِ قرآن کی عطا کردہ بصیرتوں کو عام کریں اور عصرِ حاضر کے انسان کو اس کی اصلی منزل سے روشناس کرائیں۔ اقبال کی انفرادیت اس میں نہیں کہ انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ کی مدح کی، اُن کی انفرادیت اس میں ہے کہ انھوں نے مقامِ رسالت اور ہدایتِ نبوت کو جدید علوم کی روشنی میں نفسیاتی اور فلسفیانہ توجیہات کے ساتھ عصرِ نو کے درماندہ ذہن اور شکستہ و حیران دِل کے سامنے پیش کیا۔ اقبال نے اپنے کلام میں باختلافِ سیاق

رسولِ اکرم ﷺ کو جن ناموں سے یاد کیا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

لوح، قلم، الکتاب، آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب، جوہرے اندر وجود، مطافِ حریمِ کائنات، عبدہٗ، مقام و منزلِ ہر راہرو، صلوٰتِ صبح و بانگِ اذاں، نوبہارِ کائنات، حاملِ خلقِ عظیم، صاحبِ لولاک، سرِ الّا اللہ، چند و چگونِ کائنات، رازِ درونِ کائنات، شہسوار، نور، محیط، بصیر، بحر، آفتاب، عشق، رحمۃ للعالمین، ختم النّبیین (ﷺ)۔

اقبال نے اپنے آخری لمحات میں جو قطعہ اپنے قریبی احباب کو سنایا، اس میں بھی حجاز کا لفظ موجود ہے، جو اُن کے عشقِ رسول ﷺ کی گواہی دے رہا ہے۔ وہ قطعہ جو شہرۂ آفاق ہو چکا ہے، اس عظیم شاعر اور محبِّ رسول ﷺ کا آخری منظوم کلام ہے، اس لیے بار بار پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(وہ نغمہ جو بکھر چکا، واپس آئے گا یا نہیں؟ سرزمینِ حجاز کی خنک اور مُشک بار ہوا پھر اِدھر آئے گی یا نہیں، اس فقیر کا زمانۂ عمر تو ختم ہو چکا، کوئی اور دانائے راز آئے گا یا نہیں؟)

وہ سفر جو مدینے کے کبوتر کی یاد، فریادِ اُمت اور دوسرے نعتیہ اشعار سے شروع ہوا تھا، اس قطعہ پر ختم ہوا، نواب مرزا داغ نے کہا تھا:

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو آدمی کا

یہاں آغاز و انجام دونوں سعید و مسعود رہے، ایک زندگی جو از ابتدا تا انتہا—— اُمتِ مسلمہ کے غم میں محزوں اور اس کی اصلاح و ترقی کی کاوشوں میں صَرف ہوئی اور جس کے مضمون ہی نہیں متون وجداول پر بھی عشقِ محمد (ﷺ) کا رنگ غالب و نقش آفریں رہا، اس کے سعید اور مبارک ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ بہ حوالہ بشریٰ، عنایت رسول چڑیا کوٹی، ص ۱۹، ۲۰، ۲۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶، ۱۰۷۔

۴۔ تاج۔

۵۔ علامہ قاضی سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، جلد ا، ص ۴۱ (بحوالہ ابو الفداء، ص ۱۱۰)۔

۶۔ الملل والنحل لشہر ستانی (م ۵۴۸ھ)۔

۷۔ ''اقبال نامہ''، مقالہ از مولانا عبد المجید سالک۔

۸۔ ''ملفوظاتِ اقبال''۔

۹۔ یہی وہ خیال ہے جس کی تشریح اقبال نے کئی سال بعد اپنے خطبات میں جا بہ جا علمی بنیادوں پر کی، اور جو اسلام کے علمی منہاج کے بارے میں عصرِ حاضر کے علمی انکشافات کی بنیاد بن گیا۔

۱۰۔ ''اخبارِ وطن''، لاہور۔ جلد ۵، نمبر ۳۹، ۷/اکتوبر ۱۹۰۵ء۔

۱۱۔ عربی شعر و ادب میں نعت کے میدان میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کے بعد جس شاعر کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت ملی وہ حضرت امام محمد بن سعید بوصیری ہیں جو عام طور پر امام بوصیری کے نام سے جانے جاتے ہیں، یکم شوال ۶۰۸ھ مطابق ۷ مارچ ۱۲۱۳ء کو مصر کے ایک قصبے ولاص میں پیدا ہوئے، سلسلۂ نسب مشہور بربر قبیلہ صنہاجہ تک پہنچتا ہے۔ کنیت ابو عبداللہ، خاندان کی نسبت سے صنہاجی، مقامِ ولادت کی نسبت سے ولاصی اور مقامِ سکونت کے حوالے سے بوصیری کہلاتے ہیں، تمام آئمۂ فن نے ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے، اس عہد کے بزرگ اور نام ور مصری صوفی حضرت ابو العباس احمد المرسی (م ۶۸۶ھ) کے مرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کلام میں جو سوز و گداز ہے وہ حضرت المرسی کا فیضانِ نظر ہے۔ اُنھیں حضرت حسّان رضی اللہ عنہ بن ثابت کے بعد عربی زبان کا سب سے بڑا نعت گو تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۳۔ کعب بن زہیر: زمانۂ جاہلیت کے ایک نام ور اور بلند پایہ شاعر زہیر بن ابی سُلمیٰ مُزنی کے بیٹے تھے۔ زہیر اس پائے کا شاعر تھا کہ اس کا ایک قصیدہ سبع معلقات میں شامل ہے، کعب رضی اللہ عنہ نے ایک بار اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کہی، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا خون روا قرار دے دیا، اور لوگ اُن کے قتل کے درپے رہنے لگے۔ ان کے بھائی بجیر رضی اللہ عنہ نے جو مسلمان ہو گئے تھے، انھیں توبہ کی تلقین کی، لیکن یہ نہ مانے، آخر تمام دوستوں کی حمایت سے مایوس ہو کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے توسط سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مشہور، قصیدۂ لامیہ جو بَانَت سُعاد کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے، پیش کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف انھیں معاف کر دیا، بلکہ اپنی

چادر بھی عطا فرمائی۔ اس 'لامیہ' کا مطلع، جو عاشقانہ تشبیب کا آغاز ہے، یہ ہے:

بانَت سعاد و قلبی الیوم متبول

متیتم ءِ شرھا لم یُغدَ مکبول

(سعاد (محبوبہ کا نام) جدا ہوگئی ہے، اس صدمے سے آج میرا دل محزوں ہے، اس کی محبت میں میرا دل اس قیدی کی طرح ہے جس کا کسی نے فدیہ ادا نہ کیا ہو اور وہ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہو۔)

یہ قصیدہ ہر دور میں معروف اور متداول رہا ہے، کئی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے ہیں اور کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ یورپ کی کئی زبانوں میں بھی اس کے تراجم اور شرحیں موجود ہیں۔ اس قصیدۂ نعت کے صلے میں کعب رضی اللہ عنہ کو دربارِ رسالت مآب سے جو چادر عطا ہوئی وہ اُن کے خاندان میں رہی۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم کے عوض اسے خرید لیا، پھر یہ چادر عہد بہ عہد اُموی اور عباسی خلفا کے پاس رہی یہاں تک کہ خلفاے عثمانی کی ملکیت میں آئی۔ زہیر بن ابی سُلمیٰ (کعب رضی اللہ عنہ کا والد) جاہلی شعرا میں اِتنا ممتاز تھا کہ بعض لوگ اسے امراء القیس سے بھی بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار زہیر کے ایک ممدوح کے ایک لڑکے سے کہا تھا، "اپنے باپ کی تعریف میں زہیر کے کچھ اشعار سناؤ۔" اشعار سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، "تم نے اسے جو کچھ دیا تھا وہ تو ختم ہو چکا، اس نے جو کچھ تم کو دیا وہ ابھی باقی ہے۔" زہیر دولت مند ہونے کے باوجود بے حد خوش اخلاق، نرم خو، متحمل مزاج، صائب الرّائے، پاک باز، صلح پسند تھا اور خداوندِ قدوس اور روزِ جزا پر مکمل طور پر ایمان رکھتا تھا۔ زہیر کا باپ، وہ خود، اس کی دونوں بہنیں سلمیٰ اور خنسا اور دونوں لڑکے کعب رضی اللہ عنہ اور بجیر رضی اللہ عنہ سب عرب کے قابلِ ذکر شعرا تھے۔

۱۴۔ "کلیاتِ بیدل"، جلد سوم۔ مطبوعہ، پوہنی وزارت، کابل، ۱۳۴۲

۱۵۔ اِن اصطلاحات ومباحث کے سلسلے میں شیخِ اکبر کی تصنیفات (مثلاً فتوحاتِ مکیہ وفصوص الحکم) کے علاوہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات، مولانا محمد قاسم نانا توی کی تصنیفات (بالخصوص آبِ حیات) سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ نیز اس سلسلے میں شیخ تاج الدین محمود کی کتاب غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان و المکان اور عین القضاۃ ہمدانی کی کتاب غایۃ الامکان فی دایۃ المکان کا مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

15.Universal Time

16.Temporal Time

17.Aboslute Time

18.Subjective.

ڈاکٹر تحسین فراقی

اقبال اور ثنائے خواجہ ﷺ

اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق و شوق اس وقت پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں؟ بس یہی دل چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھیں منور کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو، تُو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے ردّ کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا، لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کر باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی، مگر آہ! اے پاک سرزمین تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے نورظہور کیا تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کردے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس

نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذرّوں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میرے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہوکر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال رضی اللہ عنہ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

لیکن ذرا ٹھہریے! میں تو اقبال کی نعت پر کچھ کہنے چلا تھا، مگر خیر، اقبال کے ۱۹۰۵ء کے مندرجہ بالا خط کا یہ اقتباس بھی ہمیں بہت کچھ بتاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۸ء تک یعنی موے سیاہ سے بیاضِ سفید تک، یعنی بھرپور جوانی سے رنجور بڑھاپے تک سپردگی ہی سپردگی، شیفتگی ہی شیفتگی، گداز ہی گداز— کیوں نہ مندرجہ بالا اقتباس کو نثری نعت کہا جائے۔ آیئے ذرا نعت اور اقبال کی نعت پر تفصیلی گفتگو کریں۔

علامہ اقبال کے اردو فارسی کلام اور اس کے علاوہ ان کی تقاریر، خطبات اور ارشادات کا محور و مرکز اسلام ہے۔ اگرچہ ان کے فکر کے تار و پود میں فلسفۂ مغرب اور حکمتِ ''مغربیانِ حق شناس'' کے بھی گہرے چھینٹے مل جاتے ہیں، لیکن ان کے کلام کی روح و رواں حضورِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور ان کی انقلاب انگیز حیاتِ مطہرہ ہے۔ شاید حضور ﷺ سے اس محبت اور والہانہ شیفتگی ہی کا فیضان ہے کہ اقبال کی نعت کا جواب عربی، فارسی اور خود اردو میں قریب قریب ناپید ہے۔ فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں:

عشقِ رسول ڈاکٹر اقبال کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے ذہن وفکر پر چھا گیا تھا۔ وہ کتنے بڑے فلسفی تھے اور فلسفے کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو وہ عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ ایمان

بالغیب کے قائل تھے۔ پس جو حضور ﷺ نے فرمادیا، وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چون و چرا کی گنجائش نہیں سمعنا واطعنا یہی ایمان کی دلیل، بلکہ بنیاد ہے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی شاعری کا خلاصہ، جوہر اور لبِ لباب عشقِ رسول اور اطاعتِ رسول ہے۔ ☆[۱]

اس سے قبل کہ علامہ کی نعت گوئی کے محاسن کا ذکر کیا جائے اور ان سے پہلے کے نعت گو شعرا کے نعتیہ خصائص کا اجمالاً جائزہ لیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی فکر پر مترتب ہونے والے ان ابتدائی اثرات کا ذکر کیا جائے جو علامہ کی آئندہ تخلیقات کے لیے اساس کا درجہ رکھتے ہیں اور جن کے باعث اقبال اتنی توانا، پُرسوز اور نہایت منفرد نعت کہنے پر قادر ہوئے۔ بہ الفاظِ دیگر ان زمانی و مکانی ابعاد کا ذکر کیا جائے جو اقبال کی منفرد نعت گوئی کا پس منظر مہیا کرتے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ جب تک حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکت سے والہانہ شیفتگی اور شدید جذباتی وابستگی نہ پائی جاتی ہو، کامیاب نعت کہنا ناممکن ہے اور ظاہر ہے کہ کامیاب نعت وہی ہے جس سے حضور ﷺ کی متحرک حیاتِ طیبہ اپنی تمام آب و تاب اور اپنے تمام محاسنِ جمیلہ کے ساتھ جلوہ گر ہوکر دامنِ دل کھینچنے لگے۔ اب اگر پوچھا جائے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی سیرتِ صادقہ کا منبع و ماخذ کیا ہے تو بلاتأمل قرآنِ حکیم کا نام لیا جاسکتا ہے جو ان کے اسوۂ حسنہ پر دلیلِ ثابتہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی چال ڈھال، ان کا سفر و حضر، ان کا خورد و نوش، ان کی استراحت و بیداری، ان کی قیل و قال اور ان کی گفتار و کردار سبھی قرآنِ حکیم کے مبینہ اسلوبِ حیات کے عین مطابق تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علامہ کے ذہن پر کس نوعیت کے ابتدائی مؤثرات کارفرما رہے اور کس طرح ان کی Archeopsyche کا حصہ بن گئے۔ اس کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس کا ذکر سیّد سلیمان ندوی نے

سفرِ افغانستان سے واپسی پر کیا:

> سفرِ کابل سے واپسی میں قندھار کا ریگستانی میدان طے ہو چکا تھا اور سندھ و بلوچستان کے پہاڑوں پر ہماری موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ شام کا وقت ہم دونوں (اقبال اور سیّد سلیمان ندوی) ایک ہی موٹر میں بیٹھے تھے، روحانیت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اربابِ دل کا تذکرہ تھا کہ موصوف نے بڑے تأثر کے ساتھ اپنی زندگی کے دو واقعات بیان کیے۔ میرے خیال میں یہ دونوں واقعے ان کی زندگی کے سارے کارناموں کے اصل بنیاد تھے۔

اس کے بعد سیّد صاحب نے دونوں واقعات بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو بہت مشہور اور کثیر الحوالہ واقعہ ہے جس میں اقبال کے والد نور محمد درویش بیٹے کو تلاوتِ قرآنِ پاک کی روح سے متعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اُترا ہے۔''

دوسرا واقعہ اگرچہ اتنا عام تو نہیں، لیکن تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''باپ نے ایک دن بیٹے سے کہا کہ میں نے تمھارے پڑھانے پر جو محنت کی ہے تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔'' لائق بیٹے نے بڑے شوق سے پوچھا کہ ''وہ کیا ہے؟'' باپ نے کہا، ''کسی موقعے پر بتاؤں گا۔'' چناں چہ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ ''میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔''

بات ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر اقبال کہتے تھے کہ اس کے بعد میں نے لاہور میں کام شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ میری شاعری کا چرچا پھیلا اور نوجوانوں نے اس کو اسلام کا ترانہ بنایا۔ لوگوں نے نظموں کو ذوق شوق سے پڑھا اور سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا۔ انھی دنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ ''والدِ بزرگوار! آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں۔''

باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ ''جانِ من! تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔''[۲☆]

علامہ نے اسلام کی خدمت کا عہد کس طرح پورا کیا، اس کی تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اقبال نے عہدِ حاضر کے تمام فکری، تہذیبی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل حضورِ اکرم ﷺ کی ہمہ گیر اور ہمہ جہات تعلیمات میں ڈھونڈا۔ انھوں نے حضور ﷺ کی سیرتِ صادقہ کے اتنے خوب صورت، پُرکشش اور حیات آفریں مرقعے کھینچے کہ نعت گوئی کا حق ادا کر دیا، گو یہ نعت گوئی بالواسطہ ہی سہی۔ بالواسطہ نعت گوئی سے میری مراد یہ ہے کہ اقبال کی اکثر و بیش تر نعتیں (صرف چند مستثنیات کو چھوڑ کر) کسی اہم تہذیبی و تاریخی بحران یا عصری مسئلے کے صائب حل کے سلسلے میں ایک رہنما کی حیثیت سے کبھی کسی نظم کی ابتدا، کبھی درمیان اور کبھی آخر میں آئی ہیں اور میرا خیال ہے کہ براہِ راست نعت گوئی (جس کا ایک مقصود حصولِ ثواب رہا ہے) اقبال کی افتادِ طبع کے پیشِ نظر کچھ جچتی بھی نہیں تھی۔ یہاں مجھے رشید احمد صدیقی کے چند جملے یاد آ رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> اقبال سے پہلے اردو میں حمد و نعت، معراج و معجزہ، مرثیہ و مناجات کی روایتی یا دین دارانہ شاعری ہوتی تھی جس کا مقصد زیادہ تر ثواب حاصل کرنا ہوتا۔ محسن کاکوروی کی چراغِ کعبہ اور انیس کے مراثی میں یہ انداز نمایاں طور پر ملتا ہے جسے لکھنؤ اور لکھنویت نے مخصوص شان اور سطح دے دی تھی۔ اقبال نے بھی ان موضوعات کو اپنایا، لیکن ان کا مقصد اور محور بدل دیا۔ اس لیے کہ وہ ملت کو مذلت سے نکال کر آزمائش و آرزومندی کے راستے پر لانا چاہتے تھے۔[۳☆]
>
> ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے عنوانات میں سب سے زیادہ پُرجوش، پُرسوز اور پُردرد عنوان نعتیہ شاعری کا ہے۔ سچ پوچھیے تو نعتیہ شاعری، ڈاکٹر صاحب کی پوری شاعری کا خلاصہ ہے۔[۴☆]

میرا خیال ہے کہ اگر علامہ کے منضبط فکری نظام کا کھوج لگانا مقصود ہو تو وہ علامہ

کی نعتوں میں نہایت خوب صورت اورفن کارانہ انداز میں شامل دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ علامہ نے ان نعتوں میں حضورِ اکرم ﷺ کی بشر دوستی، انسان نوازی، حلم و عدل، بردباری وشکیبائی، رحمت وشفقت اور دانش وبینش کوتہذیبی پیش رفت کے لیے معاون اور رہنما سنگ ہائے میل کے طور پر پیش کیا ہے۔ حضور ﷺ کے ان اوصافِ حمیدہ کو دیکھ کر ان سے قلبی وابستگی پیدا ہونا فطری عمل ہے اور یہی نعت گوئی کا اصل مقصود ہونا چاہیے۔ ممتازحسن نے منتخب نعتوں کے ایک مجموعے کے پیش لفظ میں اسی بصیرت افروز حقیقت کو یوں اُجاگر کیا ہے:

> میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تأثر ہمیں رحمۃ للعالمین ﷺ کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے جس میں حضور ﷺ کی مدح ہو یا حضور ﷺ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے۔ جس میں رسالت مآب ﷺ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو، بلکہ حضور ﷺ سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی، رباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر ومنزلت کا دار و مدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت ﷺ کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دوجہاں ﷺ کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے، اسے نمایاں کرنا ہوتو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔[۵]☆

اگر نعت کی صرف ادبی اورلسانی حیثیت ہی پیشِ نگاہ ہوتو عربی، فارسی اور اردو میں کثیر مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر نعت تو نام ہے ایک مکمل ضابطۂ حیات کے وضع و نفاذ کی پُرخلوص پیش کش کا۔ ادبی اورلسانی عظمت ہی اگر نعت کے طرۂ امتیاز ہیں تو پھر عربی زبان

کے جدید شاعر احمد شوقی کا نام لیا جاسکتا ہے جس کا ''میمیہ'' اس پہلو کا کامیاب عکاس ہے۔ مگر یہ نعتیہ قصیدہ سوزِ محبت اور سپردگی سے یکسر خالی ہے اور اس میں آورد ہی آورد ہے۔ اردو میں مومن کے نعتیہ قصیدے ''چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس'' میں بھی مقصد تاثیر نہیں نمائش ہے۔

فارسی اور اردو میں زیادہ تر نعتیں حضور ﷺ کے مردانہ حسن و جمال اور ظاہری خدوخال کے گوشوارے معلوم ہوتی ہیں۔ پھر ان نعتوں میں ایک اور کمی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی شان میں یا تو غلو برتا گیا ہے یا پھر ان کی حیات آفریں اور عمل انگیز شخصیت کے علی الرغم انفعالی احساسات و اظہاریت ہی کو نعت کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے۔ عبدالسلام ندوی نے نعت گوئی کے ذیل میں صرف قرآنِ حکیم کو معیار اور نورِ ہدایت قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک گو حضورِ اکرم ﷺ رجولیتِ کاملہ کے بہترین مظہر تھے، لیکن اس کے باوصف قرآنِ مجید میں صرف آپ کے روحانی اور اخلاقی فضائل ہی مذکور ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک نعت گوئی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملے میں قرآنِ مجید کا اتباع کیا جائے۔ عبدالسلام ندوی کے انھی خیالات کی خوب صورت بازگشت ہمیں ممتاز حسن کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے:

> صفاتِ رسالت محض پیکرِ نبوی کے حسن و جمال کا نام نہیں۔ یہ نام ہے اُس خُلقِ عظیم کا جو ساری نوعِ انسانی کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم مقصدِ بعثت سے اس وقت تک واقف ہی نہیں ہوسکتے جب تک ہم پر حضور خیر البشر ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو منکشف نہ ہوں۔ جناب رسالت مآب کی زندگی سارے انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اگر حضور ﷺ کی زندگی چند مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہوتی اور اس میں عام انسانوں کے رنج و راحت، مسرت و غم، مصیبت اور کامرانی یہ سب موجود نہ ہوتے تو ہم بہ حیثیت انسان اس زندگی سے کوئی سبق نہ سیکھ سکتے۔[۶]

ابھی ادھر میں نے فارسی اور اردو نعت گوئی کے غالب عناصر کے طور پر حضور ﷺ

کے مردانہ حسن و جمال کا ذکر کیا ہے یا پھر نعت گوئی میں شاعرانہ غلو یا سوے ادب کا اجمالی تذکرہ۔ آیئے اب اس ضمن میں تھوڑی سی تفصیل جس سے میری معروضات کا اثبات ہو سکے گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فارسی اردو شعرا نے حضور ﷺ کو معشوق فرض کر رکھا ہے اور اپنی حیثیت ایک عاشق کی قرار دی ہے۔ ان کی نعتوں میں خارجی متعلقاتِ حسن، مثلاً روے وموے، طرہ، چشمِ نرگسیں، زلفِ عنبریں، ابرو، گیسو، زلف معقّد، سروِ رواں (قدِمحبوب) کا ذکر تواتر سے آتا ہے۔ ان کے اشعار میں شاعرانہ صنعت گری تو ہے، لیکن دل باختگی اور ربودگی معدوم، مثلاً جن چار شعرا کا ابھی ذکر ہوا ان کی بیش تر نعت گوئی حضور کی سراپا نگاری اور ان کے جسمانی محامد ومحاسن پر صرف ہوتی ہے۔

محسن کاکوروی نے اپنی نعت میں صنائع بدائع کا جس قدر خوب صورت التزام کیا ہے، وہ اپنی جگہ کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو، نعت کا اصل مقصد پسِ پردہ ہی رہتا ہے۔ انھوں نے حضور کی سراپا نگاری کے ضمن میں خوب مضمون آفرینی کی ہے، لیکن یہ مضمون آفرینی بھی ذہن نشین تو ہوتی ہے، دل نشیں نہیں ہوتی۔ انھوں نے حضور کی سراپا نگاری کے ضمن میں بینی، ہونٹ، دہن، دستِ مبارک اور پائے مقدس کے متعلق الگ الگ اشعار کہے ہیں جو شاعر کے بے پناہ تخیل کے آئینہ دار تو نظر آتے ہیں، لیکن بے پایاں تعشق کے نہیں جب کہ نعتیہ شاعری کمالِ فن کی نہیں کمالِ عشق کی متقاضی ہوتی ہے:

مخمس تیری پانچوں انگلیوں کا ایک خاکہ ہے
رباعی چار ابرو کا مقرر سادہ نقشہ ہے
جو رنگیں قطعہ ہے یاقوتِ لب کا ایک ٹکڑا ہے
تری زلفِ رسا کا شعر ایک ادنیٰ سا لٹکا ہے
کرشمہ ہے غزل تیری غزالِ چشمِ اسود کا

اور بیدم وارثی کا ایک شعر بھی ملاحظہ کریں:

بھینی بھینی خوش بو مہکی بیدمؔ دل کی دنیا لہکی
کھل گئے جب گیسوے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اردو فارسی شعرا کے یہاں استادانہ صنعت گری ہی کے نمونے نہیں ملتے، ان کی نعت

میں غلو اور کہیں کہیں سوے ادب کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ سب کچھ شعوری سطح پر ہوا، لیکن بہ قول ممتاز حسن سُکر اور جہاں کہیں بھی جائز سمجھا جائے دربارِ نبوی میں جائز نہیں ہے۔ عقیدت اور اس کا جوش و غلبہ اپنی جگہ، مگر نعتِ نبی ﷺ کے لیے نہایت حزم و احتیاط کی ضرورت ہے:

> حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں، اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو اُلوہیت میں پہنچ جاتا ہے، اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ اس کی نسبت حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں ایک جانب اصلاً کوئی حد نہیں، اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔[☆۶]

یہی وہ نازک مقام ہے جس کا متوازن ادراک عہدِ جہانگیر کے جوانا مرگ شاعر عرفی کو تھا۔ اس کے دو شعر نعت گوئی کا بڑا خوب صورت معیار بن چکے ہیں۔ خصوصاً دوسرے شعر میں تو عرفی نے نعت اور قصیدے کے اسلوب کی یگانگت اور مماثلت کو بھی قطعی نامناسب قرار دیا ہے۔ یہ انتباہ ان لوگوں کے لیے بھی قابلِ توجہ ہے جو نعت کو ''قصیدہ طور'' بنانے کے لیے شعوری طور پر بلند آہنگ الفاظ اور دیگر لفظی پینتروں کا سہارا لیتے ہیں۔ تو خیر عرفی کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت ایں نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سروون
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

اس نازک مقام کی خبر عزت بخاری کو بھی تھی، کما قال:

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنید و بایزید ایں جا

مگر اس کے باوجود یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ ثابت و سالم ہے کہ ہمارے بعض شعرا نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ محسن کاکوروی نے اسی غلو سے کام لے کر خالق اور مخلوق کی دوئی ہی کو مٹا ڈالا ہے:

کہاں اب جبہ سائی کیجیے کچھ بن نہیں پڑتا
احد کو کیجیے یا احمدِ بے میم کو سجدہ

اور سجدے کے ضمن میں یہ تذبذب اس شخصیت سے متعلق ہے جس نے دوٹوک فرما دیا تھا کہ لائقِ سجدہ صرف ذاتِ حق تعالیٰ ہے۔

اسی ''احمدِ بے میم'' کا ذکر خود اقبال نے بھی اپنے ابتدائی کلام میں فرمایا گو کہ بعد کو اسے سوے ادب کے پیشِ نظر رد کر دیا:

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

نیز:

پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا
بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

جگر جیسا محتاط شاعر بھی کبھی کبھی لغزیدہ پائی کا مرتکب ہو جاتا ہے:

اے آنکہ دردنِ پردۂ راز
از خویش بہ خویشتن رسیدہ

ابھی تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس سے قارئین کو نعت گوئی کے سلسلے میں ہونے والی بے اعتدالیوں کا کسی حد تک اندازہ ہو گیا ہوگا اور کامیاب نعت کے لوازم کا ادراک بھی، لیکن میری ان گزارشات سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اقبال سے پہلے کے فارسی یا اردو نعت گو شعرا کے یہاں وہی کچھ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ان شعرا کے ہاں معجزات و خوارق، حضور ﷺ کی سراپا نگاری اور توصیف کے ضمن میں غلو اور اغراق سے قطع نظر قابلِ اعتنا سرمایہ بھی موجود ہے۔

اقبال کے پیش رو نعت گو شعرا کے یہاں کہیں کہیں حضور ﷺ کی سیرت کا ذکر

بھی مل جاتا ہے، مگر اس کی نوعیت بہ قدرِ ملح فی الطعام کی سی ہے۔ ان شعرا میں لے دے کے ایک حالی رہ جاتے ہیں جنھوں نے شرح و بسط کے ساتھ سیرتِ طیبہ کو اپنے مسدس میں اُجاگر کیا۔ علاوہ ازیں مسدس کے آخر میں ''عرضِ حال'' کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے، اس میں انھوں نے بڑے درد اور کرب کے عالم میں ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا ذکر کر کے حضور ﷺ سے مدد طلب فرمائی ہے۔ اس نظم میں مسلمانوں کے عروجِ ماضی کی داستان بھی ہے، دینِ قیم سے ان کی والہانہ عقیدت کا بیان بھی ہے، عہدِ حاضر کے مسلمانوں کی زوال آمادہ ذہنیت کا نوحہ بھی ہے اور آخر میں حضور ﷺ کی چشمِ کرم سے بھیک بھی طلب کی ہے، مگر کس نیازمندی اور کس عجز و الحاح کے ساتھ۔ بے اختیار کچھ شعر جستہ جستہ نقل کرنے کو جی چاہتا ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حِکَم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے
جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لیے داروے شفا ہے
گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالحُ لی ہم نے سنا ہے
ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گِلہ ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ ، خطا ہے

قیاس چاہتا ہے اور قرائن بتاتے ہیں کہ اقبال کی نعت گوئی کے زندگی آموز اور زندگی افروز اُسلوب میں ''حالیِ گستاخ'' کے اندازِ مدحتِ رسول ﷺ کا بھی یقیناً حصہ ہے، گو اس کے تار و پود میں اس نے اپنی شخصیت کا فراواں روپ رس اور سوز و گداز بھی شامل کیا ہے۔

اقبال کی نعت میں اپنے پیش رووں کے تمام محاسن یک جا ہوگئے ہیں، لیکن اس پر ان کے معائب اور لغزشوں کا ہلکا سا بھی پر تو نہیں پڑا۔ حق یہ ہے کہ اقبال کا سا توازنِ فکر و نظر ہر کسی کو کم ہی ارزانی ہوتا ہے۔ اسی توازنِ فکر و فرہنگ نے ان کی نعت کو یک رُخا ہونے سے بچا لیا ہے اور ان کی نعت عشقِ رسول ﷺ کا معیار قرار پائی ہے۔ ایسی نعت جس کی نظیر عربی، فارسی اور اردو میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ اقبال کے معاصرین میں ظفر علی خاں ایک استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی بعض نعتیں جدید نعت گوئی کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

علامہ کی نعت میں کرب، سوز و گداز، سپردگی، ربودگی کی کیفیات اور ان کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی پیش رفت، بقا اور وزن و وقار کے سلسلے میں جو اسباق ملتے ہیں، انھیں ان کے پُر آشوب عہد کے منطقی نتیجے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ یوں تو تاریخِ اسلام میں کئی ایسے ادوار گزرے ہیں جنھوں نے ہماری ہیئتِ اجتماعیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مثلاً ہماری تاریخ کا ایک پُر آشوب دور سقوطِ بغداد سے متعلق ہے جس نے ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو شدید نقصان پہنچایا۔ اندلس کا سقوط اور اس پر فرنگی کا قبضہ بھی ہمارے لیے زبردست دھچکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی بھی ہمارے لیے خاصی اعصاب شکن ثابت ہوئی، لیکن میرا خیال ہے کہ بیس ویں صدی کے آغاز ہی سے دنیائے اسلام جس کرب آمیز اور عبرت انگیز ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوئی شاید اس کی نظیر پہلے کہیں نہ مل سکے۔ کہیں بلقانی ریاستوں کے جھگڑے شدت اختیار کر رہے ہیں اور سلطنتِ اسلامیہ کے حصے بخرے ہو رہے ہیں، کہیں خلافتِ اسلامیہ دم توڑ رہی ہے، کہیں مسلم ممالک پر فرنگ کے قدم جمتے جا رہے

ہیں، کہیں شام، حجاز اور عراق میں طوفان اُٹھ رہے ہیں تو کہیں طرابلس العرب اطالیہ کی زمینی بھوک کے خلاف صف آرا ہو کر لہولہو ہے اور کہیں ایران اور توران دردِ زہ کی کیفیات سے گزر رہے ہیں۔ غرض ایک قیامت کا سا سماں برپا تھا اور بہ قول منشی محمد دین فوق مسلمانانِ جدید کے لیے کربلاے جدید کا باب کھل چکا تھا۔ ان حالات میں اقبال نے وطنیت کے بت کو توڑ کر بین الملیت کا نعرہ بلند کیا اور حضورِ اکرم ﷺ کی وحدت آثار قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان کی حیات آفریں سیرتِ صادقہ کی تبلیغ شروع کی، لیکن یہ تبلیغ راست ابلاغ سے کوسوں دُور ہے، اس میں شعریت بھی ہے اور فن کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد انگریز کا تسلط براہِ راست تمام ہندوستان پر ہو گیا۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک پر بھی جان کنی کی کیفیت طاری تھی۔ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ فاتح قوم کی تہذیبی اقدار کو ہمیشہ مرعوبیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے اور غلامی میں قوموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں۔ مفتوحیت اور مغلوبیت کے احساس نے مسلمانوں کے ضمیر میں تصادمِ فکر اور تشکیک کی آگ بھڑکا دی۔ دراصل انیس ویں صدی کے آخر اور بیس ویں صدی کے آغاز کو فکری تصادمات کا دور کہنا چاہیے۔ انگریزی علوم کی نئی روشنی اور چکاچوند نے مسلمانوں کی آنکھیں چندھیا دیں۔ وہ نئے علوم وفنون کی تاب نہ لا سکے اور اپنی اقدار وعلوم کو ان نئی اقدار کے مقابلے میں خریطۂ کہنہ سمجھ کر ان سے متنفر ہونے لگے:

> ملک ہمارا عنقریب آفرینشِ جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں، نئے نئے فنون، سب کے حال نئے، دل کے خیال نئے، عمارتیں نئی، نئے نقشے، رستے نئے خاک ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل حیران، مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کی سواری شاہانہ چلی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے ویرانے جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ (محمد حسین آزاد)

یہ اقتباس انیس ویں صدی کے آخری اور بیس ویں صدی کے آغاز کے مسلمان کے اجتماعی ضمیر کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے۔ ستم یہ ہوا کہ ''تہذیب کی اس شاہانہ سواری'' کے سحر نے اس کے ذہن کو جامد کر کے اس سے تمیزِ خیر وشر کی قوت چھین لی اور اسے فکری بانجھ پن کا شکار بنا دیا۔ اس نے اپنے ''ویرانے'' پر اس بے دردی سے جھاڑو پھیر دی کہ وہ فکری طور پر بالکل کنگال ہوکر رہ گیا۔ وہ نئی تہذیب (تہذیبِ مغرب) کی ''پیشوائی'' کو اس شدت سے دوڑا کہ پتلون لنگوٹی ہوگئی۔ اب یقین کی جگہ بے یقینی اور ظن وتخمین نے لے لی۔ قوم کا اجتماعی مزاج موم کی ناک بن گیا۔ حوادث کا ہر ہلکا جھونکا اسے برگِ خزاں کی مانند آوارہ و مرکز گریز کرتا چلا گیا۔ مطلب یہ کہ اقتدار کا کھو دینا ہی مسلمان کے لیے کچھ کم باعثِ ذلت نہ تھا، اس پر طرہ یہ کہ اس کے یقین پر بھی شب خون مارا گیا اور اس کے دین کی بسیط حقیقت جان کنی کا شکار ہوکر رہ گئی۔ اب مرکزِ ترجیح بخاری تھا، قائد قرشی نہیں تھا۔ ''تبدیلیوں کے اعتبار سے یہ زمانہ بہت اہم ہے اور اگر کوئی تحریک اس کا مقابلہ کرسکتی ہے تو یورپ کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک ہے۔''☆۸

علامہ نے اس تمام تہذیبی فساد کا علاج حضور ﷺ کی اعلیٰ سیرت کی پیروی میں تلاش کیا۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ قرآنِ پاک ہی کی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی۔ علامہ کے نزدیک حضور ﷺ کی سیرت تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے اکمل و احسن نمونے کی حیثیت رکھتی ہے اور اسلام تمام عالم کے لیے رہنمائی اور سعادت کا اہل ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا رب، رب العالمین ہے اور اس کا رسول ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس وضاحت کے بعد اقبال پر فرقہ پرستی اور فسطائیت کا الزام بھی بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔ اقبال ہر سچے مسلمان کی طرح حضورِ اقدس ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات کو آیۂ رحمت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک حضور ﷺ کی گلی کا فقیرِ بے نوا، افسر و کلاہ کے حامل شہنشاہ سے افضل اور قوی تر ہے۔ کائنات کا تمام برگ و ساز ان کے عشق کا مرہونِ منّت ہے اور حیاتِ ملّی بھی انھی کے فیض کی محتاج۔ سینۂ کائنات کا یہی تو اک راز ہے جسے اسمِ محمد ﷺ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہی ذات ہی تو کائنات کا

مایۂ خمیر ہے، چند و چگونِ دہر ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ معجز صفات کا یہ کیا کم احسان ہے کہ انھوں نے ذات، رنگ، نسل اور قومیت کے لات و منات کو پاش پاش کر دیا اور ایک بے مثال مواخات کی طرح ڈالی۔ روحِ بولہب کو یہی غم تو کھائے جا رہا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے بے مثل بھائی چارے نے اس کی سیادت، بالادستی، افضلیت اور نسل پرستی پر کاری ضرب لگائی ہے:

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ اُو کعبہ را گل شد چراغ
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروے دُودمانے ریختند[۹]

حضورِ معظم ﷺ کی ہجرت میں راز پوشیدہ تھا کہ اسلام لاوطن ہے اور مومن کے لیے تمام دنیا سجدہ گاہ قرار دی گئی ہے۔ چناں چہ ملتِ اسلامیہ کی بھی یہی خصوصیت ہے کہ وہ ملک و نسب سے بالاتر ہے:

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم

در جہاں مثلِ مئے و میناستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت[۱۰]

اسلام نے معاشیات کو سماجیات سے الگ شعبے کے طور پر کبھی نہیں لیا، کیوں کہ معاشی ارتقا سماجی اور تہذیبی صحت مندی کا محتاج ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ اخلاقیات کا معاشی خوش حالی سے جو گہرا تعلق ہے اس سے کسی سلیم الفطرت شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اقبال کا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کی حیاتِ پاکیزہ ہماری سماجی، معاشی اور روحانی رہنمائی کے لیے ایک مبسوط اور مکمل آئین فراہم کرتی ہے:

رسالتِ محمدیہ ﷺ کا مقصد صرف یہی نہیں کہ بندوں کو اپنے رب سے ملائے، بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ بندوں کو چار عناصر کی دنیا میں رہنے اور انفرادی اور ملّی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک مکمل آئین بھی تیار فرمائے اور یہ آئین خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس وقت تک مسلمانوں کے پاس ہے۔[۱۱]

اسی خیال کی بازگشت ہمیں علامہ کے، نیاز الدین کے نام ۲؍جنوری ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں بھی سنائی دیتی ہے۔ نیاز الدین صاحب نے اپنے خط میں زیارتِ رسول ﷺ کا ذکر کیا تھا جس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

مبارک ہو،اس زمانے میں یہ بڑی سعادت ہے۔قرآن کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے۔ اس نسبتِ محمدیہ ﷺ کی تولید کے لیے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معنی بھی آتے ہوں، خلوص کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔ (شاہ ولی اللہ نے بھی ''لمعات'' میں نسبت کے لیے اسمائے الٰہی کے بہ کثرت ورد کرنے ہی کو کافی گردانا ہے اور اسما کے مفہوم جاننے کو اختیاری قرار دیا ہے۔ مصنف) میرا عقیدہ ہے کہ نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس

زمانے کے لوگ بھی (ان سے) اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوا کرتے تھے۔[۱۲]☆

لاہور میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک موقعے پر اقبال نے جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل کے قائم رکھنے کے لیے تین طریقے بتائے جس میں تیسرے کی بہت زیادہ اہمیت بنتی ہے۔ کہتے ہیں:

> تیسرا طریقہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ یادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کثرت سے اور ایسے انداز سے کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے۔ یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج ہمارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:
>
> آدمی دید است باقی پوست است
> دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

ابھی جو اقتباسات درج کیے گئے، ان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اقبال نے روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شخصیت اور وجدان کا حصہ بنانے اور ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت پیدا کرنے کے لیے کتنی ریاضت کی ہوگی اور کن فکری تصادمات اور فلسفیانہ پیچیدگیوں سے گزرے ہوں گے۔ فسوں گریِ خرد سے لے کر دلِ زندہ کی تپش اور کاہش تک اور کشتِ فلسفیاں سے حریمِ دل باختگاں تک ہزاروں فرسنگ کے فاصلے حائل ہوا کرتے ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے علامہ کی والہانہ عقیدت صرف جبلی رُجحان اور موروثی مؤثرات ہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس میں بہت کچھ ان کے ذاتی تفکر اور تفقہ فی الدین کا دخل ہے۔ جب انھیں ملتِ اسلامیہ کی بے مائیگی اور کس مپرسی کے زہرہ گداز مناظر دیکھنے پڑتے ہیں تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

ہر چند ہے بے راحلہ و قافلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد ﷺ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

روحِ محمد ﷺ سے خطاب صرف اسی شخص کا حق ہوسکتا ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ ''نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی (ان سے) اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابۂ کرام ہوا کرتے تھے۔'' ''ضربِ کلیم'' کی نظم کے محولہ بالا چند اشعار میں حالی کی ''اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے'' (اس نظم کے چند شعر پیچھے کہیں درج کیے گئے ہیں) کی گونج سنائی دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اقبال نے بحر بھی وہی منتخب کی ہے جس میں حالی کی متذکرہ مشہور فریاد لکھی گئی ہے۔ اقبال کی اس نظم میں کرب کی جس شدت کا عمل دخل ہے، اس کے پس منظر میں عالمِ اسلام کی بے بسی اور بے بضاعتی کا حال آئینہ ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

''بانگِ درا'' میں 'وطنیت' کے نام سے علامہ نے جو نظم لکھی ہے، اس میں انھوں نے وطن پرستی کے خطرات اور معائب کی نشان دہی کی ہے اور اس سے پیدا ہونے والی باہمی رقابتوں یعنی جوع الارض، استعمار کی لعنت اور اقوام کی رقابت کا ذکر ہے، مگر وطن پرستی کی تردید لاتے ہیں تو حضورِ اکرم ﷺ سے، جنھوں نے ترکِ وطن کرکے اسلام کے لاوطن ہونے کی قوی برہان مہیا کردی۔[۱۳☆] بالواسطہ نعت گوئی کا یہ اسلوب بڑا جان دار اور بڑا یقین افروز ہے۔ حضور ﷺ کی سیرتِ منزہ کو عصری مسائل کے حل کے طور پر اقبال نے جا بہ جا پیش کیا ہے:

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ﷺ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ﷺ ہے

نظّارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

افسوس یہ ہے کہ آج کے مسلمان کو اس بت کو خاک میں ملانے کا خیال بہت کم ہوا، البتہ مغرب کو اس کا شدید احساس ہو چلا ہے۔ Dorsey کی مشہور کتاب Civilizatin کا اختتامیہ یوں ہے:

میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں، مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے، لیکن مجھے اس سے زیادہ فخر انسان ہونے پر ہے۔ آج ہماری قومیت پرستی نوعِ انسانی کی بہت بڑی دشمن اور تہذیب و ارتقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گئی ہے۔

علامہ کے نزدیک دنیا و ما فیہا کی تمام ہماہمی اس وجودِ مسعود کی مرہونِ منّت ہے جس نے عرب کے ریگ زار میں توحید کے چراغ روشن کیے۔ ہنگامۂ عالم اسی رحمۃ للعالمینی کا محتاج ہے۔ نبضِ حیات دھڑک رہی ہے تو اسی جاں پرور شخصیت کے فیض سے۔ گویا اقبال نے لولاک لما خلقت الافلاک ہی کی بلیغ حقیقت کو دُہرایا ہے اور اس انداز سے دُہرایا ہے کہ نعت گوئی کی انتہائی معراج کی چھو لیا ہے۔ ''جوابِ شکوہ'' کے آخری شعر ملاحظہ ہوں:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں میں تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں ، دامنِ کہسار میں ، میدان میں ہے
بحر میں ، موج کی آغوش میں ، طوفان میں ہے

چین کے شہر ، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

''جاوید نامہ'' میں اقبال تخیلی سفرِ افلاک کے دوران مختلف عظیم شخصیات کو ایک دوسرے سے محوِ گفتگو دکھا کر عقدہ ہائے حیات حل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک موقعے پر زندہ رود حلاّج سے نبیِ اقدس ﷺ کے متعلق فلسفیانہ طرز پر استفسار کرتا ہے کہ وہ کیا ہیں، آدم ہیں یا جوہر ہیں جو پیکرِ خاکی میں رخشاں نظر آتا ہے۔ اس کے جواب میں حلاّج نے جو کچھ کہا ہے گویا حضورِ اکرم ﷺ کی شخصیت کا (فلسفیانہ سطح پر) نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام کائنات اسی ایک وجودِ سعید کی مرہونِ منّت ہے۔ تقدیر کی عنان بھی اس کے موڑنے سے مُڑتی ہے اور ویرانے بھی اسی کے دستِ معجز اثر سے بہار اثر ہوتے ہیں:

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبدہٗ با ابتدا بے انتہاست
عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

نومبر ۱۹۳۳ء کو علامہ کو حکیم سنائی کے مزارِ مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس موقعے پر انھوں نے جو نظم کہی اس میں نعت کے چند لاجواب شعر بھی شامل ہیں۔ اس نظم میں

حکمت و فلسفے کے بے بہا موتی بکھیرنے کے بعد آخر سے پہلے تین شعروں میں حضور ﷺ کی نعت میں ایسے بے مثال شعر کہے ہیں کہ نعت گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسے نعتیہ اشعار سے نعت کے جید شعرا کے کشکول بھی خالی نظر آتے ہیں۔ حضور ﷺ کی ذات نے کس طرح خاک کو اکسیر کر دیا۔ اس کا ذکر اقبال کی زبانی سنیے:

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہوجائیں
کہ برفتراکِ صاحبدولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سبل ، ختم الرسل ، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ ☆[14]

علامہ کو روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کی جو شدید آرزو تھی، اس کا اظہار ان کی نعت نما نظموں اور خطوط میں بڑے تواتر سے ہوا ہے۔ خطوط کا یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ان کے سالِ وفات تک پھیلا نظر آتا ہے اور ان کی اس شدید آرزو کا حسرت آگیں (اور کہیں کہیں پُر جوش اور خود سپردانہ) اظہار اور پھر تخیلی طور پر روضۂ نبی ﷺ کی زیارت کے بعد بے پناہ سرور کا ذکر ان کی پہلی شعری تصنیف سے لے کر ان کی آخری شعری تخلیق تک ملتا ہے۔ ۶؍اکتوبر ۱۹۱۱ء کو انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کے نام جو خط لکھا، اس کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

> خدا آپ کو اور مجھ کو زیارتِ رسول ﷺ نصیب کرے، مدت سے یہ آرزو دل میں پرورش پا رہی ہے، دیکھیے کب جوان ہوتی ہے۔☆[15]

اقبال کی یہ آرزو جوان تو ہوئی، لیکن اس کی بہ وجوہ تکمیل ممکن نہ ہو سکی۔ ''علامہ اقبال کی آخری علالت'' کے عنوان سے سیّد نذیر نیازی نے جو مضمون لکھا ہے، اس میں اقبال کی اس شدید خواہش کی تصویر اور واضح ہو کر دکھائی دینے لگتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ...لیکن اس سے کہیں بڑھ کر ان کی ایک دیرینہ آرزو تھی اور وہ تھی

> حرمِ پاکِ نبوی ﷺ کی زیارت۔۱۹۳۲ء کو انگلستان سے واپس ہوتے ہوئے جب وہ مؤتمر اسلامیہ کی شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت سفرِ حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لیکن پھر جیسا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا، ''اس بات سے شرم آتی تھی کہ گویا میں ضمناً دربارِ رسول ﷺ میں حاضر ہوں۔''[☆۱۶]
> خیر، اس وقت تک یہ ارادہ پورا ہونے سے رہ گیا، مگر اُن کے تأثرات دب نہ سکے اور ان کا اظہار اس نظم میں ہوا جو ''ذوق و شوق'' کے عنوان سے ''بالِ جبریل'' میں موجود ہے۔[☆۱۷]

علامہ اگرچہ روضۂ اطہر کی زیارت سے مشرف نہ ہوسکے، لیکن اس کی کمی کئی ذرائع سے پوری کرتے رہے، مثلاً قرآن اور سیرتِ نبوی ﷺ کے پیہم مطالعے سے یا پھر طیبہ کے روحانی تخیلی سفر کے ذریعے۔۲۳/اکتوبر ۱۹۱۸ء کو سیّد سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

> معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی، کیوں کہ رات کو سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا (شبلی رحمۃ اللہ علیہ) مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربارِ نبوی ﷺ سے عطا ہوگا۔

علامہ کے روحانی اور تخیلی سفر کی ابتدا جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ان کی پہلی گراں قدر شعری کاوش سے ہوجاتی ہے۔ ''بانگِ درا'' کے صفحے ۲۱۸ پر جو نعت موجود ہے، اس کی تاریخِ تخلیق کا علم نہیں، لیکن اس سے پہلے کی نظم ''مسلم'' کی تاریخِ اشاعت درج ہے یعنی جون ۱۹۱۲ء۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ یہ نعت ٹھیک کس تاریخ اور سنہ میں تخلیق ہوئی، لیکن اگر قیاساً یہ ''مسلم'' نامی نظم کے بعد تخلیق ہوئی تو اس کا سنہ تنظیم ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ ہی بنتا ہوگا۔ میرے اس قیاس کی توثیق اس نظم سے بھی ہوتی ہے جو فاطمہ بنت عبداللہ (یہ لڑکی طرابلس کی جنگ میں مجاہدوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی، جنگِ طرابلس ۱۹۱۱ء میں ہوئی) کے نام اس مجموعے کے ص۲۳۹ پر درج ہے اور جس کا سنہ اشاعت ۱۹۱۲ء ہے۔ چوں کہ زیرِ بحث نظم (نعت) میں بھی طرابلس کے شہیدوں کا ذکر ہوا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ

نظم ۱۹۱۱ء کے اواخر یا ۱۹۱۲ء کے اوائل میں لکھی گئی ہوگی۔ اس نظم میں حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں علامہ کے استحضار اور اپنی قرار نا آشنا طبیعت کا بڑا پُرسوز ذکر ملتا ہے۔ جب حضورِ اکرم ﷺ علامہ کو ''عندلیبِ باغِ حجاز'' کہہ کر سوال فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا تحفہ لایا تو اقبال کس کرب سے گویا ہوتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں ☆۱۸

الحق کہ اس سے گراں قدر اور خلوص آگیں تحفے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا تحفہ پیش کر کے گویا بالواسطہ اقبال نے دنیاے اسلام کی زبوں حالی، کس مپرسی کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ بالواسطہ استمداد کا یہ انداز کتنا جمیل اور کتنا منفرد ہے۔

اس سے ذرا آگے چلیں تو ''پیامِ مشرق'' (۱۹۲۳ء) میں بھی اقبال (تخیلی سفر کے سبب) حضور ختمی مرتبت کی بارگاہ میں حاضر ہوکر سلامِ نیاز پیش کرتے ہیں۔ ''مئے باقی'' کے عنوان سے اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کے آخری حصے میں جو غزلیات لکھی ہیں، ان میں کہیں کہیں آنحضور ﷺ کی نعت کے بھی بے مثل شعر کہہ گئے ہیں:

بہرِ دہلیز تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردیدہ در سمائے من
باخدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یارسول اللہ او پنہان و تو پیدائے من

''بالِ جبریل'' (۳۵ء) کی نظم ''ذوق و شوق'' جو قیامِ فلسطین کے زمانے میں لکھی گئی، درحقیقت نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کے سلسلے میں اتنی نادرالوجود چیز ہے جس پر اردو ادب کے قارئین جتنا ناز کریں، کم ہے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر عشقِ رسول ﷺ کی زندہ برہان ہے اور تاثیر و تاثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اقبال نے اس نظم کے پہلے بند میں حوالیِ بطحا کا ایسا بصیرت افروز نقشہ کھینچا ہے کہ باید و شاید۔ گو اس نظم میں بھی اقبال کی مبینہ زیارت حقیقی نہیں، خیالی اور تمثیلی ہے، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے واقعی سوادِ یثرب اور گنبدِ خضریٰ کی خوب خوب زیارت کی ہے۔ کوہِ اضم اور ریگِ نواحِ کاظمہ کے حوالے امام شرف الدین بوصیری سے ماخوذ ہیں۔ (اقبال بوصیری کے قصیدہ بردہ شریف سے خاصے متأثر تھے) پھر ملتِ اسلامیہ کی بربادی پر اپنے تأسف کا اظہار کیا ہے۔ تیسرے بند سے براہِ راست نعت گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ چوتھا بند خصوصیت کے ساتھ حضور ﷺ کی محبت میں اقبال کی اس خود سپردگی کا مظہر ہے کہ اس سے بڑھ کر قیاس میں نہیں آسکتا۔ اقبال نے لولاک کی تفسیر و توضیح اتنے منفرد اور بلیغ انداز میں کی ہے اور نعت کا اتنا رفیع معیار قائم کر دیا ہے کہ خود روح القدس بھی وجد میں آگئے ہوں گے:

لوح بھی تُو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو، عشق، حضور و اضطراب

علامہ اقبال نادر شاہ فرماں روائے افغانستان کی دعوت پر افغانستان گئے۔ حکیم سنائی کے مزار پر بھی حاضری دی (اس روزِ سعید کی یادگار میں اردو کی ایک بے مثل نظم بھی ''بالِ جبریل'' کے ص ۳۷ پر موجود ہے جس کا حوالہ پیچھے آچکا ہے)، اور سنائی سے روحانی مذکرات ہوئے۔ اس گفتگو کے دوران عصرِ حاضر کے فتنوں اور اہلِ اسلام کی زبونی اور بے بضاعتی کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس پر حکیم سنائی امتِ مسلمہ کو حضور ﷺ سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مشورے کے تیور ملاحظہ ہوں:

می ندانی عشق و مستی از کجاست
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفٰے است
مصطفٰے بحر است و موج او بلند
خیزد ایں دریا بجوئے خویش بند
مدّتے برسا حلش پیچیدۂ
لطمہ ہائے موجِ او نادیدۂ
یک زماں خود را بدریا در فگن
تاروانِ رفتہ باز آید بہ تن

(''مثنوی مسافر''، ۱۹۳۴ء)

جس طرح صرف خرامِ ساحل سے دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا، اسی طرح حضور ﷺ کی سیرت میں غوطہ زن ہوئے بغیر ان کی روح تک رسائی آسان نہیں۔ چناں چہ جب علامہ سے ایک صاحب نے علومِ اسلامیہ کی تحصیل کے لیے یورپ جانے کے سلسلے میں مشورہ مانگا تو اسے آپ نے بڑی دل سوزی سے اس کے برعکس مشورہ دیا:

> مصر جائیے، عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے۔ اسلامی علوم اور اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ، تصوف، فقہ، تفسیر کا بہ غور مطالعہ کر کے محمدِ عربی ﷺ کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔[19]☆

علامہ کو تو اس وقت تک یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی روحِ پُرفتوح پر

درود بھیجا جائے جب تک ''رنگ و بوئے محمد ﷺ'' جسم کے روئیں روئیں میں سرایت نہ کر جائے۔ حق یہ ہے کہ علامہ نے ''روحِ محمد ﷺ'' کی اصل و اساس تک پہنچنے کے لیے تمام عمر خود بھی کوشش کی اور اپنے احباب کو بھی اس کی تلقین کی۔ ان کے نزدیک عشقِ محمد ﷺ کا تقاضا ہے کہ سینے کو تمام بتوں سے پاک کرلیا جائے (حضور ﷺ کی ایک حدیث کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے)۔

چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود
از خجالت آب مے گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانندِ دیر
تانداری از محمد ﷺ رنگ و بو
از درودِ خُود میالا نامِ او

''مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کے آخر میں ''در حضورِ رسالت مآب ﷺ'' کے عنوان سے جو فریاد درج ہے، اس کے پہلے چند اشعار ابھی اوپر درج ہوئے۔ اس مثنوی میں علامہ نے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی بڑی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ ان کی ذات کے ساتھ اپنے بے پناہ جذبۂ عشق کا اظہار کیا ہے اور اپنی ذات اور کائنات پر حضور ﷺ کے بے پایاں اور بے کراں فیضان کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ نظم سوز و گداز، جذب و شوق، عجز و الحاح اور التماس و استمداد کا ایک نہایت جاں سوز اور دل گداز مرقع ہے۔ چند جستہ جستہ شعر دیکھیے:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را
درجہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں

تو صلٰوۃِ صبح تو بانگِ اذاں
گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات
اے پناہِ من حریمِ کوے تُو
من بامیدے رمیدم سوے تو

کاذب مسالک وطرائق کے ماننے والے پرستارانِ شب کے خلاف مدد طلب کرنے کے لیے حضور ﷺ سے کس عجز و انکسار کے ساتھ گویا ہوتے ہیں اور اپنی طویل علالت سے پیدا شدہ ضعف کے ازالے کے لیے عرض پیرا ہوتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی اپنی آرزوے زیارتِ رسول ﷺ کا اظہار بھی کرتے ہیں:

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز
اے وجودِ تو جہاں را نوبہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار
اے کہ دادی کرد[20] را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر
دوستانش از غمِ اُو بے خبر!

اور اس مثنوی کا آخری شعر تو کلفتِ ہجر کی دل دوز کیفیت کا ایسا بے مثال مظہر ہے کہ اس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آسکتا:

جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من اے وائے من

مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں علامہ نے ''در بیان ایں کہ خودی، زعشق و محبت استحکام می پذیرد'' کے زیرِ عنوان ابتداً جو اشعار لکھے ہیں، ان میں استحکامِ خودی سے متعلق بڑے

پتے کی باتیں کہی ہیں اور پھر انسانِ کامل ﷺ کا ذکر فرمایا ہے جو ہر قلبِ مصفّٰی میں دھڑکتا ہے۔ یعنی محمد عربی علیہ التحیات والصلوٰۃ جن کے فیض سے قلب و جگر کو قوتیں ارزانی ہوتی ہیں، مشتِ خاک کیمیا بن جاتی ہے اور مسِ خام کندن کا روپ دھار لیتا ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت کا کتنا دل پذیر اور دل کش نقشہ کھینچا ہے:

دل ز عشق او توانامی شود
خاک ہم دوشِ ثریا می شود
در دلِ مسلم مقامِ مصطفٰے است
آبروے ما زنامِ مصطفٰے است
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پاے اُمتش
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
در نگاہِ او یکے بالا و پست
باغلامِ خویش بر یک خواں نشست

''اسرارِ خودی'' کے ص ۱۹ سے ۲۳ تک حضور ﷺ کے محامد و محاسن کا ایسا جمیل، ایسا مصفّٰی، ایسا پاکیزہ اور ایسا دل کو مسخر کرنے والا نقش مرتب کیا ہے کہ خامہ انگشت بہ دنداں اور ناطقہ سر بہ گریباں ہوکر رہ جاتا ہے۔ اقبال کو بایزید بسطامی کی یہ ادا بڑی پسند تھی کہ انھوں نے تمام عمر خربوزہ نہیں کھایا، کیوں کہ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ حضور ﷺ نے اسے کس طرح کھایا تھا۔ حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی اس درجہ حیران کن پیروی دراصل ایک معجزے سے کم نہیں۔ اقبال نے عید میلاد النبی کے ایک موقعے پر تقریر کرتے ہوئے اسی حقیقتِ ثابتہ کو یوں اجاگر کیا:

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے۔ چناں چہ حضور ﷺ نے فرمایا: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علما کا فرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوش گوار ہوجائے اور اتباعِ سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہوجائے۔ حضرت بایزید بسطامی کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کردیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہ نے اس کو کس طرح کھایا۔ مبادا میں ترکِ سنت کا مرتکب ہوجاؤں:

کاملِ بسطام در تقلیدِ فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

''اسرار'' کے علاوہ ''رموزِ بے خودی'' میں بھی حضورِ اکرم ﷺ سے اقبال کے حد درجہ عشق و موانست کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، لیکن اختصار کی خاطر یہاں صرف ''رموز'' کی آخری نظم بہ عنوان ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نظم کاہے کو ہے اقبال نے اپنا سینہ چاک کر کے حضور ﷺ کے آگے رکھ دیا ہے، سینہ جس میں خلوصِ فراواں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس نظم میں حضور ﷺ کی سیرت کو اس ایجاز سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ غنی! اس نظم کا پہلا شعر:

اے ظہورِ تُو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

حضور ﷺ کی معجز اثر اور کیمیا مآب شخصیت کا کتنا سچا اور کتنا متوازن نقشہ کھینچا ہے۔ سیرتِ پاک کے جیتے جاگتے مرقعے ڈھالنے میں اقبال کا کوئی ہم سر اور مثیل نظر نہیں آتا:

اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن ز تابِ روے تُو
ترک و تاجیک و عرب ہندوے تُو
از تُو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی
ذرّہ دامن گیر مہر و ماہ شد
یعنی از نیروے خویش آگاہ شد

پھر حضور ﷺ سے اپنی قوم کی زوال آمادہ ذہنیت کا شکوہ کیا ہے کہ وہ سرِّ نبی ﷺ سے بیگانہ ہوکر بیت الحرم کو بت خانے میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس کے سر میں سومنات سما گیا ہے اور بغلوں میں بت۔ وہ عجمیت کا شکار ہوکر اپنی اندرونی حرارت اور باطنی توانائی سے محروم ہوگئی ہے اور اب راکھ کے سرد ڈھیر میں تبدیل ہوگئی ہے۔ پھر اقبال خود اپنی شخصیت اور پیغام کا ذکر کرتے ہوئے بڑے اعتماد اور تیقن سے اسے قرآنی تعلیمات کے مطابق قرار دیتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی کہتے ہیں کہ اگر میرا پیغام وہ نہیں جس کا میں مدعی ہوں تو سزا کے طور پر مجھے حضور ﷺ کے بوسۂ پا سے محروم رکھا جائے، مجھ پر رختِ حیات تنگ کردیا جائے، میری تخلیقی قوت کا سرچشمہ خشک ہوجائے، مجھے قیامت کے دن رسوا کیا جائے:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبح اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ مافی الصدور
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم

اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ ما بسا مانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

پھر اپنی زندگی کے نشیب و فراز، اپنی لغزشوں اور خامیوں کا اعتراف کر کے حضور ﷺ سے معافی کی درخواست کی ہے اور ان سے ''شہرِ خنک'' میں بلا لیے جانے کی گزارش کی ہے:

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
فرخ آں شہرے کہ تو بودی درآں
اے خنک خاکے کہ آسودی درآں

اور اس ''شہرِ فرخ'' کا قصیدہ خدا کا غلام اقبال ہی نہیں پڑھتا خود خدا بھی پڑھتا ہے:

لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد۔ (القرآن۔۹۰)

(مجھے اس شہر کی قسم (کیوں کہ) اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔)

اقبال نے ایک اور جگہ بھی کس خود فراموشی اور شدتِ جذبات کے عالم میں کہا ہے:

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دل بر است

اسی ذیل میں ۱۳؍اگست ۱۹۱۸ء کے ایک مکتوب کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

کل شام سے طبیعت نہایت مشتعل ہے۔ وکیل اخبار لکھتا ہے کہ کسی

> انگریزی اخبار نے مدینہ منورہ کی بہت توہین کی ہے۔ کم زوروں کے پاس بددعا کے سوا اور کیا ہے۔[۲۱☆]

اوراب ہم آتے ہیں ''ارمغانِ حجاز'' کی طرف۔ مولانا عبدالسلام ندوی ''علامہ اقبال کا نعتیہ کلام'' کے عنوان سے اپنی کتاب میں ''ارمغانِ حجاز'' کے باب میں لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب ایک مدت تک خودی کے نشے میں چُور رہے۔ اس لیے انھوں نے اس موضوع (نعت) پر کچھ نہیں لکھا، لیکن اخیر عمر میں بالخصوص زمانۂ علالت میں جب ان کے دل میں غیر معمولی سوز و گداز بیدار ہوا تو اُنھوں نے پھر نعتیہ شاعری کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر ''ارمغانِ حجاز'' کے باب میں نہایت پُرسوز اور پُر درد قطعات لکھے۔[۲۲☆]

مولانا ندوی کے اس اقتباس سے جزوی اتفاق ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ علامہ خودی کے نشے میں ایک عرصے تک چُور رہے، اس لیے بہ قول اُن کے نعت گوئی کی طرف رجوع نہ کرسکے، لیکن اوّل تو اقبال کا تصورِ خودی ہی عشقِ رسول کے بغیر بے کارِ محض ہے (علامہ کا تصورِ خودی عشقِ رسول ﷺ سے مالا مال ہے)، تاہم اگر ایک لمحے کے لیے مولانا موصوف کا مؤقف تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی ان کے اس جملے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ''انھوں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا'' تا آں کہ ''ارمغانِ حجاز'' میں ان کے سوز و گداز سے مملو قطعات دیکھنے میں آتے ہیں۔

علامہ اپنے قیامِ انگلستان ہی کے دوران فلسفۂ خودی سے متأثر ہونے لگے تھے۔ ہندوستان واپسی کے بعد ۷/ جولائی ۱۹۱۱ء کو عطیہ فیضی کے نام خط میں ایک فارسی مثنوی کا ذکر کرتے ہیں جو دراصل ''اسرارِ خودی'' کی شروع قرار دی جاسکتی ہے۔ ۱۹۱۱ء ہی میں اقبال کے بعض خطوط ملتے ہیں جن کے حوالے پہلے دیے جاچکے ہیں اور جو ان کے عشقِ رسول ﷺ کے قوی ثبوت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں (گویا ان کا فلسفۂ خودی اور عشقِ رسول ﷺ دوش بہ دوش چلتے ہیں)۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ''اسرارِ خودی'' اشاعت پذیر ہوتی ہے اور ۱۹۱۸ء میں ''رموزِ بے خودی'' منصۂ شہود پر آتی ہے۔ چناں چہ یہ دونوں کتابیں یا پھر ان

کے خطبات (۱۹۳۰ء) ان کے نشۂ خودی میں چُور ہونے کی زیادہ قوی براہین قرار دی جاسکتی ہیں۔ گو ان کا فلسفۂ خودی ان کی ہر تصنیف میں رچا بسا نظر آتا ہے، لیکن ان دو کتابوں یعنی ''اسرار و رموز'' اور خطبات کے دوران مطبوعہ ان کی دو اور کتابیں بھی تو اقبالیات کے کسی طالبِ علم سے مخفی نہیں رہ سکتیں۔ ان میں ایک تو ''پیامِ مشرق'' ہے جو جولائی ۱۹۲۳ء میں چھپی اور دوسری ''زبورِ عجم'' جو جون ۱۹۲۷ء میں طبع ہوئی۔ ان میں سے اوّل الذکر کتاب میں نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کے بڑے نادر نمونے ملتے ہیں۔[۲۳]☆ رہی ''زبورِ عجم'' تو اس میں بھی نعتیہ اشعار کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ البتہ ندوی صاحب کے اس خیال سے کاملاً اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ''ارمغانِ حجاز'' میں ''نہایت پُرسوز'' اور ''پُردرد'' قطعات ملتے ہیں۔ دراصل مولانا ندوی کے محولہ بالا مضمون میں علامہ کی نعت گوئی کا نہایت اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور موصوف نے خود کو صرف ''بانگِ درا''، ''اسرارِ خودی'' اور ''ارمغانِ حجاز'' تک محدود رکھا ہے۔ وہ مضمون کا اختتام ایک قطعے پر کر دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مضمون کے نامکمل اور تشنہ ہونے کا خود ہی اعتراف بھی کرتے ہیں۔ تو خیر، ذکر ہو رہا تھا گداز اور سوز کا اور یہ واقعہ ہے کہ گداز کی جن حدوں کو اقبال نے ''ارمغانِ حجاز'' میں ''حضورِ رسالت مآب ﷺ'' کے عنوان کے تحت چھُوا ہے، اس کی نظیر خود اقبال کی نعتوں میں نسبتاً کم ملتی ہے۔ اس سوز و گداز میں علامہ کی طویل علالت (ضیق النفس) کو بھی دخل ہے اور شاید اس بات کو بھی کہ انھیں غالبًا احساس ہو چلا تھا کہ ان کی زیارتِ روضۂ رسول ﷺ کی آرزو پوری نہ ہوسکے گی۔ اگرچہ اقبال عملاً اس کے لیے بہ حدِّ مقدور کوشاں رہے:

> ۱۹۳۷ء میں ان کی حالت بہتر ہوئی تو انھوں نے مختلف جہازراں کمپنیوں سے خط کتابت شروع کردی۔ خیال یہ تھا کہ ۱۹۳۸ء نہیں تو ۱۹۳۹ء میں اس قابل ہوجائیں گے کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہوں۔ رفتہ رفتہ انھوں نے عالمِ تصور ہی میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں طے کرلیں۔ اِدھر وفورِ شوق نے ان کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور اُدھر اُن کی زبان

جوش و مستی میں ترانہ ریز ہوئی۔[۲۴]☆

اوپر جو اقتباس درج ہوا یہ اس شخص کی جانب سے ہے جسے اقبال سے براہِ راست فیض یاب ہونے اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کے بے شمار مواقع ملے۔ ایسی ہی ایک مثال فقیر سیّد وحید الدین کی ہے۔ انھوں نے بھی اقبال کے آخری زمانے کا نقشہ کم و بیش ایسے ہی لفظوں میں کھینچا ہے جن سے اقبال کی شدتِ شوق اور والہانہ پن کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے:

زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آجاتا تھا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے اور آخر عمر میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی، آواز بھرّا جاتی تھی اور کئی کئی منٹ مکمل سکوت اختیار کرلیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پاسکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔[۲۵]☆

۱۹۳۷ء کے موسمِ سرما میں ایک روز جاوید منزل میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک صحبت رہی۔ وہ اس وقت بہت کم زور تھے۔ سفرِ مدینہ کا ذکر بھی رہا۔ کہنے لگے، ''جس قدر تھوڑی سی طاقت مجھ میں باقی رہ گئی ہے، میں اس کو مدینے کے سفر کے لیے بچا بچا کر رکھ رہا ہوں۔[۲۶]☆

اقبال کی آخری عمر کے وفورِ جذبات کی یوں تو کئی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن طوالت کا خوف مانع آتا ہے۔ تاہم اس وفورِ شوق کا اظہار اقبال کے آخری عمر کے خطوں میں بھی ہوا ہے، اس میں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ خط چوں کہ خود اقبال نے لکھے یا لکھوائے اس لیے ہم اقبال کے باطنی گداز میں براہِ راست شریک ہوسکتے ہیں کیوں کہ یہاں لکھنے والا خود اقبال ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ آخری عمر کے ان خطوں کو ''ارمغانِ حجاز'' کے قطعات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اور ہی کیفیت ہوتی ہے۔ راس مسعود، بھوپال کو ۱۵/جنوری ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

امسال دربارِ حضور ﷺ میں حاضری کا قصد تھا، مگر بعض موانع پیش

آئے۔ اِن شاء اللہ اُمید ہے کہ سالِ آئندہ حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت ﷺ میں حاضری بھی دوں گا۔

سر اکبر حیدری کے نام جو مکتوب لکھا، اس سے بھی ان کے بے پایاں شوقِ زیارت اور سوزِ دروں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خط ۱۳/ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا:

تنہا خواہش جو ہنوز میرے دل میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہوسکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کے مزار پر حاضری دوں جس کا ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہِ تسکین اور باعثِ الہام رہا ہے۔

علامہ کو اس بات کا احساس یوں تو شروع ہی سے تھا کہ ان کا ملجا و ماویٰ (ہر سچے مسلمان کی طرح) حضور ﷺ کا سایۂ رحمت ہے، لیکن یہ احساس آخری عمر میں شدت اختیار کر گیا تھا۔ چناں چہ وہ ایک بوڑھے زائر (خود اپنا) کا کتنا خوب صورت نقشہ کھینچتے ہیں جو کیف اور سوز کی سرمدی کیفیات میں مست، طیبہ کی زیارت کے لیے روانہ ہو رہا ہے جسے گنبدِ خضریٰ کے دیدار کی تو مسرت ہو رہی ہے، مگر ساتھ ساتھ اس بات کا دکھ بھی ہے کہ وہ زیارتِ روضہ کے لیے اس وقت تیار ہوا جب اس کی زندگی آفتابِ لبِ کوہ اور چراغِ آخرِ شب کی تصویر بن گئی ہے۔:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

علامہ نے اپنے بدن کی واماندگی، خستگی اور اضمحلال اور اپنے طغیانِ آرزوے زیارت کا اور بھی کئی قطعات میں ذکر کیا ہے۔ وہ عالمِ خیال میں اونٹنی پر سوار ریگِ صحرا کی پہنائیاں طے کرتے منزلِ جاناں کی طرف رواں دواں ہیں:

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپائش ریگِ ایں صحرا حریر است

اس تخیلی سفر میں وہ اسلوبِ حُدی خوانی سے ناواقف ہونے کے باوجود نغمۂ ساربان میں خود کو شریک کر کے فاصلے پاٹتے جا رہے ہیں اور عراقی اور جامی کے پُرسوز اشعار کو کام میں لا رہے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ عراقی اور جامی کے ایسے ہی اشعار اقبال کی نوکِ زباں ہوں گے:

ادیمِ طائفی نعلینِ پا کن
شراک از رشتۂ جاں ہائے ما کن
(جامیؔ)

بہرحال اقبال کا قطعہ ہے:

گہے شعرِ عراقیؔ را بخوانم
گہے جامیؔ زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے سار بانم

کہیں کہیں اقبال تنہا ہی آمادۂ سفر نظر آتے ہیں، مے خانۂ شوق کے خم کے خم لنڈھا رہے ہیں اور یثرب کی طرف مستانہ وار بڑھ رہے ہیں:

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب ، کجا مے خانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

حضور ﷺ کے ساتھ اقبال کی روحانی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ حجِ بیت اللہ کے بھی صرف اس لیے مکلّف نظر آتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ وگرنہ

ان کے لیے صرف رسول اللہ ﷺ اور روضۂ رسول ﷺ ہی کافی ہیں:

در آں دریا کہ او را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جُز تو ما را منزلے نیست

بکوے تو گدازِ یک نوا بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأتِ آں رند پاکم
خدا را گفت ما را مصطفیٰ بس

بدن واماند و جانم در تگ و پوست
سوے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و باخاصاں بیآمیز
کہ من دارم ہواے منزلِ دوست

بالآخر اقبال روضۂ رسول ﷺ پر جا پہنچتے ہیں تو حضور ﷺ کو اپنا دل تحفے کے طور پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پُرخلوص اور بے ریا دل سے بڑھ کر اور کیا تحفہ قیاس میں آسکتا ہے:

دمید آں لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش مے تراود از کنارم
قبولش کن ز راہِ دل نوازی
کہ من غیر از دلے چیزے ندارم

پھر ملوکیت کی مکاریوں، نوآبادیاتی ہوس ناکی اور سامراجی لوٹ کھسوٹ کا ذکر

کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اورتو اور روم و حجاز تک اس فتنے کے نخچیر ہو چکے ہیں۔ سامراجی لٹیروں نے غریب اور کم زور قوموں کا قافیۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور انھیں غلامی اور ذلت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ چناں چہ اس فتنے کے انسداد و انہدام کے لیے حضور ﷺ سے مدد طلب کرتے ہیں:

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است
از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضورِ تو غمِ یاراں بگویم
بامیدے کہ وقتِ دل نوازی است

پھر اقوامِ شرق کی بیداری کے لیے اپنے حیات افروز پیغام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افسوس میری قوم نے اس سے کچھ سبق نہیں سیکھا (حالاں کہ میرا پیغام بہ منزلۂ خرما تھا، شیریں بھی اور قوت بخش بھی) الٹا مجھے غزل خواں سمجھ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے زمانے کی غزل نے ابھی حقیقت سے رشتہ اس شدت سے استوار نہیں کیا تھا کہ وہ سماجی وظیفہ ادا کرنے کی اہل قرار دی جاسکتی۔ یہ درست کہ حالی کی غزل ضرور جدید دکھائی دیتی ہے، لیکن حالی، ان کے معاصرین اکبر اور شبلی وغیرہ نے غزل کے بجائے زیادہ تر نظم کو تنقیدِ حیات اور تہذیبِ ملت کے لیے استعمال کیا۔ اقبال کا یہ کمال بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں کہ اس کی غزل بھی تقریباً اتنی ہی زندگی آفریں ہے جتنی اس کی نظم۔ اقبال حضور ﷺ سے داد طلب کرتے ہیں تو کتنے کرب کے ساتھ:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

پھر اپنی ذات پر حضور ﷺ کے بے پایاں فیضان و احسان یعنی اپنی توحید پرستانہ بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے التجا کرتے ہیں کہ مجھے اپنا جلوہ دکھا، کیوں کہ تجھے

دیکھنا گویا خدا کو دیکھنا ہے، جیسا کہ مشہور حدیث ہے: من رانی فقد رای الحق:

بہ چشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبح من رآنی
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

اپنے اور اپنی ملت کے درد و کرب اور آلام و مصائب کا ذکر کرنے کے باوجود اقبال کو یہ احساس ہے کہ ابھی بہت کچھ کہنا ہے، لیکن حضور ﷺ کا ادب مانع ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ وہی اقبال جب اللہ سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کی طلاقتِ لسانی اور شوخی اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے حضور اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بات مختصر سے مختصر کی جائے اور ادب کا تقاضا یہی ہے۔ حق یہ ہے کہ اقبال نے حضور ﷺ سے جہاں کہیں بھی خطاب کیا ہے، اس کا انداز انتہائی نیاز مندانہ اور ملتجیانہ رہا ہے۔ دربارِ نبوی ﷺ میں اس کی قوتِ گویائی سلب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک تو اس لیے کہ قوم کے اتھاہ دکھوں کو بیان کرتے کرتے اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی آواز رُندھ جاتی ہے، اور دوسرے اس لیے کہ اقبال کا خطاب اس ذات سے ہے جن کے حضور جنید و بایزید تک کے پائے کے عرفا دم بہ خود نظر آتے ہیں:

رخم از دردِ پنہاں زعفرانی
ترا ود خوں ز چشمِ ارغوانی
سخن اندر گلوے من گرہ بست
تو احوالِ مرا ناگفتہ دانی

اور اسی مفہوم کا ایک اور قطعہ ملاحظہ کریں جہاں اقبال دربارِ نبوی ﷺ میں بڑے زہرہ گداز انداز میں تڑپتے اور گریہ کرتے نظر آتے ہیں:

حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نواے دل گدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گو
تپیدم ، آفریدم ، آرمیدم

''ارمغانِ حجاز'' میں ایسے قطعات بیسیوں کی تعداد تک پہنچتے ہیں جن میں اقبال ''فنا فی الرسول'' کے درجے پر فائز نظر آتے ہیں، لیکن یہاں ان تمام کے ارقام و اندراج کی گنجائش نہیں۔ اس مقام پر اقبال ''مارا مصطفٰے بس'' کی عملی تفسیر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی اُمنگیں، اس کی آرزوئیں، اس کی جستجوئیں، اس کے نالۂ نیم شب کا گداز، اس کی نوا کا سوز اور ساز، اس کے نفس کی آمد و شد، غرض اس کی پوری زندگی حضورِ اکرم علیہ التحیات والصلوٰۃ کی محبت میں رنگی نظر آتی ہے۔ اسے اب اگر کسی چیز کی حاجت ہے تو صرف نگاہِ رسول ﷺ کی:

دلش نالد چرا نالد؟ نداند
نگاہے یارسول اللہ نگاہے

ان تمام مباحث سے واضح ہوگیا ہوگا کہ علامہ نے کلاسیکی نعت گوئی سے الگ ایک رستہ نکالا اور آج یہی رستہ خود کلاسیک کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ ہمارے آج کے نعت گو شعرا پر اقبال کا فیضان اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں۔

حواشی

۱۔ ''روزگارِ فقیر''، ص۹۵۔
۲۔ ''جوہرِ اقبال''، ص۲۱۔
۳۔ رشید احمد صدیقی، اقبال: ''شخصیت و شاعر''، ص۹۸۔
۴۔ عبدالسلام ندوی، ''اقبالِ کامل''، ص۲۳۹۔
۵۔ ممتاز حسن، ''خیر البشر ﷺ کے حضور میں''، ص۲۵۔
۶۔ ایضاً، ص۲۰۔
۷۔ مصطفٰی رضا خاں، ''الملفوظ''، حصہ دوم، ص۴۰۔
۸۔ تب و تابِ بت کدۂ عجم، نرسد بہ سوز و گدازِ من
کہ بہ یک نگاہ محمدِ عربی ﷺ گرفت حجازِ من (پیامِ مشرق)
۹۔ ڈاکٹر ایس اے لطیف، Influence of English Literature on Urdu

۱۰۔ ''جاوید نامہ''، ص۶۶۔ ۶۵۔

۱۱۔ ''اسرار و رموز''، ص۲۳۔

۱۲۔ ''صحیفہ''، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۸۔

۱۳۔ ''اقبال نامہ''، جلد دوم، ص۳۱۷۔

۱۴۔ خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز
گو سلامت محملِ شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جاں کاہی میں ہے
(''بانگِ درا''، ص۱۷۵)

۱۵۔ ''بالِ جبریل''، ص۱۴۱۔

۱۶۔ ''اقبال نامہ''، ص۳۶۔

۱۷۔ اس ضمن میں ''روزگارِ فقیر'' کے ص۳۷۔ ۳۸ بھی ملاحظہ ہوں۔

۱۸۔ ''اقبال''، انجمن ترقیِ اردو، ہند، ۱۹۴۴ء، دوسرا ایڈیشن، ص۳۲۰۔

۱۹۔ حضورِ رسالت مآب ﷺ میں (''بانگِ درا''، ص۲۱۹)، میرا خیال ہے، یہ وہی نظم ہے جو ۶؍اکتوبر ۱۹۱۱ء کو شاہی مسجد میں ''خونِ شہیداں کی نذر'' کے نام سے پڑھی گئی اور جس نے بہ قول منشی محمد دین فوق ایک قیامت برپا کردی۔ دیکھیے ''نیرنگِ خیال'' (''نقوش'') کا 'اقبال نمبر'، ص۲۱۔

۲۰۔ ''اقبال اور سیاستِ ملّی''، ص۹۷۔

۲۱۔ دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبحِ حجاز از شام کرد
(امسیت کردیا و اصبحت عربیا۔ شیخ حسام الدین ضیاء الدین کے قول کی طرف اشارہ۔)

۲۲۔ رئیس احمد جعفری، ''اقبال اور سیاستِ ملّی''، ص۹۹۔

۲۳۔ ''اقبالِ کامل''، ص۲۹۷۔

۲۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، صفحات ۶، ۸، ۲۰۸، ۲۱۸، ۲۲۱۔

۲۵۔ سیّد نذیر نیازی، ''اقبال کی آخری علالت''، مجلّہ ''اقبال''، ۱۹۴۴ء، ص۳۲۰۔

۲۶۔ ''روزگارِ فقیر''، ص۳۷۔

۲۷۔ غلام بھیک نیرنگ، رسالہ ''اقبال''، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۷ء۔

مبین مرزا

اقبال: حرفِ نعت اور تشکیلِ افکار

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے بحرِ ناپیدا کنار میں اقبال کی مثال ایک جزیرے کی سی ہے۔ وہ اس بحر کا حصہ ہے، لیکن اس میں گم نہیں، بلکہ اس سے الگ اپنی ایک قائم بالذات شناخت رکھتا ہے۔ اس بحر میں سر برآوردہ موجیں اٹھتی رہی ہیں، لیکن یہ جزیرہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ اس کے رنگ اور موسم سب اس کے اپنے ہیں اور الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ سمندر کی موجوں کا اپنا اپنا خروش اور اپنی اپنی گونج ہے اور اس جزیرے کی ہواؤں کا اپنا ایک آہنگ۔ سمندر کی لہروں کے دامن میں ہیرے موتی ہیں تو اس جزیرے کی مٹی میں اپنے پوشیدہ خزانے۔ یوں تو یہ دونوں باہم مربوط ہیں، لیکن دونوں کی الگ ہستی ہے اور جداگانہ شناخت۔

اہم بات یہ ہے کہ ہماری تنقید نے بھی اس حقیقت کو سمجھا اور تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن زاویہ ہائے نگاہ، جیسے موضوعات اور جن تناظرات میں کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا گیا ہے، بلاشبہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کا نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا سبب اقبال کے حرفِ سخن اور اس کے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود آج بھی اگر کوئی اک ذرا توجہ سے شعر و فکرِ اقبال پر نگاہ ڈالے تو اُسے کچھ ایسے نکات بہر حال فراہم ہو جاتے ہیں جو اس کی تفہیم کے نئے پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں کہیں عصرِ حاضر کے افکار و نظریات سیاق فراہم کرتے ہیں تو کہیں تہذیب و تمدن کے تصورات۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری

اور افکار آج بھی اپنے مطالعے کا جواز رکھتے ہیں۔

یوں تو اسے سخنِ اقبال کی بلند اقبالی ہی کہا جائے گا کہ مختلف الخیال افراد اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ صرف شادکام رہتے ہیں، بلکہ اپنے فکر و خیال کے ذیل میں انھیں یہاں سے حوالے اور مثالیں بھی میسر آ جاتی ہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں، وہ اہلِ مذہب ہوں یا انقلابی، قوم پرست ہوں یا سماجی و معاشی مساوات کے داعی، تہذیب کے خوگر ہوں یا آزادیِ انساں کا نعرہ لگانے والے، فطرت پسند ہوں یا خودی کے پرستار، فلسفہ و حکمت کے جویا ہوں یا لطفِ زبان و بیاں کے رسیا— اقبال کے یہاں سبھی کو تسکین و طمانیت کا سامان حسبِ مراد میسر آ جاتا ہے۔ تاہم اگر شمس الرحمٰن فاروقی اس صورتِ حال سے نالاں ہیں کہ اس طرح اقبال کو افکار کے سانچوں میں بانٹ کر پڑھنا زیادتی ہے تو ٹھیک ہے، وہ اقبال کا لفظیاتی اور عروضی نظام پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا شوق پورا کرلیں۔ آزاد ذہن کے ساتھ ادب پڑھنے والے لوگ آخر نقادوں یا اُن کی تنقید کی انگلی پکڑ کر چلنے کے پابند تو نہیں ہوسکتے۔ ویسے تو اقبال کو اُن کے افکار کے تناظر میں پڑھنے کی شکایت سلیم احمد نے بھی کی تھی اور کہا تھا کہ افکار کی اہمیت کو اس درجہ بڑھا دیا گیا ہے کہ شاعر (یعنی اُن کے بہ قول اصل اقبال کہیں دب کر رہ گیا ہے۔

ناقدینِ اقبال پر سلیم احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات اپنی جگہ۔ ظاہر ہے، یہ اعتراضات ان سب لوگوں کے مقالات و تجزیات اور ان سے حاصل شدہ تأثرات اور نتائج کے حوالے سے کیے گئے ہیں جو غیر ضروری طور پر اقبال کے افکار پر مرکوز ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگ باقی سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف و محض اقبال کے یہاں سے فلسفہ برآمد کرنے یا اُس سے فلسفے کے نکات اور دلائل و براہین اخذ کرنے کو اصل کام سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ کسی بھی بڑے شاعر کا متوازن اور جامع مطالعہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس کے افکار و خیالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کے ساتھ اُس کی طرزِ احساس، تشبیہاتی و استعاراتی علائم، فنی اوصاف اور جمالیاتی خواص کو بھی تہ بہ تہ کھولنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ذرا دقت طلب ہے اور اُس وقت ہوسکتا ہے

جب نقاد اُس مرکز و محور تک پہنچنے کی جستجو کرے جہاں سے زیرِ مطالعہ شاعر کا نظامِ فکر و احساس تحریک حاصل کرتا اور نمو پاتا ہے۔

دقّت اپنی جگہ، لیکن کسی فن کار کے بنیادی داعیے اور مرکزی مسئلے کو اس کے فن کارانہ اظہار کی اعلیٰ ترین سطح پر سمجھنے کے لیے یہی طریقہ سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ فکر و احساس کا مرکز ہی اصل میں وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر فلسفے کے دقیق مسائل بھی جمالیاتی پیرائے میں اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ فکرِ محسوس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کام دقت طلب اس لیے ہوتا ہے کہ اِس میں فن کار کی کلّیتِ کار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ بڑے فن کار کا تخلیقی عمل یا فنی نگارخانہ اصل میں ایک طلسم کدے جیسا ہوتا ہے اور اس کی کلید یا اسمِ اعظم اُس کا مرکزی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس طلسم کدے میں داخل تو کہیں سے بھی ہوسکتے ہیں، فکر و فلسفے کے راستے، طرزِ احساس یا اسلوب کی راہ سے، تشبیہات، استعارات یا علامات کے دروازے سے، اور اگر ایک بار داخل ہوجائیں تو اِس کے بعد سیرِ گلگشتِ مصلیٰ کا لطف بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ فن کار کا فکری اور جمالیاتی طلسم پوری طرح کھلتا انھی لوگوں پر ہے جنھیں اس کا اسمِ اعظم حاصل ہوجائے۔

اب مثال کے طور پر اقبال ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ یہاں نظریات ہیں، افکار ہیں، زمان و مکاں، تہذیب وتمدن، بقا و ارتقا، انہدام و زوال کے تصورات ہیں، تشبیہات و استعارات کا ایک وسیع نگارخانہ ہے، اسلوبیات اور لفظیات کا نظام ہے، لہجہ ہے، انداز ہے، تیور ہیں — غرضے کہ وہ سب کچھ ہے جو ایک بڑے شاعر کے یہاں ملتا ہے یا اس کی اثر آفرینی اور فسوں کاری کو قائم کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں مختلف پڑھنے والوں پر اپنے اپنے انداز اور تناسب سے اثر کرتی ہیں۔ کوئی فکر و فلسفہ کی داد دیتا ہے تو کوئی زبان و بیاں کی، کوئی لہجے کا قتیل ہوتا ہے تو کوئی گھن گرج پر فریفتہ۔ تاہم اگر آپ نتیجہ مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو بس وہ یہ نکلتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اقبال کا قائل ہے۔ چناں چہ اقبال کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ نکلا کہ وہ قائل کرلیتی ہے، یا چلیے یوں کہہ لیجیے کہ اپنے اثر میں لے آتی ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس میں اقبال پوری اردو شاعری میں سب سے آگے نظر آتے ہیں، حتیٰ

کہ میرؔ اور غالبؔ سے بھی۔ اب اگر بات اقبال کا قائل یا قتیل ہونے پر ہی ختم ہوجاتی ہے تو یہ الگ معاملہ ہے، لیکن اگر کوئی ان کے افکار وتصورات، اسلوب و آہنگ اور مزاج و احساس کو اس طرح سمجھنا چاہتا ہے کہ اُن کے تخلیقی عمل کی کنہ تک پہنچے اور اُن کے فکری نظام اور جمالیاتی تجربے کو تہ در تہ کھول کر دیکھ سکے تو اسے لامحالہ اُس مرکز تک پہنچنا ہوگا جہاں سے یہ اکھوا پھوٹتا اور سخنِ اقبال میں رنگ ونور کی شعاعوں کی صورت ظہور کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہوئے اُن کے فکر وفن کی ایک جہت قدرے اختصاص کے ساتھ روشن نظر آتی ہے، اور وہ ہے اُن کی نعت گوئی۔ چوں کہ بیشتر ناقدینِ اقبال اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُن کے افکار و خیالات کے دوسرے نکات کو موضوعِ گفتگو بناتے رہے ہیں، اس لیے اقبال کے شاعرانہ مقام و مرتبے کے تعین میں اس جہت پر عام طور سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اگر کچھ ناقدین نے اس حوالے سے کلامِ اقبال پر نگاہ ڈالی اور جائزہ لیا تو ان میں بھی زیادہ تر لوگ وہ ہیں جنھوں نے اسے اُن کے عشقِ رسول ﷺ کا حاصل گردانا اور عقیدتِ محض کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اقبال کی شاعری میں راہ پانے اور بیان ہونے والے افکار وتصورات کو نعت کے فکری اور اسلوبیاتی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

معدودے چند اہلِ نظر نے اقبال کے یہاں نعت کو صنفی سطح پر اور فنی خصوصیات کے ساتھ دیکھا ہے، اور اُس کے جمالیاتی پہلوؤں اور ادبی محاسن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ویسے اقبال کے بہت سے ناقدین جن میں بڑے بڑے ثقہ لوگ بھی شامل ہیں، کلامِ اقبال کی اس جہت کو درخورِ اعتنا ہی نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ افکارِ اقبال کی تعبیر وتشریح کے باب میں آپ کو مشرق ومغرب کے کتنے ہی فلسفیوں، تاریخ دانوں اور سماجی مفکرین کے حوالے قدم قدم پر ملتے ہیں، لیکن اگر نہیں ملتا تو اِس نکتے پر غور وخوض کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ سخنِ اقبال میں راہ پانے والے افکار وتصورات اجزا کی صورت میں یہاں وہاں سے ماخوذ ہیں یا کوئی ایک منبع ہے جس کی کرنوں نے اقبال کے افکار وآثار کی عمارت کے ہر گوشے کو منور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اگر مختلف افراد کے تصورات وخیالات سے استفادہ

کرتے ہوئے اپنا ایک نظامِ افکار ترتیب دیا ہے تو بھی یہ اپنی جگہ ایک بڑی بات ہے، لیکن اگر یہ ساری روشنی ایک ہی مرکز سے حاصل کی گئی ہے جس سے اس کا پورا ایوانِ فکر جگمگا اٹھا ہے تو یہ اُس سے بھی کہیں بڑا اور اہم کام ہے۔ اس صورت میں اقبال کی جامع تفہیم کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس منبع و ماخذ کو دیکھا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اقبال کے یہاں یہ تجلی کس طرح ظہور کرتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا، بالعموم فکرِ اقبال کا مطالعہ جن اساسی نکات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اُن میں نعت گوئی شامل ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اِس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ مطالعۂ اقبال کے لیے یہ قرینہ توجہ طلب محسوس نہیں کیا ہوگا، ورنہ اتنے بڑے اور اہم ناقدین و شارحینِ کلامِ اقبال اپنے موضوع کی اس جہت سے بھلا کیوں کر صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ تاہم اس امر کا فیصلہ بہتر طور سے اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم براہِ راست شعرِ اقبال سے رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ اس باب میں کس نوع کی شہادتیں پیش کرتا ہے۔ ہماری یہ طالب علمانہ تفتیش کسی گہری چھان پھٹک اور بہت باریک بینی کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ محض ایک طائرانہ نگاہ ہمیں اس معاملے کو سمجھنے کا موقع فراہم کردیتی ہے، اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے افکار و تصورات کی تشکیل و تعمیر میں جس جوہر نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہ رسالت مآب ﷺ کی سیرت و کردار ہے۔ اقبال نے فکر و احساس کی ہر سطح پر اس کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چناں چہ اقبال کے فکر و فن کا مرکزی دھارا اسی اثر کی قوت سے متعین ہوتا ہے۔

تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ اقبال کے فکری سانچے میں برقی رو کی طرح دوڑنے والے اس احساس نے ان کے یہاں مجرد تصور کے طور پر راہ نہیں پائی۔ اس کے برعکس یہ اُن کے یہاں ایک زندہ تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے اس تجربے کو ایک طرف تو اس کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی جہت سے دیکھا اور دوسری طرف ایک ایسے مابعد الطبیعیاتی تناظر میں جہاں کونیاتی امور ظہور کرتے ہیں اور کائناتی سطح پر تغیر و تبدل کا نقشہ ترتیب پاتا ہے۔ اقبال کے یہاں اس کا اظہار اُن کے اوّلین مجموعے ''بانگِ درا'' سے ہی سامنے آنے لگتا ہے۔ ویسے تو اِس مجموعے میں ہمیں کم و بیش اُن سارے افکار و تصورات کے نقوش مل جاتے ہیں جو

بعد ازاں فکرِ اقبال کے نام سے موسوم ہوئے، لیکن یہ افکار وتصورات پہلے مجموعے میں محض ابتدائی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس ابتدائی مرحلے میں بھی اقبال کے یہاں عشقِ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی سیرت و کردار کے اثر کا اظہار جس پختگی اور وارفتگی سے اور جس درجہ بلند فکری سطح پر ہوتا ہے، اس میں حقیقتِ محمدیہ ﷺ کا شعور بھی کارفرما ہے، اور یہ شعور اپنے کونیاتی مضمرات کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر دیکھ لیجیے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

اس نظم کے مطالعے کے دوران آپ غور کیجیے تو وہاں نعت کا ماحول ہے اور نہ ہی وہ فضا ملتی ہے جس میں آپ ﷺ کی سیرت کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہو، بس ایک شعر آتا ہے، اور اس کے بعد موضوع یا سلسلۂ فکر و خیال یکسر بدل جاتا ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ سے ایک مسلمان کے حقیقی رشتے کی نوعیت اور اُس کے ذاتی و اجتماعی زندگی پر اثرات کا وہ منظرنامہ ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں جو دراصل ایک یگانۂ روزگار تہذیب کے نقوش روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں رسمی نعت کا کوئی قرینہ ہمیں نہیں ملتا، لیکن نظم کے مسلسل چار بند اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، اور پھر اس شعر پر یہ نظم پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنے معنی کی وسعت اور گہرائی کا اظہار جس سیاق میں کرتا ہے، اس کو مابعد الطبیعیاتی رموز و علائم کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ خیر، اس موضوع پر آگے چل کر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کم وبیش وہ سب اہم فکری عناصر جو کلامِ اقبال کی جداگانہ شناخت قائم کرتے ہیں اور ان کے خیالات وتصورات کی صورت گری کرتے ہیں، وہ اپنے بلیغ ترین بیانیے کے کسی نہ کسی مرحلے پر یا تو نعتِ رسولِ کریم ﷺ کا کوئی پیرایہ اختیار کرلیتے ہیں یا پھر وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر یا نعت کا کوئی شعر آکر اس

حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ منظرنامہ کس ماخذ سے رنگ و نور اخذ کر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے دوسرے شعرا جو اپنا ایک فکری تناظر رکھتے ہیں، ان کے برخلاف اقبال کے یہاں مابعدالطبیعیاتی افکار کا دائرہ بھی نعتیہ اسلوب کی وجہ سے مجرد نہیں رہتا، محسوس بن جاتا ہے۔

عقل و عشق، خودی و خودآ گاہی، حیات و مرگ، فنا و بقا، اجتہاد و انقلاب اور عروج و زوال سے لے کر اقبال کے عہد تک کے فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات و نظریات جیسے مابعدالطبیعیات، سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت تک آپ جس زاویے سے چاہے دیکھ لیجیے، اُن کی دانش و بینش کا تقریباً سارا نمایاں منظرنامہ اور اُن کے افکار و تصورات کا دائرہ جس سرچشمے سے روشنی حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ لہٰذا مطالعے کے لیے فکر و شعور اور جذبہ و احساس کا جو رُخ بھی سامنے رکھا جائے، سخنِ اقبال پر اسی سرچشمے کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اب اگر اس لحاظ سے غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گو شعرا میں اقبال کا مقام کس قدر بلند اور کتنا منفرد ہے۔

وہ لوگ جو شعر و فکرِ اقبال کا مطالعہ نعت کی جہت سے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا پھر کسی بھی اور وجہ سے ایسا نہیں کرنا چاہتے، انھیں اس نکتے کو تسلیم کرنے میں تأمل ہوسکتا ہے اور ان کی طرف سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ دعویٰ بے محل ہے۔ اس لیے کہ اقبال کا تو نعت گو شعرا میں شمار ہی نہیں ہوتا، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ جب انھوں نے باضابطہ نعت کہی ہی نہیں۔ اب اگر بات رسمی اندازِ نعت کی ہے تو یہ رائے بالکل درست ہے۔ اقبال نے واقعی اُس مزاج اور اسلوب کی نعت نہیں کہی جو عام طور سے ہمارے یہاں رائج ہے اور جس سے عامۃ الناس خوب مانوس ہیں۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت ہے۔ یقیناً اس کے اپنے کچھ موضوعات و مضامین ہیں۔ اسی طرح اس کا اپنا ایک پیٹرن اور ڈکشن بھی ہے۔ عوامی حلقوں میں مروّج اس نعت کے مضامین، موضوعات، طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیاں میں عقیدے اور عقیدت کو نسبتاً فوقیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے، یہ عوامی مزاج کا معاملہ ہے۔

تاہم دیکھا جائے تو یہ مزاج صرف اور صرف اردو اور مسلمانوں سے مخصوص بھی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی عوامی نعت کا رنگ و آہنگ یہی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں

حضرت یحییٰ، حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ f کے لیے محبت و عقیدت سے لکھی گئی نظموں کا بھی کچھ ایسا ہی مزاج نظر آتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ دنیا کی قدیم تہذیبوں، مثلاً چینی یا ہندی تہذیب میں بھی اگر دیکھیے تو ایسے ہی رنگ و اسلوب کی مذہبی شاعری ملے گی، جس میں اوتاروں سے عقیدت و محبت کا اظہار اسی انداز سے کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ معاملہ کسی مذہب، قوم یا خطے سے مخصوص نہیں ہے۔ تہذیبوں اور اقوامِ عالم کی تاریخ ہر تفریق سے بالاتر ہوکر عوامی عقیدت کو اسی رنگ میں ابھارتی نظر آتی ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی فکری و فنی دبازت رکھنے والی نعت کی ایک مستحکم اور مہتم بالشان روایت موجود ہے۔ یہاں موضوعات کا دائرہ قدرے وسیع ہوجاتا ہے جس میں مذہبی افکار، کونیاتی امور اور مابعد الطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔ ساتھ ہی لہجہ اور اسلوب بھی بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسری زبان و ادب کے قارئین کی طرح اردو میں بھی فکری جہت والے نعتیہ ادب کے قارئین ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اب رہا معاملہ اقبال کا تو واقعہ یہ ہے کہ اردو نعت کی شعری تہذیب میں بھی وہ اُسی طرح انفرادیت کے حامل ہیں جیسے اردو شاعری کی روایت میں۔ ’’بالِ جبریل‘‘ اور ’’ضربِ کلیم‘‘ میں تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، لیکن خود ان کے پہلے مجموعے کا مطالعہ بھی ذرا توجہ سے کیا جائے تو وہ بجائے خود اقبال کی انفرادیت کا اوّلین نقش نظر آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ’’بانگِ درا‘‘ کی کچھ نظمیں یا آپ کہہ لیجیے، اس کا ایک حصہ اسی جدید نظم کا تسلسل محسوس ہوتا ہے جس کی طرح حالی اور آزاد نے ڈالی تھی۔ تاہم اس کتاب کا ایک وقیع حصہ قطعی طور پر مختلف ہے۔ یہاں اقبال کی انفرادیت کا واضح طور پر احساس ہوتا ہے، صرف موضوع کی حد تک نہیں، بلکہ طرزِ سخن، کنایات، اشارات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات اور علامات تک آپ کو بہت کچھ ایسا ملے گا جو یہ بات قطعی طور پر ثابت کردے گا کہ اقبال کا کلام ایک الگ شے ہے اور اسے اُس طرح پڑھا ہی نہیں جاسکتا جس طرح ہم اس سے پہلے اپنی شاعری کو پڑھتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ’’بالِ جبریل‘‘، ’’ضربِ کلیم‘‘ اور ’’ارمغانِ حجاز‘‘ کی شاعری کو دیکھ لیجیے اور غور کیجیے کہ اس کا اردو کی شعری روایت سے کیا تعلق ہے۔

اقبال سے پہلے اردو کی شعری روایت دراصل غزل کی روایت ہے، اور یہ اتنی توانا اور ایسی مستحکم روایت ہے کہ اس نے ہند اسلامی تہذیب اور ثقافتی مظاہر کی صورت گری میں بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ تاہم اقبال کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے کہ غزل کا قوام ہی بدل گیا ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلیں پڑھ کر غور کیجیے کہ وہ اپنے مزاج، رنگ، اسلوب، آہنگ، موضوعات اور کیفیات میں اردو غزل کی روایت سے کیا علاقہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی نامہ'' جیسی نظموں کو دیکھ کر فیصلہ کیجیے کہ ہماری شعری روایت کے تسلسل میں یہ نظمیں کس طرح دیکھی جاسکتی ہیں۔ بعینہٖ معاملہ اقبال کی نعت کا بھی ہے۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ یہ اس روایت کا حصہ ہے جو مابعد الطبیعیاتی اور فکری تصورات کو معرضِ بیاں میں لاتی ہے۔ تاہم اپنے موضوعات، یعنی فکری content اور اپنے اسلوب و آہنگ، یعنی جمالیاتی اظہار میں مکمل طور سے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتی ہے۔ شعرِ اقبال کا یہ دریچہ جس سمت میں کھلتا ہے، اس کا منظرنامہ تمام تر اقبال ہی سے موسوم ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے محض چند اشعار دیکھیے:

لوح بھی تو قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بےنقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی چند اشعار بھی اقبال کی نعت کے فکری تناظر اور

اسلوبیاتی مزاج کو سمجھنے کے لیے کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کسی فن کار کی بنیادی تفہیم یا اُس کے فکر وفن کی نادرہ کاری اور بلندی سے عمومی آ گہی کے لیے اُس کا ہر فن پارہ سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کی تمام جہات کا بہ نگاہِ غائر تجزیہ درکار ہوتا ہے۔ دیکھا بس یہ جاتا ہے کہ اپنے فن کی اعلیٰ ترین سطح پر وہ کن فکری مسائل سے سروکار رکھتا ہے اور دقیق ترین سوالات کی جستجو کرتے ہوئے وہ فنی اور شعری جمالیات کے کن معیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال کی یہ نعت صرف اُن کے شعری حاصلات ہی کا نہیں، بلکہ اردو کے بہترین نعتیہ ادب کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ ایک ایسی بلند پایہ مثال جس میں شاعر کا فن ہی درجۂ کمال کو نہیں پہنچا، بلکہ فکری سطح پر دینی روایت اور تہذیبی نشانات بھی اپنی اعلیٰ ترین صورتوں کے ساتھ اس میں ظہور کرتے ہیں۔ اقبال کی نعت نے یہ آواز، یہ لہجہ، یہ آہنگ، یہ فکر، یہ شعور، یہ اسلوب اور یہ جمالیات کس طرح حاصل کی ہے، اس پر ہم ذرا بعد میں بات کرتے ہیں، اس سے پہلے ایک اور نکتے کو دیکھ لیتے ہیں۔

اقبال جیسے ایک بڑے شاعر کا مقام و مرتبہ اور اُس کے فن کی قدر و منزلت کا تعین اُن تصورات کی تشکیل اور سوالات کے جوابات پر منحصر ہوتا ہے جو اِس جہانِ رنگ و بو میں انسان کی حیثیت اور کائنات اور خالقِ کائنات سے اُس کے رشتے کی بابت تخلیقی سطح پر اس کے یہاں اظہار پاتے ہیں۔ یہ سوالات اُس شاعر کے یہاں انسانی وجود اور اس کی روح کے رشتے، کائنات میں اس کی زندگی کی معنویت اور اس کی تقدیر کی نوعیت اور حقیقت کا تعین کرتے ہیں۔ چوں کہ ہر بڑا شاعر اپنا ایک تہذیبی سیاق رکھتا ہے، اس لیے اُس کے فن کی صورت گری کرنے والے تصورات وسوالات اسی سیاق میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے عہد تک تہذیب کے سفر، اسے پیش آنے والے حالات اور آئندہ کے امکانات کا نقشہ بھی اسی سیاق میں ترتیب پاتا اور اسی سے اپنے لیے معنی اخذ کرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسی معنویت کے تناظر میں شاعر کے پیش کردہ تصورات وسوالات اس کی تہذیب کو ایک نئے تاریخی تناظر میں استحکام فراہم کرتے ہیں اور اس کی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بادی النظر میں ان تصورات اور سوالات کا متن شاعر کے تخلیقی بیانیے میں سامنے

آ تا ہے، یعنی وہ بہ ظاہر انفرادی شعور و احساس کا زائیدہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری انفرادیت کے باوجود بڑے شاعر کی آواز کو محض ایک ذاتی یا شخصی کلامیہ نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اُس کے تخلیقی بیانیے کے پس منظر میں روحِ عصر اور تہذیبی ضمیر کی گونج بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ جن تصورات کی تشکیل اور جن سوالات کے جوابات کی جستجو کرتا ہے، وہ دراصل اُس کی تہذیب کی فی نفسہٖ نقش گری کا وہ عمل ہے جو ایک زمانی دائرے میں اُس کے لیے سامانِ بقا کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بنیادی اصولوں، معیارات، حقائق اور ضوابط کے حوالے سے تو بے شک تبدل کا کوئی نشان نہیں ابھرتا، لیکن دیکھا گیا ہے کہ تہذیبوں پر گزرنے والے مختلف زمانوں میں یہ عمل نہ صرف یہ کہ اپنی بقا کے مختلف مراحل میں صوری و معنوی تغیرات سے ہم کنار ہوتا رہتا ہے، بلکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس کا لحن، اسلوب اور منہاج بھی کسی حد تک بدل جاتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ و مطالعہ فارسی شاعری میں سعدی، رومی، جامی، عراقی اور حافظ کے کلام میں اور اُدھر انگریزی میں چوسر، شیکسپیئر، ملٹن، جون ڈن، ورڈز ورتھ، بائرن، ییٹس، براؤننگ اور ایلیٹ وغیرہم کے تخلیقی بیانیے میں صراحت سے کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے مطالعے کے لیے اردو کی ایسی ہائر آرکی میں جن شاعروں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا ان میں اب تک آخری بڑا شاعر اقبال ہے۔

اب یوں تو اصول کی بات یہ ہے کہ ایک بڑے شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن کو کشادہ اور غیر متعصب رکھنا ضروری ہوتا ہے، تاکہ اُس کے خیالات یا نکاتِ سخن ذرا سہولت کے ساتھ اور وسیع تناظر میں روشن ہوسکیں، لیکن اقبال کے سلسلے میں یہ ضرورت کچھ سوا ہوجاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ پہلے ہی سے بہت سے سابقے اور لاحقے جوڑ لیے گئے ہیں، مثلاً حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مصورِ قوم، روایت و تہذیب کا نقیب، انسانی اقدار کا علم بردار، مفکرِ اسلام، ترجمانِ حقیقت، مردِ خود آگاہ، پیغمبرِ حیات وغیرہ۔ اِدھر آپ اقبال کا نام لیجیے، اور اُدھر یہ سابقے لاحقے آپ کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ہماری تنقید نے ان سب کو اس طرح اور اتنی بار دُہرایا ہے کہ اب یہ اُن کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ بات صرف یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔

مسئلہ اس کے بعد یہ پیش آتا ہے کہ ان عنوانات کے تحت اقبال پر جو مطالعات مرتب کیے جاتے ہیں، وہ حتمی اور فیصلہ کن بیانات سے لبالب چھلکتے ہوئے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں حوالوں اور مثالوں کا انبار بھی ہوتا ہے۔ بار بار کے دیے گئے حوالوں اور دہرائی گئی مثالوں کو ان کے معروف اور مروّجہ سیاق و سباق سے نکال کر نئے تناظر میں رکھنا اور نئی جہت اور نئے مفہوم کا تعین کرنا سہل نہیں ہوتا، لیکن اگر آپ اقبال جیسے شاعر کو معمول کے ڈھرے سے ہٹ کر دیکھنا، پڑھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ اپنا context خود بنائیں اور اس کے توسط سے مطالعے کا نیا پیراڈائم قائم کریں۔

وہ عنوانات اور حوالے جن کا ذکر سطورِ گزشتہ میں کیا گیا، مطالعۂ اقبال کے ضمن میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم اگر کچھ اور پہلوؤں کو بھی ہم پیشِ نظر رکھیں تو اپنے مؤقف کو زیادہ محکم طور پر سامنے لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے سیاسی تصورات کو دیکھ لیجیے۔ ویسے تو اس موضوع پر اتنا کام نہیں ہوا جتنا فکرِ اقبال کے دوسرے عنوانات پر ہوا ہے، اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنے سیاسی افکار کسی تصنیف، رسالے یا خطبے کی صورت میں یک جا اور جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیے ہیں۔ تاہم اُن کے یہاں نظم و نثر میں یہ موضوع بار بار ابھرتا ضرور رہا ہے۔ ظاہر ہے، اس کا سبب فرد سے لے کر عالمی سطح تک انسانی زندگی کا وہ منظرنامہ تھا جس میں اقبال کے شعور نے آنکھ کھولی اور حالات و حقائق کا مشاہدہ کیا۔ اقبال کی امنگوں کا مرکز مشرق تھا، لیکن اُس کا زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مغرب کی برتری ہر میدان میں تسلیم کی جا چکی تھی۔ چناں چہ ہمارے یہاں اقبال کے سیاسی تصورات کا مطالعہ مغربی افکار کی روشنی میں کرنے کا رُجحان عام رہا ہے۔ افلاطون، ارسطو، کانٹ اور ہابز وغیرہم کے تناظر میں اقبال کے سیاسی نظریات کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ تمام تر بے مصرف تو چلیے نہیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ، بلکہ اُن کے مقابلے میں اگر ہم غزالی، رازی اور ابنِ خلدون اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت کے تناظر میں اقبال کے سیاسی تصورات اور رجحانات کا جائزہ لیں تو کہیں بہتر سطح کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ نظر اور طریقِ کار اقبال کی سیاسی فکر کو اس کے ملی اور قومی سروکار کے ساتھ صراحت سے اجاگر کر سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اقبال نے مغرب کا مطالعہ بہت انہماک سے کیا تھا، اس کے نمائندہ اہلِ دانش و بصیرت کو توجہ سے پڑھا تھا اور ممکن ہے کسی سطح پر کوئی اثر بھی قبول کیا ہو، لیکن اُن کے یہاں یہ معاملہ سیاسی حقائق کی تفہیم اور سماجی و گروہی حالات کے تحلیل و تجزیے کی حد تک تھا۔ اس نے اقبال کے یہاں مغرب کی قبولیت کی راہ قطعاً ہموار نہیں کی تھی۔ مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی و سماجی مظاہر و مسائل پر اقبال کی گہری نظر تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ مغرب کے بلند اور روشن میناروں کی بنیادوں میں وہ تموج خیز لہریں پیدا ہو چکی ہیں جو بالآخر تہذیب کے اخلاقی و روحانی زوال و انہدام کا جواز بنتی ہیں۔ اس کا دوسرا اہم سبب یہ بھی تھا کہ مدینے کی فلاحی ریاست کے انتظام و انصرام نے یہ بات اقبال کے دل میں بٹھا دی تھی کہ کوئی بھی نظامِ سیاست و مملکت کسی ملک و قوم کے لیے اس وقت تک فلاح و بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا، جب تک کہ اُس کا ڈھانچا مضبوط اخلاقی و روحانی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ اقبال نے اپنے خیالات و افکار کو قدیم مسلمان صوفیا اور حکما کا تکملہ، بلکہ تفسیر کہا ہے۔ ان سب حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے، ایسا کس وجہ سے ہوا؟ اصل میں یہ ہوا سیاست اور اخلاق کے باہمی ناگزیر رشتے کے شعور کی وجہ سے۔ اس رشتے کی نوعیت اور حقیقت کا ادراک اقبال کو سیرتِ رسول ﷺ، شعائرِ دین اور تاریخِ اسلام سے حاصل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا سیاسی شعور مغرب کا نکتہ چیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے یہاں کوئی اشتباہ یا ابہام نظر نہیں آتا۔ وہ صاف انداز میں اور پوری قطعیت سے کہتے ہیں:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دوسری طرف اقبال اپنی روایت و تہذیب کا وہ شعور بھی رکھتے ہیں جو انھیں اپنے انسانی (اور بالخصوص بحیثیت مسلمان) مقام و منصب کی ماہیت سے بخوبی آگاہ کرتا ہے۔ چناں چہ وہ

اپنے یہاں اختیار و اقتدار کی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

سروری در دینِ ما خدمت گری ست
عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست
در ہجومِ کار ہاے ملک و دیں
با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس
باطنِ دینِ نبی این است و بس

ساتھ ہی جب وہ مشرق و مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

تو یہ اُس شعور کا اظہار ہے جو اپنی دینی روایت نے اُن کے اندر پیدا کیا ہے۔ ادراک کی یہ سطح انھیں اصل میں اُس فکر و نظر کے تحت حاصل ہوئی ہے جس نے آپ d کے کردار اور آپ ﷺ کے تربیت یافتہ خلفاے راشدین کے حکومتی ادوار کو مطالعے نہیں تجربے کے طور پر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ توجہ سے پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ 'خاص ہے ترکیب میں.....'' والا مصرع اصل میں درود و سلام کا لہجہ رکھتا ہے۔ یہ نعت ہی کا تو فیض ہے جو اقبال کے یہاں اِس رُخ سے رونما ہوتا ہے اور اُن کے فکر و سخن کی معنویت کا سیاق متعین کرتا ہے۔

یہ بات ذرا طویل ہوگئی، لیکن فکرِ اقبال کی اس جہت کو ذرا تفصیل سے دیکھنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ بنیادی پہلو جو اُن کے فکر و نظر کو ترتیب دیتا ہے، اپنے طول و عرض میں

سامنے آ جائے۔ اس کے بعد اقبال کے دوسرے افکار و تصورات کو اجمالی طور پر دیکھتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ چناں چہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے۔ یہاں ہم اُن کے چند ایک بڑے تصورات پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنے نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عقل و عشق اقبال کے نظامِ خیال کے بہت بنیادی استعارے ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں انسانی تگ و تاز کی ساری معنویت کا انحصار اقبال کے نزدیک اس امر پر ہے کہ اُس کے مرکز میں عشق کارفرما ہو۔ مرکز کا یہ اصول بھی اقبال نے کہیں اور سے نہیں طواف میں مرکز کی معنویت سے لیا ہے۔ چناں چہ عشق اقبال کے یہاں ایمان کے درجے میں آ جاتا ہے، یعنی یقین اور وابستگی کی ایک غیر مشروط اور کامل حالت۔ اب اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے، یعنی بنیاد عشق پر نہیں ہے تو وہ اقبال کے یہاں اوّل تو سراسر منفی شے ہے اور اگر منفی نہیں تو کم سے کم لایعنی ضرور ہے۔ مثال کے طور پر ذرا یہ اشعار دیکھ لیجیے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ﷺ عقل تمام بولہب

اب دیکھیے، عشق خواہ آتشِ نمرود میں کود رہا ہو، مسلمان ہونے کی علامت ہو یا سر بسر مصطفیٰ ﷺ ہو، مراد یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق دراصل خیرِ کامل ہے۔ وجہ یہ کہ اس کی نسبت کلیتًا آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر ناقدین اس نوع کے

اشعار کو اقبال کے عشقِ رسول ﷺ سے موسوم کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ''عشق تمام مصطفیٰ ﷺ...'' بجا کہ عشقِ رسول ﷺ کا اظہار ہے، اور اس سے بھی انکار کفر کے مصداق ہے کہ ایک صاحبِ ایماں کے لیے عشقِ رسول ﷺ دین و دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔

اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اگر ایک سوال پر بھی غور کرلیا جائے تو کیا مضائقہ ہے، وہ یہ کہ اقبال کے یہاں فکری تشکیلات کا ماخذ بننے والا یہ عشق کیا وہی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے، جسے ہم عشق کے عنوان سے اردو شاعری، بلکہ دنیا کی ساری شاعری میں پڑھتے آئے ہیں؟ سوال ذرا بڑا ہے، لیکن جملہ تفصیلات سے حذر کرتے ہوئے ایک اصولی، سادہ اور مختصر جواب سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ لہٰذا جواب یہ ہے کہ قطعاً نہیں۔ یہ عشق فی الاصل ایمانِ کامل کا مجمل اظہار ہے، اور اقبال کے یہاں یہ ایمان پیدا ہوا ہے شعائرِ اسلام کی جامع تفہیم اور تاریخِ انسانی کے اس گہرے ادراک سے کہ آپ ﷺ تمام جہانوں، سب زمینوں اور سارے زمانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ سے پہلے کی ارضی تاریخ آپ ﷺ کے بعد کے زمانی دائرے سے مل کر کونیاتی امر کی تکمیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے— اور اُس وقت جب بندۂ مومن، مردِ آگاہ کو تکوینِ الٰہیہ کا شعور القا ہو جائے تب اسے یہ ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے ''عشق تمام مصطفیٰ ﷺ...'' یا ''عشق خدا کا رسول...'' دراصل مدحِ رسولِ کریم ﷺ ہے، یعنی نعت کا قرینہ ہے۔ یہ قرینہ اسی بندۂ مومن کو عطا ہوتا ہے جس کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اب سوال یہ ہے کہ وہ انسان جسے اقبال نے بندۂ مومن، مردِ آفاقی، مردِ آگاہ اور مسلمان کہا ہے، اس شعور و ادراک کی منزل کو تو رحمتِ الٰہی کی ودیعت سے حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس حقیقتِ حقہ کو وہ خود بھی کسی کسوٹی پر جانتا پرکھتا ہے، یا محض جو اُسے حاصل ہو جائے اُس پر اکتفا کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اس کا جواب ملتا ہے ہمیں کلامِ اقبال میں اُن اشعار سے جو عہدِ حاضر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ 'عہدِ حاضر' اقبال کے یہاں ایک استعارے اور ایک اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔ چناں چہ یہ وہ تناظر ہے جس میں بندۂ مومن اپنے عہد کے حقائق اور تجربات کے رُو بہ رو اپنے ایمان کی تصدیق اور استحکام کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ کس طرح گزرتا ہے اور اس کے بعد کن نتائج تک پہنچتا ہے، دیکھیے:

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم
بنارِ او چہ بے پروا نشستم

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل[d]

اقبال کے افکار و تصورات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حوالے اور مثالیں درکار ہوں تو اور بھی بہت کچھ نہایت آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مسئلہ مگر یہ ہے کہ بات طول کھینچتی رہے گی۔ یوں بھی اوراقِ گزشتہ میں جو چند نکات پیش کیے گئے اور جو مثالیں درج کی گئیں، وہ ہماری بات کی وضاحت اور مؤقف کی تائید و استحکام کے لیے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں فی الوقت افکارِ اقبال کا احاطہ و تجزیہ مقصود بھی نہیں ہے۔ اصل میں وہ جو ایک بات اقبال کی نعت کے حوالے سے کہی گئی تھی، ہمیں تو صرف اُس کی تصدیق کے لیے اقبال کے یہاں سے نعت کے فکری و اسلوبیاتی تناظر میں کچھ نکات اور اشارے حاصل کرنا مقصود تھا۔ وہ کام کیا جاچکا ہے، سو اب ہمیں مزید حوالوں کی ضرورت نہیں ہے۔

چناں چہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کی نعت اپنی فکر اور اسلوب دونوں لحاظ سے اردو نعت کی شعری روایت میں اسی طرح انفرادی حیثیت کی حامل ہے جس طرح اقبال کی شاعری ہماری پوری شعری روایت میں۔ گفتگو کے اس اختتامی مرحلے پر ہمیں یہ بات بھی فیصلہ کن طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اقبال کی نعت اپنی یگانگت اور انفرادیت کا ایک اور بہت اہم حوالہ یہ رکھتی ہے کہ اقبال نے جس طرح نعت کی موضوعاتی وسعت کو کائناتی سطح تک پھیلایا اور اس کی لے کو سوزِ دروں اور جذبِ باطن سے ہم آہنگ کیا ہے، اسی طرح انھوں نے نعت کی صنفی اور ہیئتی قیود کو بھی کراں تا بہ کراں کشادہ کیا ہے کہ اُس میں وجود و شہود، زمین و زماں، شاہد و مشہود اور حضوری و سپردگی کے تصورات سے تجربات تک تہ در تہ عناصر مل کر ایک ایسا

کلامیہ تشکیل دیتے ہیں کہ جو کشف والہام کی سطح کو پہنچا ہوا معجزۂ فن بن جاتا ہے۔فن کی یہ نمود بھلا کیوں کر ایک روایتی پیرائے میں معرضِ بیاں میں آسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں رواں دواں نظم کے کسی ایک مرحلے پر نعت کا ایک شعر آتا ہے اور نظم کی پوری کیفیت و معنویت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔اسی لیے اقبال نے مروّجہ سانچے میں نعتیہ اشعار پیش نہیں کیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں، دو ایک شعر یا چند ایک مصرعے نظم کے مکمل سلسلۂ خیال کو حضوری کے تجربے سے ہم کنار کر سکتے ہیں، پورے کلام کو نعت کے اسلوب میں ڈھال سکتے ہیں اور سارے فکری تصورات کو نعت کی تحویل میں دے سکتے ہیں۔فن کی یہی نمود شعر و فکرِ اقبال کی بلند اقبالی کا جواز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا شے ہے جو اقبال کے حرفِ سخن میں شامل ہوتی ہے اور اس کی تاثیر کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سوال اس مقام پر بہت سادگی سے اور بہت سرسری انداز میں پوچھ لیا گیا ہے، لیکن یہ بہت بنیادی نوعیت کا استفسار ہے۔صرف اس لیے نہیں کہ اس کلید سے تفہیمِ اقبال کا نیا در کھل سکتا ہے، وہ تو خیر کھل ہی جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے ہند اسلامی ادب و شعر کی وہ جہت بھی آشکارا ہوتی ہے جو بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ ملک و قوم پوری ملتِ اسلامیہ کے شعور و احساس کو ایک مشترک مرکز سے جوڑ دیتی ہے۔اقبال کی طرزِ سخن میں شامل ہونے والی وہ شے ہے، حجازی لے۔ یہاں حجازی لے سے مراد ہے آنحضورﷺ سے نسبت و تعلق کا وہ اظہار جو زمانوں اور زمینوں کے تعینات سے ماورا کرتے ہوئے صرف شاعر کو ہی نہیں، بلکہ اُس کے قاری کو بھی سر بہ سر حضوری کی بے پایاں اور وجد آفریں سرشاری سے ہم کنار کرتا ہے۔تبھی تو اقبال نے افتخارِ جاں کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

عجمی خم ہے تو کیا ، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ، لے تو حجازی ہے مری

یہی وہ لے ہے جو کلامِ اقبال میں آثار و افکار سے لے کر اسلوبیات و جمالیات تک تخلیقِ فن کے پورے منظرنامے میں برقی رَو کی طرح زندگی کی وہ حرارت جگاتی ہے جو شعور و احساس کی تشکیل و تعبیر اور اظہار و ابلاغ کو معجزۂ فن بنا دیتی ہے۔ یہی لے اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتی ہے کہ اقبال کے یہاں حرفِ نعت محض رسمِ محبت و عقیدت کا مظہر نہیں ہے،

بلکہ یہ اُس مرکز سے رشتے کا اظہار ہے جسے اقبال نے عشق کہا ہے، جو انسان کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتا ہے، اُس کی رگوں میں خون کی گردش اسی عشق کی قوت پر منحصر ہے، اور یہی ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی اس محیط و بسیط کائنات میں انسان کے وجود کو بلند رتبہ بناتی ہے۔ اس شعور کا اظہار اقبال کے کلام میں جا بہ جا ہوتا ہے اور اُن کیفیات و علائم کے ساتھ کہ جو اُن کے فن کی سطح اور سخن کی معنویت کے دائرے کو کائنات گیر بنا دیتے ہیں۔ لاریب، یہ صرف اور صرف حرفِ نعت کا فیضان ہے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کی ساری شاعری اسی حرفِ نعت کی دولتِ پرمایہ سے مالا مال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری ہند اسلامی تہذیب اور اُس کی ادبی و فکری روایت میں جس حجازی لے کو شامل کیا اُس نے اردو کی شعری روایت کے کیف و کم کو اُس تغیر سے آشنا کیا کہ وہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اسی کیف و کم کا اثر ہے کہ اقبال کی شاعری سر بہ سر ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئی کہ جس نے اُن کے حرفِ شعر کو حرفِ نعت کی اُس معراج تک پہنچا دیا کہ جہاں اُن کے بڑے بڑے افکار و تصورات کی تشکیل نعت کے حرفِ باریاب سے ہوئی۔ یہ اسی جوہر کی نمود ہے کہ اقبال کی شاعری تاریخ و تہذیب کے حقائق و تجربات اور مذہب و فلسفہ کے تصورات، اشارات اور کنایات کو اس طرح اپنے اندر سمو لیتی ہے کہ وہ مجرد نہیں رہتے، بلکہ فکرِ محسوس کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ یوں وہ بہ یک وقت قلب و نظر دونوں کے لیے بالیدگی اور روشنی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن

کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر

اللہ کی وحدانیت کا اعلان کرنے والے انسانی معاشرے میں اللہ کے قانون کے عملی نفاذ کا نمونہ دکھانے والے نفوسِ قدسیہ صرف انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔حضور اکرم جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر اللہ کا دین مکمل ہوگیا ہے اس لیے رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے کیوں کہ انسانی معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی عمل کی تمام حدود نبیِ آخر الزمان حضرت محمد ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعے متعین فرمادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی فکری تحریروں اور تخلیقی نقوش میں توحید و رسالت پر ایمان ہی کو ملتِ اسلامیہ کی اساس قرار دیا ہے۔

اقبال کا عرفانِ رسالت شش ابعادی ہے:

(الف) منصبِ رسالت کی ایمانی سطح پر قبولیت۔

(ب) ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے عشق کی سطح کا تعلق۔

(ج) جذبۂ خود سپردگی کے لحاظ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قلبی تعلق کا شعری اظہار

(د) پیغامِ رسالت کو عام کرنے کا جذبہ۔

(ہ) بھٹکے ہوئے (مسلمان) راہی کو سوے حرم لے جانے کی آرزو کا مسلسل اظہار اور ان تھک قلمی کاوش—— اور

(و) مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی سعی کہ اللہ کے بعد صرف اور صرف حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی کائنات کی ''مرکزی مطاع ذات'' ہے۔ ان ﷺ سے قبل [کیوں

کہ سابق انبیائے کرام کا عہدِ نبوت گزر چکا ہے] اور نہ ان ﷺ کے بعد کوئی ایسی ہستی ہے جس کو ''مطاع'' [لائقِ اطاعت] تسلیم کرکے اس کی محبت اختیار کی جائے یا اس کی اتباع کی جائے۔ نبی علیہ السلام کے بعد آپ کی اُمت میں جو بھی تقویٰ اختیار کرے اور آپ ﷺ کی اتباع کرے وہ لائقِ تعظیم وتکریم ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است☆۱

(حضورِ اکرم ﷺ کی ذات تک خود کو پہنچادو [تاکہ مسلمان بن سکو۔ کیوں کہ] اگر تم ان تک نہیں پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ باقی دنیا میں تو صرف کفر ہی ہے۔)

اقبال فرماتے ہیں:

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شان نبی نتواں شدن☆۲

(تو [اے مخاطب] کسی نہ کسی طرح خدا کا تو منکر ہوسکتا ہے لیکن رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کا منکر نہیں ہوسکتا۔)

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے Constance E. Padwick کی کتاب Muslim Devotions سے ایک اقتباس دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین بھی جانتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی محبت ہی میں اُمتِ مسلمہ کی قوت کا راز پنہاں ہے:

> جس کسی کو مسلمانوں کی حُبِ رسول ﷺ کی خبر نہ ہو، وہ اسلام کی قوت کا احساس کر ہی نہیں سکتا۔ یہ جذبۂ حُب ایسا شدید ہے کہ اسے تصوف کی گرمیِ نفس کے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ ذاتِ رسول ﷺ سے محبت مسلمانوں کی وحدت اور اتحاد کا ایک بڑا موجب ہے۔☆۳

حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے اقبال کا عشق جدید وقدیم فکری زاویوں سے روشناس لوگوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور مبنی براخلاص بھی۔ شدتِ حُبِ رسول ﷺ کا اظہار ان کے متعدد اشعار میں جا بہ جا ملتا ہے، مثلاً:

تب و تابِ بت بتکدۂ عجم نرسد بہ سوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربی ، گرفت حجازِ من☆۴

(غیر عرب دنیا کی چمک دمک میرے قلبی سوز و گداز تک نہیں پہنچتی، کیوں کہ میرے حجاز یعنی دل کو میرے آقا جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی نگاہ میں اپنا کرلیا ہے۔) [اب مجھے آپ ﷺ کی تعلیمات کے سوا سب ہیچ نظر آتا ہے۔]

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یارسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من☆۵

(یارسول اللہ ﷺ! میں تو اللہ سے بھی آپ ﷺ کے توسط سے بات کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میری آنکھ سے پوشیدہ ہے اور آپ ﷺ میرے سامنے ظاہر ہیں۔)

غالبًا اسی شعر کی وضاحت ان کے ایک مکتوب میں ملتی ہے جو انھوں نے خان نیاز الدین خان کو لکھا تھا:

> میرا عقیدہ ہے کہ نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہوسکتے ہیں جس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم ہوا کرتے تھے، لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔☆۶

یہی وجہ ہے کہ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کے وجود کا انکار ممکن ہے، لیکن رسول ﷺ کی ذات کا انکار ممکن نہیں ہے۔

اقبال پوری قوم کو حُبِ رسول ﷺ اور اتباعِ رسول کی دعوت دیتے ہیں۔اقبال کے شعری سرمائے میں جہاں جہاں حضور نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ذکرِ مبارک آیا ہے اس میں عمومیت سے زیادہ محرکاتِ عشق کا اختصاصی پہلو جھلکتا ہے۔اقبال کی فکری دنیا میں جتنے نکات منصبِ رسالت کی تفہیم کے ضمن میں منصۂ شہود پر آئے وہ شاید ہی کسی اور شاعر یا مسلمان مفکر کی تحریروں میں آئے ہوں، مثلاً اپنی کتاب ''جاوید نامہ'' میں وہ حضرت شیخ جلال الدین رومی m سے رسالت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور پھر ان کے جوابات مثنوی کے اشعار میں موتیوں کی طرح پروتے ہیں:

گفت اقوام و ملل آیات اوست
عصر ہاے ما ز مخلوقات اوست
از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت
ما ہمہ مانند حاصل او چو کشت
پاک سازد استخوان و ریشہ را
بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
آفتابش را ، زوالے نیست نیست
منکرِ او را کمالے نیست نیست ☆۷

(میں نے رومی سے درخواست کی کہ مجھے پیغمبری کے بارے میں آگاہ فرمائیے تو انھوں نے فرمایا، قومیں اور ملتیں پیغمبری کی ہی نشانیاں ہیں۔ یعنی پیغمبر اپنی تعلیمات کے ذریعے ایک پیغام رساں قوم تیار کرتا ہے۔ ہمارے زمانے بھی پیغمبر کے دیے ہوئے پیغام کی پیداوار ہیں [کیوں کہ] پیغمبر، زمانے کو اپنی تعلیمات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ پیغمبر کے دم سے اینٹ، پتھر بھی گویائی حاصل کر لیتے ہیں۔ پیغمبر کی حیثیت کھیت کی سی ہے اور ہم سب اس کا حاصل ہیں۔ پیغمبر، ہڈیوں اور ریشوں کو پاک کر کے، فکرِانسانی کو شہپرِ جبریل کی قوت عطا کر دیتا ہے۔اس (پیغمبر) کی تعلیمات کے سورج کو زوال نہیں، [ہرگز] نہیں ہے۔) اس کی تعلیمات سے منہ موڑنے والے کو کبھی کمال حاصل نہیں ہوسکتا، ہرگز نہیں ہوسکتا۔

''پیامِ مشرق'' میں بھی اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کے فیضان سے آشنا کرنے کے لیے واشگاف الفاظ میں کہا:

امتے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او
واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم ☆۸

([ہم مسلمان ایک اُمت تھے جو] حضورِ اکرم ﷺ کی حکمت آمیز تعلیمات کے نتیجے میں رازِ تقدیر سے آشنا ہو کر عمل کی وادیوں کو سر کرنے لگے تھے۔)

مقامِ رسالت، عظمتِ رسول ﷺ اور حُبِ رسول ﷺ کے تقاضوں سے آشنا

ہوکر ہی اقبال نے اپنی شاعری میں ''رسالت'' کے حوالے سے بڑے فکر انگیز نکات پیش کیے ہیں، مثلاً رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی معراج کا پیغام اور معراج کا منشا جتنے بھرپور انداز میں اقبال کے درجِ ذیل شعر میں جلوہ آرا ہوا ہے، وہ اسلامی ادب میں نایاب چیز ہے:

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں [☆۹]

یا مقامِ رسالت مآب کے اظہار کی یہ کوشش:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں ، وہی یٰسں ، وہی طٰہٰ [☆۱۰]

اقبال زندگی بھر بھٹکے ہوئے راہی کو سوئے حرم لے جانے کی آرزو کرتے رہے۔ درجِ ذیل قطعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

بہ منزل کوش مانند مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ ﷺ رو [☆۱۱]

(اے مسلمان تو منزل کی طرف اسی طرح بڑھتا رہ جس طرح نیا چاند اپنی تکمیل کے منازل بلا رکاوٹ طے کرتا رہتا ہے۔تو بھی چاند کی طرح اس نیلی فضا میں ہر لمحہ بڑھتا رہ۔ اگر تو اس زمانے میں اپنا کوئی مقام چاہتا ہے تو اپنے دل کا تعلق حق سے جوڑ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے راستے پر چل پڑ۔)

مسلمانوں کو نبیِ کریم ﷺ کی اتباع کی ترغیب دیتے ہیں تو زور پیدا کرنے کے لیے انھیں تنبیہ بھی کرتے ہیں کہ اگر یہ راہ اختیار کرنا تمھارے بس میں نہیں تو دین کے راستے سے ہٹ جاؤ اور کافر ہو کر مر جاؤ۔

کشودم پردہ را از روے تقدیر
مشو نومید و راہِ مصطفیٰ ﷺ گیر
اگر باور نہ داری آنچہ گفتم
زدیں بگریز و مرگِ کافرے میر ☆۱۲

(میں نے تقدیر کے چہرے سے پردہ اٹھا دیا ہے [تقدیر عمل میں پوشیدہ ہے... اے مسلمان! تو زوال و ادبار کے تسلسل سے] مایوس نہ ہو، بس حضور اکرم ﷺ کے راستے اور ان کی لائی ہوئی شریعت پر چلنا شروع کردے، لیکن اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں ہے، تو دین کی راہ سے ہٹ جا اور کافر کی موت مر۔)

ایک اور مقام پر حضورِ رسالت مآب ﷺ کی محبت کے عملی تقاضوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد ولیکن
جہانِ عشق را پروردگار است ☆۱۳

(حضور اکرم ﷺ کی نگاہِ کرم ہوجائے [تیری محبت ان ﷺ کے دربار میں قبول ہوجائے] تو تیری محبت پائیدار [تسلیم کی جاسکتی] ہے۔ ان ﷺ سے عشق کرنے کا معیار یہ ہے کہ انھی ﷺ کا راستہ عملی زندگی میں اپنایا جائے۔ ان کا مقام ''عبدہٗ'' (اس [اللہ] کا بندہ) بتایا گیا ہے، لیکن وہ بندہ عشق کے جہان کا پروردگار ہے۔ جہانِ عشق آپ ﷺ ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔)

اقبال نے بہ حیثیت ''زندہ رود'' حسین بن منصور حلاج سے سوال کیا:

از تو پرسم، گرچہ پرسیدن خطاست
سِرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ ست!

آدمے یا جوہرے اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجود؟☆۱۴

([اے حلاج!] میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ بھی خطا ہے کہ وہ جوہر جس کا نام مصطفیٰ ﷺ ہے، آخر اس کا بھید کیا ہے؟ کیا وہ آدم ہے یا اپنے وجود کے اندر کوئی جوہر۔ جوہر بھی ایسا جو کبھی کبھی وجود میں آتا ہے [جو صرف ان کی ذات میں آشکار ہوا؟])

اس سوال کے جواب میں حضور نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان کا اظہار حسین بن منصور حلاج کی زبان میں اس طرح ہوا:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہمِ تو بالا تر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است
آدم است و ہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیرہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں
عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگِ گراں
عبد دیگر ، عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ ست
ما ہمہ رنگیم ، او بے رنگ و بوست
عبدہٗ با ابتدا بے انتہا ست

عبدہٗ را صبح و شامِ ما کجاست
کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات
عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ ما رمیت[۱۵]☆

(محمد مصطفیٰ ﷺ کے سامنے کائنات بھی پیشانی ٹیکے ہوئے ہے۔ آپ ﷺ نے خود اپنا تعارف 'عبدہٗ' کہہ کر کرایا ہے۔ عبدہٗ تیری سمجھ سے بالاتر ہے، کیوں کہ وہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی۔ اس کا جوہر [مقامی نہیں ہے] نہ عرب سے ہے نہ عجم سے۔ وہ آدم ہونے کے باوجود آدم سے مقدم وجود رکھتا ہے۔ عبدہٗ تقدیروں کا صورت گر ہے [جو اُن ﷺ کا ہوگیا اس کی تقدیر سنور گئی ورنہ تقدیر بگڑ جاتی ہے]۔ اسی عبدہٗ کے اندر انسانی تقدیر کے ویرانے اور آبادیاں پوشیدہ ہیں۔ عبدہٗ روح کو خوشی دینے والا [مومنوں کو جنت کی خوش خبری] بھی ہے اور روح کو چھین لینے والا بھی ہے [کافروں کو عذاب کی وعید سنا کر]۔ عبد اور چیز ہے اور 'عبدہٗ' اور چیز ہے۔ ہم مجسم انتظار ہیں وہ منتظر [جس کا انتظار ہے]۔ عبدہٗ زمانہ ہے اور زمانہ 'عبدہٗ' ہے۔ ہم سب رنگ ہیں وہ رنگ اور خوش بو کا محتاج نہیں ہے۔ عبدہٗ کی ابتدا تو اس کی تخلیق کے عمل سے ہوگئی، لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ عبدہٗ کا زمانہ ہمارے زمانے کی طرح روز و شب کے مرور سے وجود میں نہیں آتا۔ کوئی بھی مخلوق 'عبدہٗ' کے راز سے آگاہ نہیں ہے۔ عبدہٗ دراصل کلمۂ طیب 'لا الٰہ الا اللہ' کا ایک بھید ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کی نفی کا کلمہ ایک تلوار ہے جس کی دھار 'عبدہٗ' ہے۔ اگر تو زیادہ کھل کر بات سننا چاہتا ہے تو سُن 'ہوٗ' [وہی عبدہٗ] ہے۔ [عبد اپنی نفلوں کی کثرت سے اللہ کی صفات کا حامل بن

جاتا ہے۔ یہ ہر بندۂ مومن کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ بندۂ مومن بننے کے لیے آقائے نامدار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع ضروری ہے، اسی بات سے عبدہٗ کا مقام 'ہُو' ہوگا]۔ عبدہٗ کائنات کی حقیقت ہے۔ عبدہٗ کائنات کے اندر کا راز ہے۔ [اے مخاطب!] پہلے دو اشعار کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا اگر عبدہٗ کو قرآن کی آیت 'وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی' [تم نے مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جب پھینکی تھی، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ ۸:۱۷] کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔)

جوہر کی وضاحت کرتے ہوئے معروف مستشرق این میری شمل نے بڑی خوب صورت اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے:

> یہ جو حضرت محمد ﷺ کو 'انسان اور جوہر' کا امتزاج کہا گیا، یہ ابنِ عربی اور الجیلی کی تقلید میں ہے جنھوں نے انسانِ کامل کا نظریہ پیش کیا اور ایسے انسان کی دنیوی اور خدائی صفات بتائی ہیں۔ اب عبدہٗ کی حقیقت پر زور دینے کا مسئلہ۔ قدیم صوفیا کی روایات کے بموجب، مثلاً دیکھیں رسالہ قنبریہ [قشیریہ؟] اور پنجابی شاعر بلھے شاہ کے اشعار، عبدہٗ کے کلمات حضرت محمد ﷺ کی عظیم شان کے مظہر ہیں، کیوں کہ واقعۂ معراج کے بیان میں بھی (۱۷:۱) قرآنِ مجید نے پیغمبر ﷺ کو عبدہٗ (اس کا خاص بندہ) کہاہے۔ واقعۂ اسریٰ میں اور معراج میں چوں کہ آنحضرت ﷺ نے حقائق و معارف کو بے نقاب دیکھا تھا، لہٰذا عبدہٗ بے حد بلند روحانی مقام تھا جو انھیں نصیب ہوا...

مردِ مومن در نسا زد با صفات
مصطفٰی راضی نشد الّا بذات
تا ز مازاغ البصر، گیرد نصیب
بر مقامِ عبدہٗ گردد رقیب[۱۶]☆

(مردِ مومن صفات کے مشاہدے پر قناعت نہیں کرتا، کیوں کہ رہبرِ اعظم حضرت

محمد مصطفیٰ ﷺ نے بھی ذات کے دیدار کے علاوہ کسی نعمت کو نہیں چاہا تھا۔☆[17]

یہاں تک کہ حضورِ اکرم ﷺ نے وہ مقام حاصل کرلیا جسے اللہ نے ’مازاغ البصر و ماطغیٰ‘ (نہ تو آپ ﷺ کی نگاہ میں کجی پیدا ہوئی اور نہ حد سے بڑھی) کہا ہے اور پھر مقامِ عبدہٗ بھی حاصل کرلیا۔ [بندۂ مومن آپ ﷺ کی پیروی میں کامل ہوکر ذاتِ واجب الوجود کے دیدار کی منزل تک پہنچ سکتا ہے]۔)☆[18]

جمالِ ذات کا عاشق ہی جملہ کائنات کا سردار ہوسکتا ہے۔ اس لیے صرف حضورِ اکرم ﷺ ہی کی ذاتِ گرامی تمام عالمین کی سردار ہے۔ یہ بات اشارۃً حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کہی تھی اور اقبال نے ان کا ایک شعر ''جاوید نامہ'' میں نقل کیا ہے:

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را

(جو کوئی [اللہ تعالیٰ] کی ذات کے حسن کا طالب ہوا، وہ ساری کائنات کا سردار ٹھہرا۔)☆[19]

حضور ﷺ ہی وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں اور آپ ﷺ ہی کی ذات میں وہ جوہر ہے جس کی تلاش وجستجو میں بنی نوعِ آدم سرگرداں ہے۔ جس نے اس نور (نورِ مصطفیٰ ﷺ) کے ذریعے اپنی شناخت کرلی۔ اس کی قیمت اسی کے باعث متعین ہوچکی ہے ورنہ اسی نور کی تلاش میں انسان گھومتا پھر رہا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است☆[20]

(جہاں جہاں بھی رنگ وخوش بو کی دنیا تمھیں نظر آرہی ہے، ہر وہ دنیا جس کی خاک سے آرزوئیں جنم لیتی ہیں [جس میں کمال حاصل کرنے کی تڑپ موجود ہے] یا تو

اس کی قیمت نورِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وجہ سے ہے یا وہ دنیا نورِ محمدی ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔)

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃٌ للعالمینی ہم بود[۲۱]☆

(جہاں جہاں بھی دنیا کی رونقیں ہیں وہاں وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفت رحمۃ للعالمینی موجود ہے۔)

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست[۲۲]

(مخلوق، تقدیر اور ہدایت مرحلۂ تخلیق میں پہلے ہیں۔ رحمۃ للعالمینی اس تخلیق کے مرحلے کی انتہا ہے۔)

مقامِ رسالت کے اظہار کے مختلف پیرایے علامہ کی ہر تحریر میں ملتے ہیں۔ ''مثنوی اسرارِ خودی'' میں بڑے مربوط انداز میں لکھتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ ﷺ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ ﷺ است

طورِ موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کم تر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسبِ افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
درشبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم

تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ اَمِ گیتی نزاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او
لطف و قہرِ او سراپا رحمتے
آں بیاراں ایں باعدا رحمتے
آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغام 'لا تثریب' داد
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم
در جہاں مثلِ مے و میناستیم
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت
چوں گلِ صد برگ ما را بوے کیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست
سرِّ مکنونِ دلِ او ما بدیم
نعرہ بے باکانہ زد ، افشا شدیم
شورِ عشقش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

من چہ گویم از تولاّیش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست
نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست ☆۲۳

(حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے۔ ہم مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی آپ ﷺ ہی کے نام سے قائم ہے۔ آپ کے گھر کے غبار کی لہر 'طورِ سینا' ہے۔ آپ ﷺ کا حجرہ مبارک، بیت اللہ کے لیے بھی کعبہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ابد آپ کے اوقات کے مقابلے میں ایک لمحے سے بھی کم وقفہ ہے۔ دراصل آپ ہی کی ذات سے ابد نے بھی ابدیت حاصل کی ہے۔ آپ بوریے پر آرام فرماتے تھے، اس لیے بوریا بھی آپ کے احسان کا ممنون ہے۔ آپ کی اُمت کے پاؤں کے نیچے کسریٰ کا تاج آیا۔ آپ ﷺ نے غارِ حرا میں تنہائی کی راتیں گزاریں۔ آپ ﷺ نے ایک نئی قوم، ایک نیا آئین اور ایک نئی حکومت عطا فرمائی۔ آپ ﷺ نے بہت سی راتیں بغیر نیند گزاریں تاکہ آپ ﷺ کی اُمت تختِ خسروی پر آرام کرے۔ دنیا میں آپ ﷺ نے نئے دستور کا آغاز فرمایا۔ سابقہ قوموں کی مسندِ اقتدار کو آپ ﷺ نے لپیٹ دیا۔ آپ ﷺ نے دین کی چابی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ آپ جیسا سپوت مادرِ گیتی نے بھی نہ جنا۔ [حضرت حسان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا 'و اجمل منك لم تلدالنساء' اور آپ سے زیادہ خوب صورت کسی ماں نے نہیں جنا]۔ آپ ﷺ کی نگاہ میں بلند اور پست سب انسان برابر ہیں۔ آپ ﷺ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ حشر کے دن ہم مسلمانوں کا بھروسا [شفاعت کے لیے] آپ ﷺ ہی کی ذات پر ہوگا۔ دنیا میں بھی آپ ﷺ ہی ہماری کم زوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ آپ ﷺ کا لطف اور قہر، دونوں سراپا رحمت ہیں۔ لطف دوستوں کے لیے اور قہر دشمنوں کے لیے رحمت ہے۔ آپ ﷺ وہ ہیں جنھوں نے دشمنوں پر رحمت کے دروازے کھول دیے۔ فتحِ مکہ کے وقت اپنے جانی دشمنوں سے فرمایا 'آج تم پر کوئی گرفت نہیں' [جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنے بھائیوں کو

معاف فرمایا تھا]۔ ہم بطحا کے ساقی کی آنکھوں سے پی کر مست ہیں۔ ہم دنیا میں شراب اور صراحی کی طرح ہیں۔ آپ ﷺ نے نسل و نسب کے فرق کو یکسر بھسم کر دیا۔ دنیا کے باغ کو اس کوڑے کرکٹ سے پاک فرما دیا۔ سو پتیوں کے پھول کی طرح ہماری خوش بو ایک ہی ہے۔ [کیوں کہ] آپ ﷺ اس نظام کی روح ہیں اور آپ ﷺ ایک ہیں۔ ہم آپ ﷺ کے قلب میں چھپے ہوئے بھید کی طرح تھے۔ جب آپ نے بے باکانہ نعرۂ توحید بلند فرمایا تو ہم ظاہر ہوگئے۔ میری خاموش بانسری میں آپ ﷺ کے عشق کا شور ہے۔ میرے سینے میں سیکڑوں نغمے تڑپ رہے ہیں۔ میں آپ ﷺ کی محبت کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ کیا ہے۔ آپ ﷺ کی جدائی کے خیال سے تو سوکھا ہوا تنا (حنانہ) بھی رونے لگا تھا۔ [المختصر] ساری کائنات کتاب ہے تو اس کا دیباچہ [مغز، جوہر] آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ تمام عوالم غلام ہیں اور آپ ﷺ ہی آقا ہیں۔)

علامہ اقبال نے ''مثنوی رموزِ بے خودی'' میں یہ بتایا ہے کہ ''ملت کے پیکر میں رسالت ہی کی وجہ سے روح پھونکی گئی ہے''، وہ فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

آں کہ شان اوست یہدی من یرید
از رسالت حلقہ گردِ ما کشید

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

زندگی ، قوم از دم او یافت است
ایں سحر از آفتابش تافت است

فرد از حق ملت از وی زندہ است
از شعاعِ مہرِ او تابندہ است[☆۲۴]

(اللہ تعالیٰ نے ہمارا [ملّی] پیکر تیار فرما کر اس میں "رسالتِ محمدیہ ﷺ" کی وجہ سے روح پھونکی۔ رسالت ہی کی وجہ سے بہ حیثیت ملت ہماری پیدائش ہوئی اور رسالت ہی کے طفیل ہمیں دین اور دستورِ حیات میسر آیا۔ وہ [اللہ تعالیٰ] جس کی شان یہ ہے کہ جسے چاہے ہدایت دے، اسی نے ہمارے گرد رسالت کا حلقہ کھینچ دیا۔ ہم اس رسالت ہی کی نسبت سے ایک ملت ہوکر عالمِ انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہیں۔اس قوم کے ہر فرد نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی بہ دولت زندگی پائی ہے اور اس کی صبح کی روشنی آفتابِ رسالت ہی کی عطا کردہ ہے۔)

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرعے موزوں شدیم
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است
از میانِ بحر او خیزیم ما
مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
از رسالت ہم نوا گشتیم ما
ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود
پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است
وحدتِ مسلم ، ز دینِ فطرت است
دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یک جا نیم از احسانِ اوست
تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود
ہستیِ ما با ابد ہمدم شود☆۲۵

(ہم لوگ دامنِ رسالت میں پناہ لینے سے قبل اس طرح تھے جیسے بے آواز حرف۔ پھر رسالت ﷺ کے فیض سے ہم اس طرح آہنگ اور معانی والے بن گئے جیسے بیت کا مصرعِ دل کش ہو۔ ہم مسلمان عددی اعتبار سے لاکھوں ہونے کے باوجود محض رسالت ﷺ کی یہ دولت وحدتِ ملّی میں ضم ہوکر اس طرح ایک ہوگئے کہ ہمارا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی پوری ملتِ اسلامیہ کا حصہ بن گیا۔ ہم مسلمان، رسالت کے سمندر کے درمیان سے موجوں کی طرح اٹھتے ہیں اور بحری موجوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، ایک ہی رہتے ہیں۔ ہم [مسلمان] رسالت کے طفیل ہی ایک آواز ہوگئے۔ ایک دوسرے کے ساتھی بنے اور ہمارے مقاصد میں ہم رنگی پیدا ہوگئی۔ مقصد کی یک رنگی سے افراد کی کثرت، وحدت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور جب یہ وحدت پختگی حاصل کر لیتی ہے تو ''ملت'' وجود میں آجاتی ہے۔ ہر کثرت خود کو زنجیر میں پابند کر لینے سے، وحدت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ مسلمان کی وحدت دینِ فطرت [اسلام] کی یہ دولت قائم ہے۔ ہم [مسلمانوں] نے دینِ فطرت [اسلام] اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہی سیکھا ہے۔ اس طرح ہم نے حق کی راہ میں مشعل روشن کی ہے۔ [ملتِ مسلمہ کے وجود اور اس کی وحدت کا] یہ موتی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کے بحرِ بے کراں سے نکلا ہے۔ ہماری [ذہنی، فکری، عملی اور روحانی] یک جائی بھی انھی ﷺ کے احسانِ عظیم کی مرہونِ منّت ہے۔ جب تک [فکر و خیال و عمل کی] یہ وحدت ہمارے ہاتھ سے نہیں جاتی، ہماری ملت کی زندگی، ابدالآباد تک باقی رہے گی۔)

''مثنوی رموزِ بے خودی'' ہی میں اقبال نے یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ ملت افراد کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی پرورش کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند
ذرۂ بے مایہ ضو گیرد ازو
ہر متاعے ارج می گیرد ازو
دیدۂ او می کشد لب جاں دہد
تا دوئی میرد یکے پیدا شود
رشتہ اش کو بر فلک دارد سرے
پارہ ہاے زندگی را ہم گرے
تازہ اندازِ نظر پیدا کند
گلستاں در دشت و در پیدا کند
از تف او ملتے مثل سپند
بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند
یک شرر می افگند اندر دلش
شعلۂ در گیر میگردد گلش[۲۶]☆

مثنوی کے اس حصے میں پہلے تو اقبال، آدم کی سرگزشت بیان فرماتے ہیں کہ اس نے اپنی عقلِ خام کے ساتھ کیسے کیسے دن دیکھے تھے اور انسانوں کے باہمی میل جول کی کیا کیفیت تھی ، ہم اس سے آگاہ نہیں ہیں۔اس کے بعد فرماتے ہیں:

(یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی پیدا کر دیا جس نے ایک حرف کے ذریعے ایک کتب خانہ لکھوا دیا، یعنی ایک مکمل نظامِ زندگی عطا کر دیا۔ اس [نبی] کی وساطت سے ایک حقیر ذرّہ بھی روشنی حاصل کر لیتا ہے۔ انسان کی ہر متاع [پونجی] ایک نئی قیمت پا لیتی ہے۔ ہر جنس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ نبی کی آنکھ [باطل کو] مار ڈالتی ہے اور اس کے لبوں سے [حق اس طرح جاری ہوتا ہے کہ] بے روح جسموں میں جان پڑ جاتی ہے۔ [یہ اس لیے ہوتا ہے کہ] اس نبی کا تعلق آسمان سے [بذریعۂ وحی] استوار ہوتا ہے۔ [جس کی بہ دولت

وہ] زندگی کے ٹکڑوں [افراد] کو جوڑ دیتا ہے۔ وہ [نبی] انسانوں میں ایک نیا زاویۂ نظر پیدا کردیتا ہے اور [اس طرح زندگی کے بے آب و گیاہ] صحراؤں میں باغ لگا دیتا ہے۔ اس کی عطا کردہ [مقاصد کی] گرمی سے قومِ حرمل کے دانے کی طرح اُچھلنے کودنے اور ہنگامہ برپا کرنے لگتی ہے [اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ راہِ حق میں ہر باطل سے گرمِ ستیز ہوجانے کے لیے تڑپ اُٹھتی ہے]۔ وہ [نبی] قوم کے دل میں ایک چنگاری ڈال کر ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی بہ دولت ملت کے وجود میں ایک شعلہ پیدا ہوجاتا ہے۔)

یہ ہے وہ تصورِ رسالت جس کے طفیل ملتِ اسلامیہ ایک ملتِ واحدہ کے طور پر اُبھری تھی۔ اللہ نے تو مسلمانوں کو ''توحید'' پر ایمان کے بعد صرف اور صرف ''رسالت'' پر ایمان لانے کا حکم دیا تھا اور حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر نبوت کے خاتمے کا اعلان فرما کر اس بات کا امکان ہی ختم فرما دیا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے بعد کوئی فرد یا گروہ اس بات کا دعویٰ کرے کہ تکمیلِ دینِ اسلام کے بعد بھی اس کی ذات اسی طرح واجب التعظیم اور واجب الاتباع ہے جیسے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی اکثریت نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا کے بعد کسی بھی بزرگ کو صرف اور صرف اتباعِ رسول ﷺ کی بنیاد پر بزرگ جانا۔ نہ تو انھیں بذاتہٖ واجب الاتباع جانا اور نہ معصوم عن الخطا قرار دیا۔ ہاں حضورِ اکرم ﷺ کے تمام مومن اقربا اور صحابہ کرام و ازواجِ مطہرات، سب کے سب محفوظ عن الخطا تسلیم کیے گئے۔

اقبال نے یہ نکتہ اپنے ایک خطبے میں واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''اسلام کی آفرینش'' عقلِ استقرائی کی آفرینش ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے، کیوں کہ اس نے اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ اس میں یہ ادراک گہرے طور پر موجود ہے کہ زندگی کو ہمیشہ بیساکھیوں کے سہارے نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کہ ایک مکمل خودشعوری حاصل کرنے کے لیے انسان کو بالآخر اس کے اپنے وسائل کی طرف موڑ دینا چاہیے۔ اسلام میں پاپائیت اور

موروثیت کا خاتمہ، قرآن میں استدلال اور عقل پر مسلسل اصرار اور اس
کا بار بار فطرت اور تاریخ کے مطالعے کو انسانی علم کا ذریعہ قرار دینا،
ان سب کا تصورِ ختمِ نبوت کے مختلف پہلوؤں سے گہرا تعلق ہے۔
انسانی فکر کی تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت
سرچشمے کا دعویٰ کرتا ہے، ختم ہو چکا ہے[۲۷]

پاپائیت اور موروثیت کے خاتمے کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلفاے راشدین رضوان اللہ علیہم نے اپنے بعد اپنی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ بنانے کا اعلان نہیں کیا۔ حضرتِ حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد بحالتِ مجبوری خلافت کا عہدہ سنبھالنے کی ضرورت پیش آئی، لیکن بعد میں انھوں نے بھی شاید ملوکیت کے آغاز کا خطرہ بھانپ کر خود کو خلافت کی ذمے داریوں سے علاحدہ کر لیا۔

انسانی فکر کی تاریخ میں اب ہر قسم کا شخصی تحکم جو کسی مافوق الفطرت
سرچشمے کا دعویٰ کرتا ہے، ختم ہو چکا ہے۔

علامہ اقبال کی اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں جاننا ہوگا کہ اقبال دینِ اسلام کے اس version کو تسلیم کرتے ہیں جس میں عربیت غالب ہو۔ عجمی نظریات کے ضمن میں اقبال کے بے شمار تحفظات ہیں۔ اسی لیے وہ برملا کہتے ہیں:

تب و تابِ بت کدۂ عجم نرسد بہ سوز و گدازِ من
کہ بہ یک نگاہِ محمدؐ عربی گرفت حجازِ من[۲۸]☆

(غیر عرب بُت کدہ کی چمک دمک میرے سوز و گداز کو نہیں پہنچتی، یعنی غیر عربی یا غیر اسلامی تصورات و نظریات میری طبیعت کو راس نہیں ہیں، [کیوں کہ] میرے دل پر حضورِ اکرم ﷺ کی نگاہِ لطف و کرم کا اثر بہت گہرا ہو چکا ہے۔ گویا آپ کی تعلیمات کے ارتکاز کی وجہ سے میرا دل ہی حجاز بن گیا ہے)۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اقبال کے درجِ بالا شعر کی بہت اچھی تشریح کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ من و عن یہاں نقل کر دی جائے:

تب و تابِ بت کدۂ عجم کنایہ ہے غیر اسلامی تصورات سے، محمدِ عربی ﷺ کنایہ ہے اسلامی تعلیمات سے اور حجازِ من کنایہ ہے قلبِ عاشق سے۔ کہتے ہیں کہ سرکارِ مدینہ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات نے آنِ واحد میں میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کرلیا ہے کہ اب عجمی تصورات (غیر اسلامی خیالات) میری نگاہ میں بالکل بے قیمت ہو کر رہ گئے ہیں یعنی عاشقِ رسول ﷺ غیر اسلامی خیالات سے متأثر نہیں ہوسکتا۔[۲۹]☆

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے عام مسلمان کو حضورِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین کی حدود ہی میں رہنے کا مشورہ دیا:

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو[۳۰]☆

[آئین و احکامات کی سختیوں کی شکایت مت کرو۔ حضورِ اکرم ﷺ کی متعین کردہ حدودِ شریعت سے کبھی اپنا قدم باہر مت نکالو۔]

اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات کی تفہیم کا انداز اسی طرح اختیار کیا جیسا ان کے معنوی رہنما حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنایا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں:

من بندۂ قرآنم اگر جاں دارم
من خاکِ رہِ محمدِؐ مختارم
گر نقل کند، جز ایں، کس از گفتارم
بیزارم و ازاں سخن بیزارم

(میں اگر زندہ ہوں تو قرآن کی وابستگی کی وجہ سے زندہ ہوں۔ میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے راستے کی مٹی ہوں۔ اگر کوئی شخص [قرآن و صاحبِ قرآن سے وابستگی کے علاوہ] مجھ سے کوئی اور بات منسوب کرے تو میں اس سے ہزار بار بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔)

لیکن اقبال بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اتباعِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم

کی بنیاد پر عہدِ رسالت مآب ﷺ سے قیامت تک آنے والا ہر مسلمان لائقِ تعظیم ہے، کیوں کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ نبی علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کے معیارات کو برقرار رکھنے والوں کے لیے اپنی مخلوق کے دلوں میں ان کی محبت پیدا فرما دیتا ہے۔[۳۱]☆ اقبال کے کلام میں بزرگانِ دین کے مناقب کی موجودگی اس بات کی واضح دلیل ہے۔

لیکن بزرگانِ دین کی محبت میں بھی غلو کا عنصر مٹانے، نبوت کے تصور میں جزوی شرکت کے رجحان کو بھی زائل کرنے اور ختمِ نبوت کے مسئلے کو دوٹوک انداز میں سمجھانے کے لیے ہی اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کو مزید واضح فرمادیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے بعد کسی بھی مفہوم میں وحی کے تسلسل کا تصور ''شرک فی النبوت'' ہے اور نبی علیہ السلام کے بعد کوئی بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ مبارکہ کی طرح واجب الاتباع نہیں ہے نہ ہوسکتا ہے۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ ایماں کردہ ای[۳۲]☆

(اے نبیِ کریم علیہ السلام! آپ ﷺ کے بعد نبوت ہر مفہوم میں [ظاہر یا پوشیدہ مفہوم میں، جیسے کسی کو نبی کی طرح واجب الاتباع قرار دینا] شرک ٹھہری— آپ ﷺ نے محفلِ امکاں کو ایمان کے نور کی شمع سے جگمگا دیا۔)

الحاصل، اُمتِ مسلمہ کا اتحاد اس بات پر منحصر ہے کہ بلاشک و ریب حضورِ اکرم ﷺ کے جو اعمال و افعال اور گفتار و تقریری آثار اُمت تک تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں، صرف ان کو اختیار کرلیا جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات پر دین کی تکمیل ہوئی ہے، اس پر کامل ایمان لا کر بعد میں پیدا ہونے والی بدعتوں اور تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات کی بنا پر بننے والے عقائد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، پورے اخلاص سے دین کی رسّی (قرآنِ کریم) کو مضبوط پکڑ لیا جائے۔

حافظ شیرازی نے کیا پتے کی بات کہی ہے:

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خمِ طُرّہ ٔ یارے گیرند[۳۳]☆

(میرے نزدیک تو اب یہی ایک مصلحت رہ گئی ہے کہ سارے دوست سارے کام چھوڑ چھاڑ کر محبوب کی زلف کے خم کی طرف مشغول ہو جائیں۔ یعنی محبوب کی زلفوں کا حلقہ تھام لیں، کیوں کہ محبوب کی زلف سے وابستگی ہی دنیا کے تمام غموں سے نجات کا ذریعہ ہے۔)

حافظ کے اس شعر میں محبوب، حضورِ اکرم ﷺ کی ذات ہی کو سمجھنا چاہیے اور خمِ طُرّہ ٔ یار سے ''دین'' کی رسّی مراد لینی چاہیے۔ اقبال کا سارا پیغام یہی ہے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ساری توجہ [حُبِ رسول ﷺ اور اتباعِ رسول ﷺ کی غرض سے] حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات پر مرکوز کر دی جائے۔

''بالِ جبریل'' میں شامل نظم ''ذوق و شوق'' فکر و فلسفۂ اقبال کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں حضورِ اکرم ﷺ کی عظمت کے بھرپور ادراک کے ساتھ انھوں نے اسلامی تاریخ کے روشن ماضی کے نقوش کی طرف تخلیقی قوت کے ساتھ اشارے کیے ہیں۔ کم زور حال کا نقشہ بھی کھینچا ہے، لیکن عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی قوت حاصل کر کے اپنے مستقبل کو تاب ناک بنانے کا نسخہ بھی بتایا ہے:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی کدو
میں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خاروخس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو! ☆۳۴

اقبال نے اس نظم کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے تھے اور غیر منقسم ہندوستان کی بہ نسبت فلسطین چوں کہ مدینہ منورہ سے زیادہ قریب تھا، اس لیے ان کے دل میں مدینہ منورہ کی حاضری کا ذوق وشوق انتہائی درجہ بڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کے ابتدائی اشعار پر عرب کے جاہل عہد کے شعرا کے سبعہ معلقہ قصائد اور شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدۂ میمیہ کا اثر ہے۔ جاہلی شعرا کے قصائد کی تشبیب میں ان کی محبوبہ کی یاد کا احوال رقم ہوتا تھا اسی کی مناسبت سے بوصیری m نے اپنے قصیدے میں موضع ذی سلم اور وادیِ کاظِمَہ اور پہاڑی سلسلے اَضَم کا ذکر کیا تھا۔ اقبال نے بھی کوہِ اَضَم اور ریگِ نواحِ کاظِمَہ کا ذکر کیا ہے۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اَضَم کو دے گیا رنگ برنگ طَیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دُھل گئے
ریگِ نواحِ کاظِمَہ نرم ہے مثلِ پرنیاں! ☆۳۵

نظم کے تیسرے بند میں اقبال نے براہِ راست نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے مخاطب ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بیان کیا ہے۔ کائنات ایک لفظ ہے تو اس کی روح، معنی اور منبع و غایت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والاصفات ہے، لیکن معنی کی تلاش میں نکلنے والوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت کا ادراک ہونا ذرا مشکل ہے، کیوں کہ انسانی عقل 'عَبۡد' کو تو سمجھ سکتی ہے ''عَبۡدُہٗ'' کا ادراک اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے اقبال نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''معنیِ دیریاب'' کہا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے بڑی پُر مغز باتیں کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر کا کچھ حصہ بہ طورِ اقتباس یہاں پیش کر دیا جائے:

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بالاتفاق ''برزَخِ کبریٰ'' ہیں۔ پس حقیقتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو حقیقۃ الحقائق ہے، اس کا سمجھنا بلاشبہ نہایت مشکل

ہے۔ کائنات کے مختلف مراتب میں اللہ نے برزخ کا سلسلہ قائم فرمایا ہے۔ چناں چہ:

جمادات اور نباتات کے درمیان، مرجان برزخ ہے۔

نباتات اور حیوانات کے درمیان چھوئی موئی کا پودا برزخ ہے۔

حیوانات اور انسان کے درمیان بن مانس برزخ ہے۔

انسان اور خدا کے درمیان حقیقتِ محمدی (ﷺ) برزخ ہے۔

اسی بات کو ایک عاشقِ رسول ﷺ نے یوں بیان کیا ہے:

اِدھر مخلوق میں شامل ، اُدھر اللہ سے واصل!
خواص اُس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کائنات کی ساری قدر و قیمت اور خوبی آپ ﷺ ہی کے دم سے ہے۔یعنی جس شے میں آپ ﷺ کا نور نسبتاً زیادہ ہے وہ شے دوسری اشیا سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی لیے ساری دنیا آپ ﷺ کے نور سے فیضیاب ہونے کے لیے بے تاب اور بے قرار ہے، اسی لیے ساری دنیا آپ ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے— یا زنورِ مصطفیٰ ﷺ اورا بہاست/ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است)۔[۳۶]☆

اگلے شعر میں اقبال نے اپنے عہد کے علما کو بے بصیرت و بے ذوق کہا ہے، کیوں کہ وہ اپنی دنیا بنانے میں اپنے منصب کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر چکے ہیں۔ صوفیوں کی خانقاہوں میں بھی اللہ کی محبت کے ساغر پلانے کے بجائے دنیا طلبی کا درس مل رہا ہے۔ پھر اقبال کہتے ہیں کہ میں اسلامی تاریخ کے سنہرے دور کی بازیابی کا خواہش مند ہوں اور کھوئے ہوئے عظیم فرزندانِ اسلام کے کردار کی جھلک دیکھنے کی جستجو رکھتا ہوں۔ عمومی فضا میں تو صرف کانٹے اور گھاس اُگتی ہے جب کہ میرے فکر وفن سے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اس نکتے کو اقبال کے ایک فارسی شعر سے سمجھا جاسکتا ہے:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم ☆۳۷

(ہم اپنے مقاصد کی شعوری تخلیق ہی سے زندہ ہیں اور اس مقصد اور آرزو کی کرن ہی سے ہماری چمک دمک قائم ہے [انسان اور بہائم میں فرق ہی نصب العین کے ہونے نہ ہونے کا ہے])۔

''ذوق وشوق'' کے مذکورہ شعر میں بھی اقبال نے اپنا شعری مسلک یہی بتایا ہے کہ مقاصد کی تخلیق اور آرزو کی نشوونما کے لیے ہی میں شعر کہتا ہوں۔ پھر اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اپنے فن کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کی ہے، میری آواز [شعر] میں میرا لہو شامل ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اپنی تصنیف ''زَبورِعجم'' سے ایک شعر نقل کیا ہے۔ وہ حضورِ اکرم ﷺ سے استدعا کرتے ہیں کہ میرے دلِ بے قرار کو [میری تخلیقِ آرزو کی جدوجہد سے] کبھی فرصت نہ دیجیے، بلکہ مجھے عشق کی پیچیدگیوں میں مزید اُلجھائے رکھیے۔

فرصتِ کش مکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوے تابدار را ☆۳۸

(اے میرے محبوب [حضورِ اکرم ﷺ]! آپ مجھے اپنے جمالِ جہاں آرا کے فیضان سے مسلسل متمتع ہونے کا موقع عطا فرماتے رہیے۔ اپنے بل کھائے ہوئے گیسوؤں میں ایک دو شکن کا اور اضافہ فرمالیجیے تا کہ میں تاحیات اسی عشق میں مبتلا رہ سکوں۔)

اگلے بند میں اقبال نے وہ شاہکار اشعار پیش کیے ہیں جن کی مثال پوری اردو نعت کی تخلیقی تاریخ میں نہیں ملتی۔

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہِ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود

فقرِ جُنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری ﷺ نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے[☆۳۹]

حضورِ اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارک ہے "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ"(پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے[☆۴۰]) ایک حدیثِ میں ارشاد فرمایا، "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ اُلقمُ" (پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ قلم ہے[☆۴۱])۔ ایک اور حدیث میں ہے، "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْعَقْلَ" (سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی وہ عقل ہے[☆۴۲])۔

صاحبِ "سرِّ دلبراں" لکھتے ہیں :

> حضور سرورِ کائنات ﷺ عقل کی صورت ہیں اور خدا کا قلم ہیں اور دعوت الی اللہ کی حقیقت اور شریعت کے وضع کرنے میں آپ عقولِ جزویہ ہیں اور تینوں احادیث سے آپ ہی کی ذات مراد ہے۔[☆۴۳]

حضرت ذوقی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں:

> جب اللہ تعالیٰ نے عالمِ روحانی کا ابداع کیا اور عالمِ جسمانی کی تخلیق فرمائی تو نورِ نبوت کو عقلِ اول کی ذات سے اس طرح نکالا جس طرح مکان کا نقشہ انجینئر کے ضمیر سے نکلتا ہے۔ چناں چہ اسی نور سے چاند سورج روشن ہوئے اور اسی نور سے عرش و کرسی اور لوح و قلم کو قیام ملا۔[☆۴۴]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، 'اِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللّٰہِ ﷺ کَانَ الْقُرْاٰنُ" (حضورِ اکرم ﷺ قرآنِ پاک میں بیان کردہ تمام اخلاقِ جلیلہ اور اوصافِ حمیدہ کا مجسمہ تھے۔[☆۴۵])

ان تمام روایتوں کو پیشِ نظر رکھیں تو اقبال کی استعاراتی زبان "لوح"، "قلم" اور

''الکتاب'' کے مفاہیم سمجھ میں آسکتے ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کے نور کی تخلیق ہی تخلیقِ اوّل ہے بقیہ تخلیقات نورِ اوّلیں کی تخلیق کا تتمہ ہیں، اس لیے ان کے نام بھی حضورِ اکرم ﷺ کے اسمائے گرامی کے دائرے میں آسکتے ہیں۔''الکتاب'' قرآنِ صامت ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات قرآنِ ناطق اور مجسم، اس لیے آپ ﷺ کے وجود کو ''الکتاب'' کہنے میں بڑی معنویت ہے۔ رہا آسمان کا آپ ﷺ کی ذات کے محیط میں ایک بلبلہ ہونا—— تو حقیقتِ محمدیہ اصلِ کائنات ہے اس محیط میں آسمان کی حیثیت سمندر میں بلبلے کی سی ہی ہے۔

اس خاک داں کو آپ کی تشریف آوری کے باعث فروغ حاصل ہوا ہے، کیوں کہ آپ نے خاک کے ہر ذرّے کو سورج جیسی چمک عطا فرمادی۔یعنی انسانی سرشت میں جو حیوانیت تھی اور جس کا مظاہرہ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل ہر لمحہ ہو رہا تھا، آپ ﷺ نے اس حیوانیت کا رخ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی طرف پھیر دیا۔اس طرح آپ نے ذرّوں کو آفتاب کی چمک دمک عطا فرمادی۔ تاریخِ عالم میں آپ کی اُمت کے بادشاہوں کی شان وشوکت سے آپ ﷺ کے جلال کی جہت سامنے آتی ہے اور صوفیاے کرام کے فقر میں آپ ﷺ کے حسنِ معاشرت وسلوک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ سلطان سنجر، سلجوقی خاندان کا بڑی شان وشوکت والا بادشاہ تھا اور سلطان سلیم اوّل سلطنتِ عثمانیۂ ترکی کا نام ور فرماں روا تھا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ صوفیاے کرام کے سرخیل ہیں۔فقر وشاہی کا مفہوم اقبال کے درجِ ذیل شعر سے زیادہ واضح ہوسکتا ہے:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است
ایں تجلیہاتِ ذاتِ مصطفیٰ است☆[۴۶]

(فقیری اور بادشاہت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی واردات اور شانیں ہیں۔ اُمت میں جس کو بھی بادشاہت ملی وہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان اور تجلی کے طفیل، اور کسی کو دولتِ فقر ملی تو وہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کی شان اور تجلی کے ظہور کی علامت ہے۔)

اگلے شعر میں اقبال نے اپنی ذات کو واسطہ بنا کر ایک نکتہ بیان کیا ہے جو ہر مسلمان کے لیے ایک کلیہ، ایک ضابطہ اور ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر حضورِ اکرم ﷺ

کی اتباع اور پیروی کا بالکل ایسا انداز نہ ہو جیسا نماز میں پیش امام کی پیروی کا ہوتا ہے تو زندگی کے ہر عمل میں راہ سے بھٹکنے کے علاوہ کوئی اور صورت پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ یہاں نماز، قیام اور سجود کہہ کر انسان کی پوری زندگی کے اعمال کی طرف اشارہ کردیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی پیروی میں انسان (اور جن) کا ہر عمل عبادت بن جاتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی توجہ ہی سے عقل کو بھی منزل ملی اور عشق کو بھی مقصود حاصل ہوا۔ عقل کی سرشت میں جستجو ہے اور کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی تڑپ ہے، اس لیے اسے ما بعدالطبیعیاتی رموز سے آشنا کر کے مطمئن کردیا اور عشق کو روحانی طور پر نواز کر اطمینان کی دولت عطا فرمادی۔

ٹیپ کے شعر میں اقبال نے استغاثے کے انداز میں کہا ہے کہ حضور! میرا زمانہ بڑا تاریک ہے۔ زمانے کی گردش نے اس عہد کو ظلمت بداماں کردیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنی توجہِ خاص سے ہماری دنیا کو پھر منور فرمادیجیے۔

بعد کے بند میں اقبال نے اپنی کیفیات کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بیان کردیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات مکمل عشق کی علامت ہے جس کے بغیر منزل مل ہی نہیں سکتی ہے۔ چناں چہ منزل رسی کا واحد ذریعہ آپ ﷺ کی ذات سے انسلاک ہے، کیوں کہ محض عقل [جسے اپنے زعم میں برتری کا دعویٰ ہے اور جو پیکرِ محسوس کی خوگر ہے] کفر ہی کفر ہے۔

تازہ مرے ضمیر میں مارکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بو لہب![۴۷]☆

مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں اقبال براہِ راست حضورِ اکرم ﷺ سے مخاطبت میں ان انقلابی اقدامات کا احوال درج کیا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات کے ظہور کے بعد آپ ﷺ کی وساطت سے انسانیت کے لیے باعثِ خیر و فلاح بنے تھے۔ اقبال کہتے ہیں:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہا ایں قوم را از ترسِ مرگ
سوختی لات و مناتِ کہنہ را
تازہ کر دی کائناتِ کہنہ را
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح ، تو بانگِ اذاں
لذتِ سوز و سرور از لا الٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لا الٰہ
نے خداہا ساختیم از گاوٴخر
نے حضورِ کاہناں افگندہ سر
نے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نے طوافِ کوشکِ سلطان و میر
ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست ☆[۴۸]

(یا نبی اللہ! آپ ہی ہم بے یارومددگار لوگوں کا سازوسامان ہیں۔ آپ ﷺ اس مسلمان قوم کو [پہلے کی طرح] موت کے خوف سے نجات دلائیے، [کیوں کہ موت کے خوف نے اسے جہاد سے دور کردیا ہے]۔ آپ ﷺ ہی کی ذات تو ہے جس نے بتوں کو آگ میں جھونک کراس پرانی کائنات میں نقشِ توحید ازسرِنو اُجاگر فرمایا۔ انسانوں اور جنات کی دنیا میں صرف آپ ﷺ ہی کی ذات ہے جس نے ان کے ذکر وفکر میں ایسی جہتیں پیدا فرمائی ہیں کہ اب ذکر وفکر کی دنیا صرف آپ کی ذات سے منسوب ہوگئی ہے۔ [آپ ﷺ ہی کی یہ دولت ہمیں] الٰہِ واحد کے اقرار اور باطل خداؤں سے انکار کی لذتِ سوز و سرور حاصل ہوئی۔ اسی کلمۂ طیب کی یہ دولت ہمیں فکر کی رات میں نور میسر آیا۔ آپ ﷺ کی تعلیماتِ توحید ہی کا یہ فیضان ہے کہ ہم نے مشرک قوموں کی طرح گائے اور گدھے کو

نہیں پوجا اور نہ ہی ہم کاہنوں کے آگے جھکے۔ ہم نے پرانے نقلی خداؤں کے آگے سجدہ ریزی بھی نہیں کی اور نہ ہی ہم نے امیروں اور بادشاہوں کے محلوں کے چکر کاٹے۔ یہ سب خصلتیں ہم میں آپ ہی کی تعلیمات کی بہ دولت پیدا ہوسکی ہیں۔ ہماری فکر کی راست سمتی آپ ہی کے احسانات کی مرہونِ منّت ہے۔)

علامہ نے رموزِ بےخودی میں ایک باب قائم کیا ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت کا مقصد انسانی معاشرے کو مساوات کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مندو زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ او رنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشتِ خرابِ او نوشت
از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینِ حق بحقداراں سپرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
حرّیت زاد از ضمیرِ پاکِ او
ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او[۴۹]☆

([نبیِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تشریف آوری سے قبل اس دنیا میں] انسان اپنے جیسے انسان کی پرستش کرتا تھا۔ نوعِ انساں انتہائی کم زور تھی۔ ایران کے بادشاہ اور روم کے شہنشاہ کی شان و شوکت نے، راہزن بن کر انسان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، گردن

میں رسّی اور پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ [اس دنیا میں انسان کے شکار کے لیے] سیکڑوں شکاری تھے۔ کوئی غیب کی خبریں بتانے والا کاہن تھا تو کوئی پاپا کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ کوئی بادشاہ کی صورت میں تھا تو کوئی امیر تھا۔ بادشاہ اور کلیسا کا مذہبی رہنما دونوں ہی انسانیت کی اُجڑی ہوئی کھیتی پر لگان وصول کرتے تھے۔ انسان کی فطرت بھی غلامی کے باعث پست ہوگئی تھی۔ اس کی بانسری میں نغمے خون آلود ہوگئے تھے۔ ایسی فضا میں محمد مصطفیٰ ﷺ کا ظہور ہوا اور آپ نے بادشاہوں کے تخت، غلاموں کے سپرد کرکے حق داروں کو ان کا حق دلوا دیا۔ [اس طرح انسان کی] آزادی نے آپ ﷺ کے قلبِ پاک سے جنم لیا اور یہ نئی اور میٹھی شراب [طہور] آپ کی [لگائی ہوئی] انگور کی بیل سے دستیاب ہوئی۔)

دشمنانِ اسلام کا منفی پروپیگنڈا بھی بعض اوقات اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تعارف کا باعث بنتا ہے۔ علامہ نے ''ابوجہل کا نوحہ'' بھی اشعار میں ڈھالا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیماتِ اسلام انسانیت کے لیے کس قدر سودمند اور دشمنانِ انسانیت کے لیے کتنی مہلک ہیں۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود
نوجواناں را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است
ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آبا در نورد
با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وی بگیر ای کائنات
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب

از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدر احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلماں مزدکی است☆۵۰

(ہمارا سینہ محمد ﷺ کی وجہ سے داغ داغ ہے [کیوں کہ] ان ہی کی دی ہوئی تعلیم کے باعث ہمارے کعبے کا چراغ بجھ گیا ہے یعنی انھوں نے ہمارے ہاتھ سے بنائے ہوئے خداؤں کو پاش پاش کردیا ہے۔ انھوں [ﷺ] نے قیصر و کسریٰ کی ہلاکت و بربادی کی بات کی اور مجھ سے میرے زیرِ اثر نوجوانوں کو چھین لیا۔ وہ [ﷺ، نعوذُ باللہ] جادوگر ہے اور اس [ﷺ] کے کلام میں جادوگری ہے۔ لااِلٰہ کے دو حرفوں ہی میں دراصل کفر ہے، [کیوں کہ اس میں الٰہِ واحد کے سوا سب کی نفی ہے]۔ جب اس [ﷺ] نے ہمارے آباواجداد کے دین کی بساط اُلٹ دی تو ہمارے بتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو ناقابلِ بیاں ہے۔ اس [ﷺ] نے ہمارے بتوں کو اپنی ضرب سے پاش پاش کردیا [اب تو یہ بددعا ہے کہ] اے کائنات [تو ہی] اس سے انتقام لے!— اس کا مذہب وطنی اور نسبی [تفاخر کی] جڑ کاٹتا ہے۔ وہ [ﷺ تو] قریش اور عرب کی فضیلت کا [بھی] منکر ہے۔ اس [ﷺ] کی نظر میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ وہ تو [کھانے کے لیے بھی] اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھا۔ اس [ﷺ] نے عرب کے آزاد بندوں کی ناقدری کی اور حبش کے بدصورت غلاموں کے ساتھ راہ و رسم بڑھالی۔ [ان کے لائے ہوئے نظام کی بہ دولت] کالے، گورے شیروشکر ہوگئے۔ انھوں نے اعلیٰ خاندانوں کی عزت و آبرو خاک میں ملا

دی۔ انسانی برابری اور بھائی چارے کا یہ تصور ایرانی ہے، کیوں کہ سلمان [نبی ﷺ کا صحابی رضی اللہ عنہ] ایرانی ہے [اور اسی نے مزدک کا دیا ہوا درس محمد ﷺ کو دیا ہے])۔

اس طرح اقبال نے حضورِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین کی خوبیاں گِنا کر، دشمنانِ دین کی طرف سے ان کے اپنے نظام کے تلپٹ ہوجانے کا نوحہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان پر برطانوی قبضے کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی فکری صلاحیتیں کند ہونے لگیں اور انھیں مغربی آقاؤں کی ہر چیز میں حسن نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مذہب میں بھی تاویلات کے ذریعے ردّ وقبول کے نکات نکالنے لگے۔ اقبال نے اس مہلک بیماری کی علامتوں سے مسلمانوں کو نہ صرف آگاہ کیا، بلکہ انھیں نبیِ کریم کا درسِ حریت یاد دلا کر صاف صاف کہہ دیا کہ شے کی حقیقت دیکھنے کے لیے صرف آزاد بندوں کی نگاہ درکار ہے:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسنِ زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا[☆۵۱]

ہندی مسلمانوں کو غلامی کے باعث عمل سے زیادہ اظہارِ عشق کا چسکا تھا۔ دیدارِ رسول ﷺ کی آرزو تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمان نہیں تھکتے تھے، لیکن یہ نہیں سوچتے تھے کی حضورِ اکرم ﷺ کے دیدار کا اصل مفہوم و مدعا کیا ہے؟ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں حسین بن منصور حلاج سے سوال کیا :

کم شناسم عشق را ، ایں کار چیست؟
ذوقِ دیدار است؟ پس دیدار چیست؟[☆۵۲]

(میں عشق کا مفہوم کم سمجھتا ہوں [بتائیے کہ] یہ کیا کام ہے؟ مجھے دیدارِ رسول ﷺ کا ذوق تو ہے لیکن اصل دیدار کیا ہے؟)

جواب میں حلاج نے کہا:

معنیِ دیدارِ آں آخر زماں ﷺ
حکمِ او ، بر خویشتن کردن رواں
درجہاں زی چوں رسولِ انس و جاں
تا چو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را بیں ، ہمیں دیدارِ دوست
سنتِ او سرّے از اسرارِ دوست[۵۳]☆

(نبیِ آخرالزماں ﷺ کے دیدار کا مطلب ہے کہ تو ان کے حکم کو خود [اپنی ذات] پر جاری کرلے۔ یعنی ان کی لائی ہوئی شریعت پر عمل پیرا ہوجا۔ دنیا میں انسانوں اورجنوں کے رسول ﷺ کے مانند زندگی بسر کر۔ تاکہ تو بھی ان کی طرح عالمِ انسانی اور عالمِ جنّات میں مقبول ہوجائے۔ بعد ازاں خود کو دیکھ کہ یہی ان کا دیدار ہے۔ ان کی سنت [پرعمل کرنے ہی سے معلوم ہوگا کہ] یہی ان کے بھیدوں سے ایک بھید ہے۔حضورِ اکرم ﷺ کی صورت اور سیرت کی پیروی ہی سے دیدار کی آرزو کرنے والے کی ذات آئینہ ہوجائے گی جس میں حضورِ اکرم ﷺ کا دیدار نصیب ہوسکے گا۔)

اس طرح اقبال نے اُمت کو یہ پیغام دیا کہ پیروی کے بغیر حضور علیہ السلام کی محبت کا دعویٰ اورآپ ﷺ کے دیدار کی تمنا بے سود ہے۔ سچی آرزو اور سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان فنا فی الرسول ﷺ ہوجائے اور پھر اپنے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی قربت کا تمنائی ہو۔

اقبال کا اپنا حال یہ تھا کہ وہ بیش تر اوقات قلب و ذہن و روح کے ساتھ اپنے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اسی کیفیت کی ایک نظم ’’بانگِ درا‘‘ میں ہے جس کا عنوان ہے ’’حضورِ رسالت مآب ﷺ میں‘‘۔ اس نظم کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال حضورِ اکرم ﷺ کی محفل میں حاضر ہیں:

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت ﷺ میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور ﷺ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اس کے بعد اقبال عرض کرتے ہیں:

حضور ﷺ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو ، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو شے ہے اِس میں وہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

(حضور رسالتِ مآب ﷺ میں)☆۵۴

اس نظم سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اقبال نے جنابِ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے دربار میں بھی اُمت کا احوال ہی پیش کیا اپنی ذاتی روحانی وقلبی واردات کا ذکر نہیں کیا۔

اُمت کو اسلامی اقدار کا پابند رہنے کی تلقین اور حضورِ اکرم ﷺ کی سچی پیروی اور محبت کی دعوت دینا ہی اقبال کا فکری وشعری مسلک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ انھوں نے تو شاعری کو پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ محض شاعری نہیں کی ہے۔

نہ شعر است ایں کہ بروے دل نہادم
گرہ از رشتۂ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق
مسِ ایں مفلساں را تاب دادم☆۵۵

(یہ محض شاعری نہیں ہے کہ جس میں میرا دل اٹکا ہوا ہے۔ میں تو معانی کی

گرہیں کھول رہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ میری قوم کو عشقِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، اکسیر بنادے۔ میں اس مفلس قوم کے تانبے کو آگ میں تپا رہا ہوں تا کہ یہ اکسیر بن جائے۔)

مفلس قوم کے تانبے کو اکسیر بنانے کے لیے ہر ہر زاویے سے دعوتِ عمل دی اور عشقِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی غایت کا احساس دلایا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے[☆۵۶]

اور:

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ما سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(جوابِ شکوہ)[☆۵۷]

روحِ اسلام سے مملو پیغام اپنے اشعار، اپنی گفتار اور اپنی تحریروں میں بار بار پیش کرنے کے بعد بھی جب مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے تو اقبال نے اپنے آقا و مولا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی جناب میں یہ عرض داشت پیش کی:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
زِ شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند[☆۵۸]

(میں نے سرفرازی حاصل کرنے کا راز مسلمانوں کے سامنے پیش کردیا، لیکن انھوں نے میری باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا۔ انھوں نے میرے شجرِ فکر کا پھل نہیں

کھایا۔ اب میرے آقا ﷺ! آپ اُمتوں کے امام ہیں، میں آپ سے اپنی فکری سچائی اور پیامی شاعری کی داد چاہتا ہوں۔ مسلمان قوم نے تو مجھے محض شاعر سمجھ رکھا ہے۔)

اقبال کی شعری و فکری تحریروں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا مماثل اسلامی دنیا میں بالعموم اور ہندو پاک اسلامی معاشرے میں بالخصوص کوئی نہ ہوا۔ ایک ایسا شاعر جس کے کلام میں عشقِ رسول ﷺ کی گرمی، اُمتِ مسلمہ کی اجتماعیت کا احساس اور قومِ مسلم کے اِدبار و زوال کو عروج میں بدلنے کا اتنا شدید ولولہ ہو۔

اقبال کی مثال صحرائے حیات میں قیس کی سی ہے جس کے لیے غالب نے کہا تھا:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار
صحرا ، مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا[۵۹]☆

کاش اُمتِ مسلمہ ''رسالت'' کے جملہ مفاہیم اور مقاصد و اغراض سے واقف ہو کر (اقبال کے فکری نکات کی روشنی میں) حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کرنے والی بن جائے اور آپ ﷺ کی پیروی کر کے خود کو جمالِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا آئینہ بنالے۔

مآخذ و منابع:

۱۔ اقبال، ''کلیاتِ اردو''، سروسز کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۶۹۱/۴۹۔
۲۔ اقبال، ''جاوید نامہ''، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، ، لاہور، س۔ن، ص ۹۳۳/۹۷۔
۳۔ این میری شمل، ''شہپر جبریل''، مترجمہ: ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۷۔
۴۔ اقبال، ''پیامِ مشرق''، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۶۷۸/۱۸۵، غزل ۳۴۔
۵۔ ایضاً، ص ۶۸۷/۱۹۴۔ غزل ۴۴۔
۶۔ مکاتیبِ اقبال بہ نام خان نیاز الدین خان، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۶۰۔
۷۔ ''جاوید نامہ''، ص ۸۹۹/۶۳۔
۸۔ پیامِ مشرق، ص ۶۴۰/۱۴۷۔
۹۔ '' کلیاتِ اقبال''، اردو، (بالِ جبریل)، سروسز کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷/۳۱۹۔
۱۰۔ ایضاً، ۲۵/۳۱۷۔

۱۱۔ اقبال، ''ارمغانِ حجاز''، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۴۸۔
۱۲۔ ایضاً، ص۵۰
۱۳۔ ایضاً، ص ۷۱
۱۴۔ ''جاوید نامہ''، ۱۸۰/۱۰۱۶۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱/۱۰۱۷۔
۱۶۔ این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر، مترجم: محمد ریاض، ڈاکٹر، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۷۔
۱۷۔ ''جاوید نامہ''، ص ۲۴/۸۶۰۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۲/۹۵۸۔
۱۹۔ ''جاوید نامہ''، ص ۸۵۵/۱۹۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷۹/۱۰۱۵۔
۲۱۔ ایضاً، ص۱۷۶/۱۰۱۲۔
۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۸/۱۰۱۴۔
۲۳۔ اقبال، ''اسرارِ خودی''، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۳۱ تا ۳۵/ ۲۴۷ تا ۲۵۱۔
۲۴۔ اقبال، ''رموزِ بے خودی''، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۱۶۱ تا ۱۶۳/ ۳۷۷ تا ۳۷۹۔
۲۵۔ ایضاً، ص۱۶۳ تا ۱۶۵/ ۳۷۹ تا ۳۸۱۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵/۳۶۱۔
۲۷۔ اقبال، ترجمہ: خطباتِ اقبال، تجدیدِ فکریاتِ اسلام، مترجم: ڈاکٹر وحید عشرت، نظرِ ثانی: ڈاکٹر عبدالخالق، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۵۔
۲۸۔ اقبال، ''پیامِ مشرق''، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن، ص ۱۸۵/۶۷۸، غزل ۳۴۔
۲۹۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، ''شرحِ پیامِ مشرق''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س۔ن۔، ص ۴۹۹۔
۳۰۔ ''اسرارِ خودی''، ص۲۸۳/۶۷۔
۳۱۔ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور کیے انھوں نے نیک کام [تو] عنقریب پیدا کردے گا ان کے لیے، رحمٰن [دلوں میں] محبت۔'' القرآن، آیت نمبر ۹۶، سورۂ مریم۔
۳۲۔ ''کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال''، ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۹۹۔
۳۳۔ شرحِ دیوانِ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ، پروفیسر میاں مقبول احمد، مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، س۔ن، لاہور، ص ۵۳۴۔
۳۴۔ ''کلیاتِ اقبال''، اردو، (بالِ جبریل)، سروسز کلب، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰۳/۱۱۲۔
۳۵۔ ایضاً، ص ۴۰۳/۱۱۱۔

۳۶۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ''شرح بالِ جبریل''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، غزنی سٹریٹ، لاہور، س۔ن،ص۵۵۲۔

۳۷۔ ''اسرارِخودی''، ص ۲۹/۲۴۵۔

۳۸۔ ''کلیاتِ اقبال''، (اردو)،ص۴۰۵/۱۱۳۔

۳۹۔ ایضاً،۴۰۵/۱۱۳۔

۴۰۔ حضرت شاہ سیّد محمد ذوقی ؒ، سرِّ دلبراں، نارتھ کراچی، کراچی، طبع پنجم: ۱۴۱۸ھ، ۳۷۶۔

۴۱۔ ایضاً۔ ۴۲۔ ایضاً۔ ۴۳۔ ایضاً،ص ۳۷۸۔

۴۴۔ ایضاً،ص ۳۶۔ ۴۵۔ صحیح مسلم۔

۴۶۔ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق مع مثنوی مسافر، شیخ بشیر اینڈ سنز، لاہور، س۔ن،ص۱۲۲۲۔۸۲۔

۴۷۔ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو)،ص۴۰۶/۱۱۴۔

۴۸۔ اقبال، مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، صفحہ۱۲۱۳/۷۳۔

۴۹۔ ''رموزِ بے خودی''، ص ۱۶۷/۳۸۳۔

۵۰۔ ''جاوید نامہ''، ص۷۸/۹۱۴۔

۵۱۔ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو)،ص۲۴/۳۱۶۔

۵۲۔ ''جاوید نامہ''، ص۱۸۵/۱۰۲۱۔

۵۳۔ ایضاً،ص ۱۸۵/۱۰۲۱۔

۵۴۔ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو) ص ۱۹۷۔

۵۵۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص ۳۲/۷۴۷۔

۵۶۔ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو)،ص ۲۰۷۔

۵۷۔ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو)،ص ۲۰۸۔

۵۸۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص ۳۲/۷۴۷۔

۵۹۔ ''دیوانِ غالب'' (ردیف ،الف)۔

پروفیسر محمد اکرم رضا

اقبال ایوانِ نعت میں

شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کا شمار اُن عظیم فرزندانِ اسلام میں ہوتا ہے جنھیں قدرت کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے دنیا میں بھیجتی ہے۔ اس سے عظیم مقصد اور کیا ہوسکتا تھا کہ اُنھوں نے اُس وقت اپنی شاعری کے اُجالوں سے ظلمات کو پارہ پارہ کیا جب اُن ظلمتوں کے خاتمے کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ فقط برِصغیر ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کے مسلمان استعماری قوتوں کی یلغار کے سامنے بے بس تھے۔ استعماریت کے اس طوفان کی یلغار اس قدر وحشت انگیز اور بلاخیز تھی کہ اسلامیانِ عالم نے اپنی غلامی کو نوشتۂ تقدیر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اقبال کا وجود صحرائے غلامی میں بھٹکنے والے درماندہ رہرووں کے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہوا۔ یہ صورِ اسرافیل اُن کی انقلاب آفریں شاعری تھی۔ وہ انقلاب آفریں شاعری جو کبھی توحید اور خودی و بے خودی کا تصور بخشتی ہے، جو کبھی شاہینی پرواز کا سلیقہ بخشتی ہے تو کبھی فقر و خودداری کے آداب سکھلاتی ہے، اور کبھی خانقاہوں سے نکل کر رسمِ شبیری ادا کرنے والے مردِ مومن کے قالب میں ڈھل جانے کا پیغام دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کا ولولۂ تازہ ہر دلِ پُر درد کی آواز بن گیا۔ اس کا سبب وہ مؤثر لہجہ اور روحانی گداز تھا جو اسے محبتِ رسول ﷺ کے سبب عطا ہوا۔

اقبال کے ہاں ہر مقام پر انوارِ مصطفیٰ ﷺ کی ضو باری نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ توحیدِ خداوندی کے حقیقی عرفان کے لیے بھی وہ تجلیاتِ مصطفوی ﷺ سے قلب و جان کو جگمگانے کا پیغام

دیتے ہیں۔ خداے کریم نے محبتِ رسول ﷺ کو اپنی محبت قرار دے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصلِ ایمان قرار دیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا یہ شعر حقیقت میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے نبیِ کریم ﷺ کو حاصلِ ایمان سمجھنے کا دیباچۂ اوّل ہے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است[☆۱]

علامہ اقبال کی نعت مروّجہ نعتیہ اسالیب سے الگ نظر آتی ہے۔ انھوں نے نعت کا عنوان دے کر نعت نہیں کہی۔ انھوں نے مسلسل نعتیہ قصائد نہیں لکھے۔ قافیہ اور ردیف کے التزام سے نعت گوئی کو شعارِ شاعری نہیں بنایا۔ اپنے معاصر شعرا کی طرح کوئی نعتیہ دیوان اپنی یادگار نہیں چھوڑا، لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری توصیفِ رسول ﷺ، محبتِ محبوبِ خدا اور عشقِ سرورِ کائنات ﷺ سے عبارت نظر آتی ہے۔ اردو شاعری ہو یا فارسی شاعری، ہر جگہ سرورِ کائنات کی عقیدت اور آپ کے پیغام کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان کی نعت گوئی کا انداز زمانے بھر سے جدا تھا۔ وہ تو اسلامیانِ عالم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے آئے تھے۔ اور ان کے نزدیک یہ بیداری اُس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک عشقِ حضور کو مرکزِ ایمان سمجھ کر رہوارِ فکر کو اس مرکزِ ایمان کے گرد طواف کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے۔ یہی احساس اُن کے اشعار کو عشق کی معجزہ نمائی کا عرفان بخشتا ہے۔ فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز، محبوب اور قابلِ قدر وصف جذبۂ عشقِ رسول ہے۔ ذاتِ رسالت ﷺ کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا اظہار اُن کی چشمِ نم ناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا کہ جہاں کسی نے حضور ﷺ کا نام ان کے سامنے لیا، ان پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کا نام آتے ہی اور اُن کا ذکر چھڑتے ہی اقبال بے قابو ہوجاتے تھے۔[☆۲]

فقیر صاحب ہی لکھتے ہیں کہ:

ڈاکٹر صاحب کا دل عشقِ رسول نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی، آواز بھرّا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ مکمل سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔[۳]☆

فقیر سیّد وحید الدین کی فیملی کو علامہ اقبال سے بہت قربت کا رشتہ بھی رہا ہے اور علامہ بھی اس خاندان کے مختلف افراد سے پیار کرتے تھے۔ فقیر وحید الدین کی تحریر ہمیں شاعرِ مشرق کے اس روحانی گداز سے آگاہ کرتی ہے جو انھیں محبتِ رسولِ خدا ﷺ کے سبب سے عطا ہوا تھا۔ اسی روحانی گداز نے انھیں فکری اور نظریاتی طور پر سرورِ کائنات سے بے پناہ چاہت عطا کر دی۔ یہی چاہت ان کی مدحت طرازیوں کا اعزاز بن کر جھلکتی نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال کی نعت مروّجہ اسالیبِ نعت سے ہٹ کر ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کے عنوانات بھی نعتیہ نہیں ہیں۔ وہ بطورِ خاص نعت نہیں کہتے، مگر نعت اُن سے ہو جاتی ہے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو درپیش مسائل کا تذکرہ کریں، صحابہ رسول ﷺ کی قربانیوں کی داستان چھیڑیں، عالمِ اسلام کے دُکھوں کا ماجرا بیان کریں، اسلامی مبادیات کا ذکر کریں، مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، توحیدِ خداوندی کو اپنا موضوع بنائیں، خودی و خودداری کے اسرار بیان کریں، اصحابِ ہمت کی شاہینی اڑان کو عنوانِ شاعری بنائیں، مردِ مومن کے اوصاف کا تذکرہ کریں، اسلامی تہذیب کا باطل اور غیر اسلامی تہذیبوں سے موازنہ کریں، عالمی دانش وروں کے افکار کا جائزہ لیں، خدائے کریم سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا شکوہ کریں یا خود ہی ''شکوہ'' کا جواب بھی تحریر کریں، خاکِ حجاز کا ایمان آفریں فسانہ چھیڑیں، غازیانِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کریں، مسلمانوں کو اُن کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، اپنی قلبی واردات پر سے پردہ اٹھائیں یا اپنی روحانی تگ و تاز کو آشکارا کریں، تہذیبِ مغرب کا نوحہ لکھیں یا تاریخ کے حوادث و واقعات کو قلم بند کریں، مسجدِ قرطبہ پر قلم اٹھائیں یا اسلام کی عظمتِ رفتہ کا نوحہ اپنی ''بانگِ درا'' کا موضوع بنائیں— حق تو یہ ہے کہ اقبال کسی نہ کسی صورت آقائے دو عالم کے حضور اپنی جبینِ

عقیدت ختم کر دیتے ہیں۔ محبتِ رسول ﷺ اپنی جلوہ کاری دکھلا جاتی ہے۔ یہ اقبال کی دانستہ کاوش کا اثر نہیں، بلکہ اس کے پسِ پردہ وہ جذبۂ عقیدتِ مصطفیٰ ﷺ کارفرما ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے لیے شمعِ راہِ عمل بنا رہا۔

اقبال کی نظروں میں مقامِ رسالت کیا ہے اور حضور ﷺ کی انقلاب آفریں ذات اقبال کے احساسات کو کس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے؟ فرماتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما زمامِ مصطفیٰ است
طُور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ اُو آہن گداز
دیدۂ اُو اشک بار اندر نماز ☆[۴]

علامہ اقبال کے تصورات محبتِ رسول سے بھرپور ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جہاں جہاں بھی دنیاے رنگ و بو آباد ہے، وہ ہمیشہ نورِ مصطفوی سے فیض حاصل کرتی رہے گی۔ ایسا نہیں تو وہ ابھی مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں ہے تا کہ اس مقدس اور برگزیدہ ذات سے اکتسابِ فیض کر سکے۔ علامہ کہتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا زِ نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است☆۵

اقبال کی نعت گوئی بیش تر مقامات پر متفرق اشعار میں ملتی ہے، مگر اس طرح کہ وہ اصل نظم سے جدا نہیں لگتی۔ چوں کہ اقبال مقصدیت کے شاعر تھے، انھیں قدرت نے گوناگوں صفات سے نوازا تھا، یہی صفات اُن کے ہر پیغام کو محبتِ رسول کے حوالے سے دیکھنے کا سلیقہ بخشتی ہیں۔ حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر اُن کا قلم جذبات کو مقصدیت کے سانچے میں ڈھالتا ہوا یکا یک نعتِ رسول ﷺ کی خوش بو لٹانے لگتا ہے:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ☆۶

''ذوق وشوق'' کا شمار علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق منظومات میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اقبال جذب و مستی کی کیفیات میں ڈوب کر امتِ اسلام کو پھر سے اپنے مقصدِ حقیقی کی جانب رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال نے اس معروف نظم کا بیش تر حصہ فلسطین میں لکھا جب وہ ۱۹۳۱ء میں مؤتمر عالمِ اسلامی کے وفد کے ہمراہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس نظم میں اقبال زمان و مکان کے تصورات پر بات کرتے ہیں۔ انھیں ہر لحظہ وہی احساس دامن گیر ہے کہ وہ پیغمبروں کی سرزمین کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اقبال اس نظم میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتوں کو اس شان سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ ان اشعار کی لطافت اور معنی خیزی آج تک اہلِ ایمان کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے باطن میں ڈوب جاتے ہیں۔ کبھی خود کلامی کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی حوادثِ روزگار سے نئی زندگی کا پیغام لیتے ہیں۔ ان کی چشم پھر ان غازیوں، نمازیوں اور کشور کشاؤں کی آرزو مند ہوتی ہے جن کے دم سے ہمارا ماضی درخشندہ تھا اور جن کا وجود آج بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا پیغام دے سکتا ہے۔ تمام نظم میں اقبال کے ذوق وشوق

کا محور ذاتِ سرورِ کونین ﷺ رہی ہے اور وہ پکار اُٹھتے ہیں:

لوح بھی تُو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب[۷☆]

نعت وتوصیفِ مصطفیٰ ﷺ کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک مدحت نگار اپنے ممدوح کے مقام و مرتبے سے آگاہ نہ ہو۔ یہاں تو وہ ذاتِ والا صفات ممدوح ہے جو محبوبِ خدا بھی ہے اور محبوبِ دو عالم بھی۔ دو عالم جس کی خوش نودی کے لیے تخلیق ہوئے، جو جانِ بزمِ کائنات ہے، جس کی خاطر بزمِ ہستی سجائی گئی، جس کے لیے بزمِ کون و مکاں جگمگائی گئی، جس کے لیے چاند ستاروں کی چادر بچھائی گئی، جس کے لیے رنگ و بُو کی خیرات لٹائی گئی۔ علامہ محمد اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام و مرتبہ سے بہ خوبی آگاہ ہیں، بلکہ انھیں تو عشقِ حضور ﷺ کی دولت اپنے والدِ گرامی سے میراث میں ملی ہے۔ یہی عشقِ رسول ﷺ تھا جس نے یورپ کی فضاؤں میں بھی انھیں تہذیبِ یورپ کی چکا چوند سے محفوظ رکھا، بلکہ کفر کی چکا چوند ان کے عشق وعقیدت کے اثاثے کو مزید دل آویزی بخش گئی۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف[۸☆]

خاکِ مدینہ کا سرمہ ان کی چشمِ بصیرت کو حیرت انگیز قوتِ نظارہ عطا کرنے کا

باعث بن گیا۔ چوں کہ آپ کی شاعری انقلابی تھی، یہ انقلاب کسی باطل نظریے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ اس انقلاب نے تعلیماتِ حضور سے جنم لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا تمام تر فلسفہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیغام پر مبنی ہے۔ آپ جہاں مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کی تجلیات سے اہلِ ایماں کے دلوں کو ضو بار کرتے ہیں، وہاں اس پیغام کو فراموش نہیں ہونے دیتے جو محبتِ رسول ﷺ کے سبب سے جنم لیتا ہے۔ ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' علامہ اقبال کی معرکہ آرا نظمیں ہیں۔ ''جوابِ شکوہ'' کے اختتام میں تمثیلی انداز میں زبانِ قدرت سے عشاقِ حضور کو پیغام دیتے ہیں۔ اس پیغام میں شانِ رسول ﷺ کی جلوہ گری کا کمال دکھائی دیتا ہے کہ اے اُمتِ اسلام محبوبِ دوعالم ﷺ کی غلامی کرلو کہ اسی میں فلاحِ دارین ہے اور اسی میں تمھارے مسائل کا حل ہے:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارا ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تُو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں[۹]☆

اسی طرح اقبال ''رموزِ بے خودی'' کے آخر میں ۶۵ اشعار میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین'' کے عنوان سے بہت معنی خیز نعتیہ اشعار میں ماجراے عقیدت نذر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوبِ خدا کی عظمتوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ مسلمان کو حق اور باطل کی پہچان عطا کر دیجیے۔ اپنی مقدس دیوار کے سائے میں مجھے مرقد عطا کیجیے تا کہ اس مقدس سرزمین میں پہنچ کر میرے بے تاب دل کو چین نصیب ہو جائے اور آپ کے سایۂ رحمت میں آنے کے بعد میں آسمان سے اکڑ کر کہہ سکوں گا کہ دیکھ میرا عظیم انجام دیکھ۔ میری یہ بلند اقبالی اور خوش بختی بھی دیکھ:

اے ظہورِ تُو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند
اے بصیری را ردا بخشندۂ
بربطِ سلمیٰ مرا بخشندۂ
ہست شانِ رحمتِ گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیا ساید دلِ بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرام نگر
دیدۂ آغازم انجام نگر[☆۱۰]

علامہ اقبال نے بعض تاریخی واقعات کو اس حسنِ تأثر کے ساتھ منظوم کیا ہے کہ عظمتِ رسولِ خدا ﷺ خود بہ خود ہویدا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں آپ کی معروف نظم ''بلال'' اپنی جگہ نعت کی کیفیاتِ نور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ نعت کیا؟— عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا اظہار ہے۔ قلم اقبال کا ہے، مگر زبان بلال رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ بلال رضی اللہ عنہ جو سرزمینِ حبش سے امیہ بن خلف کا غلام بن کر مکہ میں آیا۔ قبولیتِ اسلام کی پاداش میں اس پر ظلم وستم کی انتہا کردی گئی، مگر یہی بلال رضی اللہ عنہ جب سرورِ کائنات کی غلامی کے حلقے میں آتا ہے تو اس کی غلامی پر زمانے کی آزادیاں تصدق ہونے لگتی ہیں۔ اقبال کا معجز رقم قلم بلال رضی اللہ عنہ کی شانِ اسلامی کے پسِ پردہ آقائے دوعالم ﷺ کو کس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

چمک اُٹھا جو ستارا ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی ہے اس سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چُھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا[☆۱۱]

نعت صرف لفظوں کی جادوگری یا الفاظ کی ساحری نہیں، نعت فقط مصرعوں کے روایتی شکوہ سے جنم نہیں لیتی، یہ محض اشعار کے ظاہری محاسن سے عبارت نہیں ہے، بلکہ نعت تو لذتِ عشقِ حضور عطا کرتی ہے۔ اگر عشق کی لذت نصیب نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر محبت کا گداز میسر نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر نالۂ شوریدہ سر سینہ چاک نہ کر دے تو نعت کیسی؟ اس تناظر میں ''جنگِ یرموک کا ایک واقعہ'' واقعاتی حسن کا آئینہ دار ہی نہیں، بلکہ جوں جوں یہ نعتیہ نظم آگے بڑھتی ہے، آنکھیں نم ناک ہونے لگتی ہیں۔ سوزِ دروں احساسات کے خلوت کدوں کو درہم برہم کرنے لگتا ہے۔ مکالماتی انداز ہے، مگر کمال کا اظہارِ عقیدت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب جوانانِ اسلام عساکرِ کفر کے خلاف صف بستہ تھے تو ایک شہادت کا متمنی مردِ مسلمان سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے رخصت کا طلب گار ہو کر یوں گویا ہوا:

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
بولا امیرِ فوج کہ وہ نوجواں ہے تُو
پیروں پہ تیرے عشق کا لازم ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد تری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تُو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور نے[☆۱۲]

جس دور میں علامہ اقبال کی شاعری عالمِ اسلام کو بیداریِ حیات کا پیغام دے رہی تھی، وہ وقت مسلمانوں پہ بے حد کٹھن تھا۔ کوئی بھی اسلامی ملک صحیح معنوں میں آزاد

نہیں تھا۔ باطل قوتیں عظمتِ اسلام کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ شیر جس نے صحرا سے نکل کر روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا، اب بزدل اور مصلحت کی کچھاروں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ زمانہ ہنس رہا تھا کہ یہ وہی مسلمان ہے جس کے نام کی ہیبت سے روما و ایران کی سلطنتیں لرز جایا کرتی تھیں؟ ایک طرف تو بے حسی اور قومی بے غیرتی اپنی انتہا پر تھی اور دوسری طرف مسلمان احساسِ زیاں سے بھی عاری نظر آتے تھے۔ احساسِ زیاں سے عاری ہونے کا المیہ اقبال کو زیادہ مضطرب کیے ہوئے تھا:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا ☆۱۳

اقبال جانتے تھے کہ اگر احساسِ زیاں موجود ہو تو تنزل کو ترقی میں، ذلت کو عزت میں، پستی کو بلندی میں اور غلامی کو آزادی میں بدلا جا سکتا ہے، مگر احساسِ زیاں سے محرومی آزاد قوموں سے حمیت کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ اسی اضطراب اور بے چینی میں اقبال اس آقائے رحمۃ للعالمین ﷺ کی درگاہِ بے کس نواز کی جانب رجوع کرتے ہیں جہاں سے غم کے ماروں کو قرار اور بے یقین کو یقین کی دولت عطا ہوتی ہے۔ جہاں ماجرائے غم عرض کرنے کا مقصد رحمتِ حضور کے بحرِ بے کراں کو جوش میں لانا ہے۔ان سے قبل کئی شعرا اپنے اپنے ادوار میں رنج و الم کی داستانیں سلطانِ دو عالم کو سنا کر مداوائے الم کے لیے شعری عرض داشتیں پیش کر چکے تھے۔ الطاف حسین حالی کی طرح:

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے ☆۱۴

اُمتِ اسلام پر جو کڑا وقت آن پڑا تھا اس نے اقبال کا آرام وسکوں لوٹ لیا تھا۔ اردو اور فارسی منظومات، قطعات اور متفرق اشعار میں وہ اپنی ملتجی نگاہیں گنبدِ خضریٰ کی طلعت باریوں پر جما دیتے ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ آخری ڈھارس ہے جو طوفانِ غلامی میں بہنے والوں کو سکون و عافیت کا کنارہ عطا کرے گی۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے فرشتے بزمِ رسالت ﷺ میں لے گئے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ

اے باغِ جہاں سے پرواز کر کے مجھ تک آنے والے اُمتی! تو ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کر آیا ہے، تو اقبال بہ صد احترام عرض کرتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں☆۱۵

بارگاہِ حضور ﷺ میں استغاثۂ اُمتِ اسلام کے حوالے سے مزید کچھ اشعار نذرِ قارئین ہیں:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تُو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری☆۱۶

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمت بے چاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی☆۱۷

تُو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، میرا ایمان زُناری☆۱۸

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے[☆۱۹]

نعت نام ہے عظمت و مقاماتِ حضور ﷺ سے وابستگی کا۔ محبوبِ کامل کا کمال یہی ہے کہ اس کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کو ہر پہلو سے قبول کیا جائے۔ علامہ اقبال کے زمانے میں کانگریس کے ہم نوا علما نے اپنے کانگریسی دوستوں کی محبت میں نعرہ لگایا کہ ''قومیں مذہب سے نہیں، بلکہ اوطان سے بنتی ہیں۔'' یہ نظریہ سراسر تعلیماتِ مصطفوی ﷺ کے خلاف تھا۔ برِصغیر میں محمد بن قاسم کی آمد دوقومی نظریۂ اسلام کے لیے تھی۔ خواجہ محمد معین الدین چشتی اجمیری اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات کا مرکز یہی نظریۂ اسلام تھا کہ قومیں اوطان سے نہیں، بلکہ مذہب سے بنتی ہیں۔ اس آزمائش کے وقت میں اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کا حق ادا کیا اور اپنی منظومات اور خطبات کے ذریعے واضح کیا کہ اگر دوقومی نظریۂ اسلام کو فراموش کردیا جائے تو ہمارے پاس ہندو اور انگریز کے خلاف میدانِ عمل میں آنے اور ایک مسلم ریاست کو قائم کرنے کا کیا جواز رہتا ہے؟ اقبال دوقومی نظریے کے حوالے سے اس نظریے کے دشمنوں اور مخالفین کے خلاف معرکہ آرائی کو ان کے جذبۂ عشقِ رسول سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا، کیوں کہ وہ اس نظریے کی بنیاد ہی محبتِ رسول کو قرار دیتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری[☆۲۰]

ایک جگہ کہتے ہیں:

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے[☆۲۱]

درجِ ذیل دو اشعار محبتِ رسول ﷺ کے حوالے سے دو قومی نظریے کی کیا خوب وضاحت کر رہے ہیں:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زِ مقامِ محمد عربی است
بمصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است[☆۲۲]

ان تمام تصورات کے پسِ پردہ یہ عقیدہ کارفرما تھا:

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس اُمت کو
وصالِ مصطفوی، افتراقِ بولہبی
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی[☆۲۳]

''ارمغانِ حجاز'' میں سب سے پہلے جو رباعیاں اور قطعات ہیں، ان کا عنوان ہے ''حضورِ حق''۔ ان میں دو رباعیاں حضور ﷺ سے جس عقیدت کا اظہار کرتی ہیں، وہ بے مثال ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں، ''جب یہ عالم اختتام کو پہنچے اور ہر پوشیدہ چیز آشکار ہو جائے اور اعمال کی باز پرس ہونے لگے تو اے رب العزت ہمارے اعمالِ بد کی پرسش آپ ﷺ

کی نظروں سے چھپا کر کیجیے تاکہ آپ ﷺ ہم عاصیوں کو دیکھ کر پُرملال نہ ہوں:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من زِ چشمِ اُو نہاں گیر☆[۲۴]

اسی طرح اگلی رباعی میں عجب ذوق وشوق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حضورِحق میں کہتے ہیں کہ جسم تو یہاں مکے میں پڑا ہے اور روح بے تاب و بےقرار ہے، اس شہرِ پاک کی آرزو میں کہ بطحا (مکہ) بھی جس کی راہ میں ایک منزل ہے۔ تو اے خدا! تُو یہیں بے شک مکے میں رہ (کہ تیرا گھر یہی ہے) اور اپنے دوستوں کو قرب کی منزل سے نواز، مگر مجھے تو منزلِ دوست (مدینے) پہنچنے کی آرزو ہے۔ مجھ سے یہاں اور زیادہ توقف ممکن نہیں ہے:

بدن وا ماندہ و جانم در تگ و پوست
سوے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تُو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست☆[۲۵]

ایک اور مقام پر دیکھیے کہ خودی کی خلوت و جلوت کا تصور اجاگر کرتے ہوئے اپنے آقا سے عقیدت کو واضح کرتے ہیں:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی☆[۲۶]

یہ فطری امر ہے کہ محبوب سے محبت کے سبب سے اس کی ہر چیز عزیز ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر محبوب جس زمین میں جلوہ فرما ہوتے ہیں، اس کی عظمت کے کیا کہنے۔ چاہنے والے کے لیے تو قیام گاہِ محبوب زمانے بھر سے اعلیٰ مقام رکھتی ہے:

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
آں خنک شہرے کہ آں جا دل بر است[۲۷]

اقبال کے لیے سرزمینِ طیبہ عشق وعقیدت کی سرزمین ہے۔ جہاں کے ذرّے ذرّے سے انوارِ الٰہی کا ظہور ہو رہا ہے۔ جہاں کی فضائیں سرورِ کائنات ﷺ کی خوش بوے دل نواز لیے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین پر وہ خواب گاہِ مصطفیٰ ہے جس کا فرشتے بھی طواف کرتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر جنید رحمۃ اللہ علیہ و بایزید رحمۃ اللہ علیہ نفس گم کردہ ہوجاتے ہیں۔ مدینہ جو اہلِ نظر کے لیے لطف و رحمت کا خزینہ ہے اور انوارِ فطرت کا گنجینہ ہے۔ نعت گوشعرا نے مدینہ طیبہ کی تجلیات کو دلوں میں سمو کر اس عظیم ترین شہر کو بہترین لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب اس شہرِ آرزو کا تصور کرتے ہیں تو ان کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ اقبال کے اوّلین سیرت نگار ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کہتے ہیں:

> یورپ سے واپسی پر آپ کے تأثرات نے ''بلادِ اسلامیہ'' کی مشہور نظم میں ظہور کیا۔ آپ اسلامی شان وشکوہ، دولت و اقبال، عظمت وشوکت کے ان روشن اور تاب ناک مرکزی مقامات کو یاد کرتے ہیں اور حسرت وافسوس سے مسلمانوں کی عظمت وجلالِ گزشتہ کا ذکر کرتے ہیں جن کا ظہور دہلی، قرطبہ، قسطنطنیہ جیسے عظیم مرکزوں سے صدیوں تک ہوتا رہا اور جو سارے عالم کے لیے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا خزانہ اور سرچشمہ بنے رہے، مگر یہ تمام عظمت و شوکت کے مینار ''خواب گاہِ مصطفیٰ'' کے تقدس اور جلال پر قربان ہیں۔[۲۸]

اس نظم کے آخری بند میں اقبال مدینہ طیبہ کی طلعتوں اور تجلیات کو جس طور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اس سے محبتِ رسول کی نئی اُمنگ دل و جاں میں جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔ اور عظمتِ حضور ﷺ سے اسلام کی شوکتِ رفتہ کا تصور ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

وہ زمیں ہے تُو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی ہے تُو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تُو ماوا ہے تُو
نقطۂ جاذب تأثر کی شعاعوں کا ہے تُو
جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تُو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں[۲۹]☆

کہتے ہیں کہ خوش بو کو دیکھ کر پھول کی دل آویزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کرنیں چاند کی تجلیات اور شعاعیں سورج کی ہمہ گیری کا اظہار ہوتی ہیں۔ اس طرح محبِّ صادق کی طلبِ صادق، جذبۂ ایثار، قربانی و استقامت اور عشق میں والہانہ پن کو دیکھ کر محبوب کے حسن کی جاذبیت اور تأثر انگیزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اقبال کا محبوب تو محبوبِ خدا و ملائکہ ہے۔ یہ وہ محبوب ہے جس کی خاطر کونین تخلیق ہوئے۔ اسی محبوبِ دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے عشاق اور جاں نثاروں کو دیکھ کر آپ کی عظمت و تقدیس کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال ''غزوۂ تبوک'' کا ذکر کرتے ہیں اور حبِ رسول میں ڈوب جانے والے دوسرے عشاق کے پہلو بہ پہلو عظیم جاں نثارِ رسول سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا ذکر جس دل آویز انداز سے کرتے ہیں اس سے سلطانِ مدینہ کی کشش اور تأثر انگیزی کا حیرت انگیز حد تک خوب صورت اندازہ ہوتا ہے۔ غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کے پاس ساز و سامان تھا اور نہ ہی ہتھیار۔ جنگ ناگزیر تھی۔ سلطانِ مدینہ ﷺ نے امداد کی اپیل کی تو مخیّر صحابہ اپنا اپنا اثاثہ لے کر

بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضر ہونے لگے۔ اس نظم کے اختتامی اشعار دیکھیے:

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے اُستوار
بولے حضور ﷺ ''چاہیے فکرِ عیال بھی''
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
''اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے ، بلبل کو پھول بس
صدیق ؓ کے لیے ہے خدا کا رسول ﷺ بس''☆[۳۰]

اقبال کی متفرق منظومات سے چند نعتیہ اشعار۔ ان منظومات میں سے کسی کا عنوان بھی ''نعت'' نہیں ہے، مگر ہر شعر اپنے اندر بے شمار نعتیہ مضامین کو سموئے ہوئے ہے:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا☆[۳۱]

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے☆[۳۲]

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں☆[۳۳]

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کردے☆[۳۴]

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب[۳۵]☆

محبتِ رسول تقاضا کرتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی کامل اتباع کی جائے۔ محبت صرف لفظی ساحری نہیں ہے۔ یہ محض ایک خوش نما لفظ نہیں ہے، بلکہ اس کے پسِ پردہ ایک مکمل فلسفۂ اطاعت پوشیدہ ہے۔ ربِ کریم نے اپنے محبوب ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ (۴/۸۰)

یعنی جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، اُس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

علامہ اقبال بھی اس حوالے سے نبیِ کریم ﷺ کی غیر مشروط فکری، علمی، نظری اور عملی اطاعت اور اتباع کے قائل ہیں۔ آپ بجاطور پر سمجھتے ہیں کہ کامل اتباع کے بغیر ملتِ اسلامیہ کے غموں کا علاج ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ترقی کی آرزو ہے تو خدا سے لَو لگا کر محمد مصطفیٰ ﷺ کی راہِ مستقیم پر گامزن ہوجاؤ۔ پھر تمھیں وہ عروج ملے گا جس کا تصور بھی محال ہے:

بمنزل کوش مانندِ مہِ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

وہ اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال دیتے ہیں کہ ان کی اتباعِ رسول ﷺ اور تقلیدِ نبوی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ساری عمر محض اس لیے خربوزہ نہ کھایا کہ انھیں معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ رسولِ خدا ﷺ نے خربوزہ کس طرح کھایا تھا:

کامل بسطام در تقلید فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار
تا کمند تو شود یزداں شکار☆[۳۷]

اسی طرح آپ ایک غزوہ میں حاتم طائی کی بیٹی کے قید ہونے اور حضور نبیِ کریم ﷺ کا ان کے سر پر ردائے رحمت رکھنے کا پیغام دے کر فرزندانِ اسلام کو اس حوالے سے اطاعتِ مصطفیٰ کا دل نشیں سبق دیتے ہیں:

در مصافے پیشِ آں گردوں سریر
دخترِ سردارِ طے آمد سیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود
گردن از شرم حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست اُو
در جہاں ہم پردہ دارِ ما ست اُو☆[۳۸]

یہ سوال ہر صاحبِ نظر کے لبوں پر اُبھرتا ہے۔ وہ اقبالؔ جو تمام زندگی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے آداب سکھاتا رہا، وہ اقبال جس کی شاعری کاروانِ اسلام کو منزلِ حجاز کی جانب گامزن کرتی رہی، وہ اقبال جس کے شب و روز محبتِ رسول ﷺ کے تذکار سے عبارت تھے، وہ اقبال جو محبتِ رسول کے حوالے سے کسی سمجھوتے یا قیل و قال کا قائل نہ تھا، وہ اقبال کہ جس کی حضور ﷺ سے محبت کسی جواز یا دلیل کی محتاج نہیں تھی، جو حضور کے نام پر جیتا رہا، اور آخری دم تک محبتِ رسول ﷺ کے سرمدی نغموں سے سرمست ہی نہیں رہا، بلکہ ایک زمانے کو سرمستی کے آداب سکھاتا رہا، وہ اقبال بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضری سے کیوں محروم رہا؟

مختلف تذکرہ نگاروں نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ نغمۂ عشق کی لے کو تیز سے تیز تر کرتے گئے اور اس میں زندگی بیت گئی۔ کسی نے لکھا کہ جب وہ گول میز کانفرنسوں کے سلسلے میں باہر گئے، فلسطین سے بھی گزرے تو خیال آیا کہ حجازِ مقدس کا سفر بہ طورِ خاص ہونا چاہیے۔ کسی اور سفر کو اس سفر کے لیے وسیلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ایک صاحبِ ذوق نے لکھا کہ ان کا عشقِ رسول ﷺ اس مقام کو پہنچا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں پہنچ جاتے تو پھر وہیں جان دے دیتے۔ ایک اور صاحبِ عشق نے کہا کہ اقبال کی مہجوری ایک زمانے کو لذتِ وصال بخشنے کا بہانہ بن گئی— سب کی تاویلات اپنی جگہ، بہرحال یہ امر انتہائی مسلمہ اور طے شدہ ہے کہ اقبال کا عشقِ رسول ﷺ اصحابِ نظر کی آبرو اور اہلِ شوق کے لیے حاصلِ جستجو تھا۔ فقیر سیّد وحید الدین لکھتے ہیں:

> جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس لوٹے تو والد صاحب مرحوم اُن سے ملنے گئے۔ بڑی مدت بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد صاحب مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا، ''اقبال! اگر تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی بھی سیر کی تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ چہرے پر زردی چھاگئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے، فقیر! میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔[۳۹] ☆

مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں:

> حضرت علامہ کی طبیعت کا یہ سوز و گداز عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور عشقِ رسول ﷺ میں ان کی سرشاری اور استغراق کمال کے درجے پر جا پہنچا۔ آخر میں تو یہ حال ہوگیا تھا کہ ذرا حضور ﷺ کا نام کسی کی زبان

پر آیا اور آپ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ اسی طرح آپ کو فریضۂ حج کی ادائی اور روضۂ پاک کی زیارت کی شدید آرزو تھی جو وقت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی تھی۔ آخری زمانے میں بیماریوں اور ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا۔ مگر اس وقت بھی یہی لگن تھی کہ شاید طاقت عود کر آئے اور مجھے یہ مقدس سفر نصیب ہوجائے۔[۴۰]

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر فرماتے ہیں:

اقبال کا قلبی تعلق حضور سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور کا ذکر آتے ہی اُن کی حالت دگرگوں ہوجاتی تھی۔ اگرچہ وہ فوراً ضبط کرلیتے تھے۔ چوں کہ میں بارہا اُن کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا، اس لیے میں نے اُن کے سامنے تو نہیں کہا مگر خاص لوگوں سے بطورِ راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور ﷺ کے مرقد پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہیں جاں بحق ہوجائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔[۴۱] ☆

علامہ اقبال دسمبر ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں حضرت علامہ مخدوم سیّد غلام میراں شاہ کو لکھتے ہیں:

الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریکِ حال ہوں۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا، لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضۂ مبارک پر یاد بھی کیا جاسکوں۔ تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے: الطالح لی (گنہ گار میرے لیے ہے)۔ امید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر

مجھے فراموش نہ کریں گے۔[۴۲]☆

یہ تمام اقتباسات اس حقیقت کی گواہی ہیں کہ اقبال محبتِ رسول ﷺ میں دیوانہ وار تڑپ رہے ہیں۔ ان کے تخیلات اور تصورات کی دنیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلووں سے آباد ہے۔ ان کے افکار کا مرکز اور ان کے احساسات کا معدن حبِ رسول ﷺ ہے۔ یہی حبِ رسول ﷺ ان سے زندگی بھر عشق و عقیدت کا خراج لیتی رہی۔ ان کی شبوں کا گداز، ان کی صبحوں کا نیاز، ان کی شاعرانہ تگ و دو ان کی عاشقانہ جذباتیت سب کے پسِ پردہ سلطانِ مدینہ ﷺ کی چاہت جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ ان کی نظم ''ذوق وشوق'' کا انداز اس امر کی علامت تھا کہ وہ خود کو دربارِ رسول ﷺ میں حاضری کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اقبال جسمانی طور پر تو دیارِ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر نہ ہوسکے، مگر زندگی کے آخری دور میں انھوں نے ''ارمغانِ حجاز'' کی دنیا آباد کرلی۔ انھوں نے تصورات کے دوش پر سفر کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی حاضری کا عزم کرلیا۔

یہ عجیب سفرِ نور تھا کہ اقبال کا جسم تو لاہور میں تھا، مگر ان کے تخیلات شہرِ مدینہ کی جانب رواں دواں تھے۔ انھوں نے اپنے عشق و عقیدت کے سہارے تصورات کی دنیا آباد کرکے اس طور سفر کا آغاز کیا کہ اگر کوئی حقیقتِ حال سے آگاہ نہ ہو تو اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ اقبال کا یہ سفر جسمانی نہیں، بلکہ سراسر روحانی تھا۔ انھوں نے روحانی طور پر خود کو مسافرِ مدینہ اور زیارت کے لیے شدت سے تڑپنے والا زائر تصور کرکے ان تمام تراکیب، استعارات، اشارات، جذباتی تڑپ، والہانہ کسک، بے تابی و بے قراری، مدہوشی و سرشاری، فکری لگن، روحانی لگاؤ اور والہانہ پن سے کام لیا ہے جو ایک مسافرِ پُرشوق کا خاصہ ہوتی ہیں۔ قاری جوں جوں اقبال کا ہم نوا اور فکری طور پر ہم سفر بن کر آگے بڑھتا ہے، اقبال جیسی بے قراری اس پر بھی طاری ہونے لگتی ہے۔

''ارمغانِ حجاز'' آپ کی آخری تصنیف ہے جو آپ کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں صفحات ۲۵ سے ۸۶ تک جو رباعیات اور قطعات درج ہیں، ان کا عنوان ہے ''حضورِ رسالت''۔ اقبال اپنی داستانِ شوق کا آغاز کرتے ہیں کہ بڑھاپے

اور ضعف کے عالم میں، میں نے مدینے کا سفر اختیار کیا ہے۔ میں اس پرندے کی طرح ہوں جو شام کے وقت صحرا میں اپنے گھونسلے میں اُترنے کے لیے اپنے پروں کو کھولتا ہے:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ[۴۳]☆

ایک بند میں اپنے نغمات اور نالوں کے مقامات کا ذکر کرتے ہیں۔ میں نے صحرا میں ڈیرا جمایا ہے تا کہ خلوت کو آباد کر کے اکیلا ہی سلطانِ دو عالم ﷺ کی مدح سرائی کیا کروں:

چہ پرسی از مقاماتِ نوایم
ندیماں کم شناسد از کجایم
کشادم رختِ خود را اندریں دشت
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم[۴۴]☆

اب صحرا کی تعریف کرتے ہیں کہ کیا خوب صورت صحرا ہے کہ درود و سلام کے نغمات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس صحرا کی گرم گرم ریت پر جبینیں ٹکا دو تا کہ یہ سجدے تمھاری پیشانیوں کا اعزاز بن جائیں:

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا
درد وے خواند و محمل مراند
بہ ریگِ گرمِ اُو آور سجودے
جبیں را سوز تا داغے بماند[۴۵]☆

جوں جوں اقبال کا راہوارِ تخیل سرزمینِ حجاز کی طرف آگے کو بڑھتا ہے، نعت کی لَے تیز سے تیز تر ہونے لگتی ہے۔ بدن لرزیدہ اور قدم لغزیدہ ہونے لگتا ہے۔ ہر لمحہ احترامِ حضور ﷺ دل میں اُجاگر ہونے لگتا ہے کہ میں کدھر کو جا رہا ہوں۔ یہاں تو ملائک

بھی خمیدہ سر حاضر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عرفی شیرازی نے کہا ہے:

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را

اسی کیفیت کو امام احمد رضا خاں یوں بیان کرتے ہیں:

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے ☆۴۶

اقبال بھی اپنے ناقے سے احتیاط سے قدم آگے کو بڑھانے کو کہتے ہیں کہ اے ناقے اپنے سوار کی حالت کو مدِنظر رکھ اور اس کے اندر احترام وعقیدت کا جو سمندر موجزن ہے، اس کو اپنی روح میں سمو کر آگے بڑھ۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بپائش ریگِ ایں صحرا حریر است ☆۴۷

یہی مضمونِ عقیدت اس رباعی میں بھی نئے انداز سے جلوہ گر ہے:

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خنداست
شبش کوتاہ و روزِ او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ
چو ما ہر ذرّۂ اُو دردمند است ☆۴۸

اقبال خود پر غور کرتے ہیں اور امیرِ کارواں سے اپنے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ عجمی کون ہے؟ عربی نہ ہوکر بھی اپنے شاداب نغمات سے دلوں کو زندگی کی طراوت عطا کر رہا ہے:

امیرِ کارواں آں اعجمی کیست
سرودِ اُو بآہنگِ عرب ایست

زند آں نغمہ کز سیرابیِ او
خنک دل در بیابانے تواں زیست ☆۴۹

اقبال کہتے ہیں کہ اے ساتھی آ، تا کہ ہم دونوں باہم آہ و زاری کریں۔ ہم دونوں کسی کے جمالِ جہاں آرا کے طلب گار ہوں، آ کہ ہم دونوں اپنے آقا و مولا کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں اور دلوں کے درد کا اظہار کریں:

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تُو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے او مرادِ دل بگوییم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم ☆۵۰

آگے عرض کرتے ہیں کہ یہاں اہلِ دانش کی حاجت نہیں۔ کیسی خوش قسمتی اور کیسا مبارک زمانہ ہے کہ مجھ فقیرِ بے نوا کو آستانِ شاہ پر حاضری میسر آ گئی:

حکیماں را بہا کم تر نہادند
بناداں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے ، چہ خرم روزگارے
درِ سلطاں بہ درویشے کشادند ☆۵۱

اقبال عظمتِ رسول کو گواہ بنا کر بڑے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! مسلمان اگرچہ فقیر ہے، مگر کج کلاہی کی شان رکھتا ہے۔ اس کا سینہ جل رہا ہے۔ اے خدا کے محبوب رسول ﷺ اس خستہ ساماں کو نگاہِ کرم سے نوازیں:

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے
رمید از سینۂ اُو سوزِ آہے
دلش نالہ چرا نالہ؟ نداند
نگاہے یارسول اللہ! نگاہے ☆۵۲

اقبال بارگاہِ حضور ﷺ میں اپنی فریاد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے

دلوں کی گرمی آپ کے سوزِ غم کی بہ دولت ہے۔ مجھے ہندوستان میں ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو آپ کے نظریات کا سچا پیروکار اور آپ کے اسرار سے آشنا ہو:

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست
نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند
ندیدم بندۂ کو محرمِ تست ☆۵۳

محبتِ رسول ﷺ میں گم ہوکر اقبال کو عراقی اور جامی کے نغمہ ہائے عشق محبوب تر ہوجاتے ہیں اور وہ ساربان کے پُرشوق نغموں کی حلاوت میں کھو جاتے ہیں:

گہے شعرِ عراقی را بخوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را
شریکِ نغمہ ہائے ساربانم ☆۵۴

سرزمینِ حجاز کی جانب سفر کرتے ہوئے ساربان سے کہتے ہیں کہ لمبے راستے سے ہوکر چل تاکہ جدائی کا سوز اور بھڑک سکے:

غمِ راہِ نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں آمیز تر کن
بگیر اے ساربان راہے درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن ☆۵۵

دنیا میں لادینی پھیلی ہوئی ہے۔ اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ بے کس نواز سے فقرِ صدیق رضی اللہ عنہ طلب کرتے ہیں تاکہ ایمان کو سوز اور حرارت عطا ہو۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را
ز آثارِ بدن گفتند جاں را

ازاں فقرے کہ با صدیق دادی
بشورے آور ایں آسودہ جاں را☆[۵۶]

اقبال اپنی قوم کا نوحہ حضور کی بارگاہ میں عرض کرتے ہوئے اپنی فکری بے حسی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے مگر اس میں بسنے والا محبوب نہیں رکھتی:

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند☆[۵۷]

اقبال سرورِ کائنات ﷺ کو اپنی بے کسی کا ماجرا سناتے ہیں کہ اے شاہِ کونین! آپ سے انصاف کا طالب ہوں۔ میرے یاروں نے مجھے غزل خواں سمجھ رکھا ہے، مرے کھجور کے درخت سے کسی نے بھی اس کا میٹھا پھل نہیں کھایا:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تُو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند☆[۵۸]

شاعرِ مشرق کی عاجزی انتہا کو چھونے لگتی ہے کہ یارسول اللہ ﷺ ہمیں اپنے آستانے سے نہ دھتکاریے۔ صبر کے علاوہ جو حکم چاہیں دیں اور صبر ہمارے لیے محال ہے۔ لذتِ حضوری سے بہرہ ور فرمائیں:

مرا از در کہ مشتاقِ حضوریم
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم
بفرما ہر چہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از وے دو صد فرسنگ دوریم☆[۵۹]

علامہ عرض کرتے ہیں کہ ابھی میری آگ میں چنگاری چھپی ہوئی ہے۔ آپ میری آنکھوں پر اپنی تجلی آشکار فرما کر دیکھیں کہ اس ضعف کے باوجود میرے اندر ابھی

تابِ نظارہ موجود ہے:

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست
تجلی ریز ہر چشمم کہ بینی
بایں پیری مرا تابِ نظر ہست ☆۶۰
(ہست)

ارشادِ مصطفیٰ ﷺ ہے ”من رأنی فقد رای الحق“ (جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کا دیدار کیا)۔ یہ حدیثِ پاک اقبال کے تصورات کی دنیا میں عشق و سرمستی کا آفتاب بن کر جگمگا رہی ہے۔ اسی لیے کمالِ ادب سے عرض کرتے ہیں کہ میری آنکھوں کی روشنی آپ کی عطا کردہ ہے۔ مجھے ”من رأنی“ کی صبح سے فیض یاب فرمائیے کہ میری رات کی ظلمتوں کو کافور کرنے والے چاند کی چاندنی آپ ہی کی آوردہ ہے۔ یہ رباعی نعتیہ مضمون کے حوالے سے انتہائی متأثر کن اور جاذبِ فکر ہے:

بچشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبحِ من رآنی
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست ☆۶۱

اقبال کہتے ہیں کہ عشق کی دولت آپ کے سینۂ اقدس سے حاصل ہوتی ہے اور مجھے جبریل علیہ السلام کی بابت صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی آئینۂ رسالت کے ایک جوہر کا نام ہے:

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست
سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل
کہ او یک جوہرِ از آئینۂ تست ☆۶۲

شاعر کا جذبۂ عشق اور مچلتا ہے کہ یارسول اللہ! میرا سوز آپ ہی کا فیضان ہے۔

میرے انگوروں کی بیل کی شراب آپ ہی کے آبِ زمزم سے نکلی ہے۔ میری درویشی سے کسریٰ و جمشید شرماتے ہیں، کیوں کہ میرا دل آپ ہی کے اسرار کا محرم ہے:

مرا ایں سوز از فیضِ دمِ تست
بتاکم موجِ مے از زمزمِ تست
خجل ملکِ جم از درویشیِ من
کہ دل در سینۂ من محرمِ تست ☆۶۳

آگے جاکر اقبال کی آرزو نیا آہنگ اختیار کرتی ہے، اور کہتے ہیں کہ ادب دامن گیر ہے اور بات کو مختصر سے مختصر کرنا چاہتا ہوں:

حضورِ ملتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گدازے آفریدم
ادب گوید سخن تا مختصر گویے
تپیدم ، آفریدم ، آرمیدم ☆۶۴

اقبال اپنے آنسوؤں کو لالے کے خون میں ملا دینے کی آرزو کرتے ہیں کہ اگر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار بننے کے قابل نہیں ہوں تو مجھے وہ نظر عطا کیجیے جو علی رضی اللہ عنہ کی طرح تیز ہو:

گلستانے ز خاکِ من بر انگیز
نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علی را
نگاہے دہ چو شمشیرِ علی تیز ☆۶۵

اگلی رباعی میں اقبال عشق و سرمستی کی انتہا کو چھونے لگتے ہیں۔ نعت و مدحت کے گُل ہائے سدا بہار بکھیرنے لگتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے کوچے میں دلِ پُرسوز کی ایک ہی صدا کافی ہے۔ میرے لیے یہی ابتدا ہے، یہی انتہا۔ میں اس رندِ پاک باز کی جرأت پر آفریں کرتا ہوں اور حیرت زدہ ہوں کہ وہ کیسے بڑے مقام پر تھا جو اس نے خدا سے

برملا کہہ دیا تھا کہ ''ہمارے لیے مصطفیٰ کافی ہیں۔'' ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ ظاہر ہے کہ عشق وعقیدتِ مصطفیٰ کی بلندیوں کو چھونے والا رندِ پاک باز اقبال کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے:

بکوئے تُو گدازِ یک نوا بس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جرأتِ آں رندِ پاکم
خدا را گفت ''ما را مصطفیٰ بس'' [۹۶]☆

روضۂ رسول ﷺ جانِ قلب و نظر، راحتِ جان و دل ہے۔ نورِ آ گہی ہے، جمالِ بزمِ ہستی ہے۔ مخزنِ انوارِ قدرت ہے، مرکزِ اسرارِ فطرت ہے۔ وہ روضۂ اقدس کہ جس کے حضور تصور سے ہی پیشانیاں عرق آلود ہوجاتی ہیں کہ یہ اس ہستی کی خواب گاہ ہے جس کی ذات روحِ کائنات اور جس کا وجہ دو عالم میں سرمایۂ نجات ہے۔ روضۂ رسول ﷺ کی عظمت و جلالت کا احساس شہنشاہوں کے جسموں پر ہی نہیں، بلکہ افکار پر بھی کپکپی طاری کر دیتا ہے۔ عشاق پر شہرِ مدینہ کو دیکھ کر اور روضۂ رسول ﷺ کی تجلیات کو دلوں میں بسا کر کیا گزرتی ہے، اس کا اندازہ سیّدنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے جذبۂ احترام کو دیکھ کر ہوجاتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

نبی ﷺ کا جس جگہ پر آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

اقبال کے لیے بھی شہرِ مدینہ اور روضۂ رسول ﷺ قلب و نظر کی معراج کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوسرے عشاق کی طرح ان کا دل بھی چاہتا ہے کہ شہرِ مدینہ کے ذرّاتِ ریگ زار کو پلکوں سے بوسے دیں۔ روضۂ رسول پر پلکوں سے جاروب کشی کریں۔ پلکوں کی کناریوں پر جھلملاتے آنسوؤں سے کشتِ عقیدت کو نم بخشنے کا اہتمام کریں، مگر ظاہر بیں اور تنگ نظر اصحاب کی جانب سے مخالفت کا خدشہ بھی دامن گیر ہے جو محبوب کے حضور فرطِ عقیدت سے جھکنے کو سجدے سے تعبیر کرکے ان کے ذوق وشوق کو پابندِ احتساب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال اس رباعی میں سلطانِ حجاز عبدالعزیز اور دیگر محتسبین تک اپنا قلبی مدعا پہنچاتے

ہیں کہ یہ سجدہ ہرگز نہیں۔ سجدہ تو خدا کے علاوہ کسی کو جائز نہیں۔ میں تو پلکوں سے محبوب کے در کی جاروب کشی کر رہا ہوں:

تُو ہم آں مے بگیر از ساغرِ دوست
کہ باشی تا ابد اندر برِ دوست
سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں
بروبم از مژہ خاکِ درِ دوست[۶۷☆]

مدینہ طیبہ کی عظمتیں اس حقیقت کا اعلانِ عام ہیں کہ:

یہ کوچۂ حبیب ہے پلکوں پہ چل کے آ

یہی حقیقت اقبال کے پیشِ نظر ہے۔ مدینہ طیبہ کے حوالے سے اقبال کا تصور کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ سلطانِ دو عالم ﷺ کا مدفن ہے جہاں سے زائرین کو ہر پل مژدۂ شفاعت عطا ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کی عظمت اپنی جگہ، وہاں بیت اللہ ہے۔ مقامِ حج ہے، مکہ مکرمہ قبلہ گاہِ اسلامیاں ہے، مگر اسے قبلہ گاہِ اسلامیاں اس ہستیِ والا صفات نے بنایا ہے جو آج مدینہ طیبہ کے پُرانوار ماحول میں آرام کر رہی ہے۔ احادیث گواہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حالتِ نماز میں تھے، امامت فرما رہے تھے۔ صحابہ مقتدی تھے، دل میں خیال آیا الٰہی اب بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا قبلہ تبدیل کر دے۔ اسی لمحے وحی نازل ہوئی کہ اے محبوب تم جدھر کو رُخ کرو گے، وہی تمھارا قبلہ بن جائے گا۔ اس وحی کے ساتھ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا رخِ انور مکہ معظّمہ کی طرف کر لیا۔ گویا مکہ معظّمہ کا قبلہ گاہ بننا بھی رضائے مصطفوی ﷺ کا اعجاز ہے۔ اور نعت گو شعرا نے اس مضمون کو اپنے انداز میں محسوس کیا ہوگا، مگر اقبال نے اس سے یہی پیغام لیا:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل ، وہی آخر
وہی فرقاں ، وہی قرآں ، وہی یٰسین ، وہی طٰہٰ

''ارمغانِ حجاز'' میں اقبال عشق و عقیدتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے اس مضمون

کو اس اچھوتے، منفرد اور ایمان افروز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عشاق حضور ﷺ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عظمتِ مصطفوی ﷺ کی لافانی سربلندیوں سے آگاہ کر گئے:

در آں دریا کہ اُو را ساحلے نیست
دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتم
وگرنہ جُز تو ما را منزلے نیست ☆۶۸

اقبال کے دل میں عشق کی شمع فروزاں رہی ہے۔ اس لیے وہ انفرادی اور اجتماعی غم سلطانِ مدینہ کو سناتے ہیں۔ انھیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے سناتے سناتے قرار آ گیا ہو، قلبِ مہجور کو تسلی مل گئی اور اُمتِ اسلام کی مشکلات کے آسان ہوجانے کا وقت آ گیا ہو۔ عشقِ محمد ﷺ اُن کے رگ و پے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ ان کے اشعار نعت کے مروّجہ اسالیب نہ رکھتے ہوئے کمال درجے کی نعت معلوم ہوتے ہیں۔ درجِ ذیل اشعار کا مطالعہ کیجیے اور اقبال کی غایت درجہ محبتِ رسول کی لطافت محسوس کیجیے۔ فرماتے ہیں:

اے تُو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

اے مقام و منزلِ ہر راہ رو
جذبِ تُو اندر دلِ ہر راہ رو
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
قم باذنی گوئی و اُو را زندہ کن
در دلش اللہ ہُو را زندہ کن
شہسوارا! یک نفس در کش عناں
حرفِ من آساں نیاید بر زباں
گردِ تو گردد حریمِ کائنات

از تو خواہم یک نگاہِ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
اے پناہِ من حریمِ کوے تو!
من بامیدے رمیدم سوے تو
چوں بصیری از می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بُود
مہرِ تُو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چُو مہرِ مادر است[۶۹]

اقبال ایک نظم میں جس کا نام ''ایک حاجی مدینے کے راستے میں'' ہے، ایک زائرِ مدینہ طیبہ کی تڑپ کا حال بیان کرتے ہیں۔ اس دور میں حجازِ مقدس کا سفر غیر محفوظ تھا، اور لوگ محفوظ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے، مگر ایسے جاں باز محبِّ رسول ﷺ بھی ہوتے تھے جنھیں سفرِ مدینہ میں کسی حفاظت کی آرزو نہ ہوتی تھی کہ اس مبارک سفر میں اگر وہ قربان بھی ہوجائیں تو یہ ان کے لیے عین سعادت کی بات تھی۔ ایسے ہی ایک مسافرِ پُرشوق کا حال دیکھیے جس کے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور کئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے:

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی
خنجرِ رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا
''ہاے یثرب'' دل میں ، لب پر نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا تھا کہ ''یثرب کی طرف تنہا نہ چل''
شوق کہتا ہے کہ ''تُو مسلم ہے بے باکانہ چل''
''بے زیارت سوے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا''

خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز[☆۷۰]

کچھ ایسی ہی کیفیت معروف نظم ''شفاخانۂ حجاز'' میں نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں مولانا ظفر علی خاں تک یہ اطلاع پہنچی کہ انگریز سرزمینِ حجاز (مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ) میں انگریزی شفاخانے کھولنے لگتے ہیں۔ مولانا فوراً علامہ اقبال کے پاس آئے۔ تمام صورت بتا کر بڑے غمگین لہجے میں کہا کہ، ان شفاخانوں کے ساتھ ہی یورپ کی طرف سے الحاد و بے دینی اور بے غیرتی کا سیلاب بھی آئے گا۔ علامہ اقبال نے تسلی دی کہ مطمئن رہیے، ایسا نہیں ہوگا۔ وہ چلے گئے تو آپ نے یہ نظم انھیں ''زمیندار'' میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ یہ نظم دھوم دھام سے ''زمیندار'' کے صفحۂ اوّل پر چھپی۔ انگریز نے مسلمانوں کے جذبات سے لرز کر منصوبہ ختم کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب ایک پیشوائے قوم نے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو میں نے کہا:

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور ﷺ یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا[☆۷۱]

معراجِ مصطفیٰ ﷺ ایک عظیم معجزہ اور تاریخِ عشق و ایماں کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نعت گو شعرا نے معراجِ حضور کو اپنے اپنے انداز سے دیکھا اور قلم بند کیا۔ شاید ہی کوئی نعت گو شاعر ہو جس نے اپنے اشعار میں معراج کے واقعے کو موضوعِ نعت نہ بنایا ہو۔ بعض نے تو اس پر طویل نعتیں لکھیں اور بعض نے ''معراج نامے'' لکھ دیے، مگر اقبال

کا اسلوب یہاں بھی منفرد اور بے مثال ہے۔ مختصر مگر انتہائی نتیجہ خیز ہے۔ کہتے ہیں:

اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات ☆۷۲

چوں کہ معراج کی عظمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملی تو حضور سرورِ کائنات ﷺ اُمتِ اسلام کے آقا و مولا ہیں۔ اس لیے اقبال معراجِ رسول ﷺ کے حوالے سے اُمتِ رسول ﷺ کو ہمت و جرأت اور فلک پیمائی کا پیغام دے رہے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں ☆۷۳

معراجِ نبوی کی عظمت و جلالت دیکھ کر کائنات دنگ ہے۔ جن و ملک، ماہ و انجم سب عالمِ حیرت میں گم ہیں:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے ☆۷۴

جوں جوں اقبال کی شاعری کا سفر نئی منزلوں کی جانب بڑھتا گیا۔ آپ کے افکار کی وسعتیں بھی اپنی معراج کو چھونے لگیں۔ آپ نے زمانے بھر کے علوم وفنون پڑھے، مگر محبّتِ رسول ﷺ کی تجلیات کو کسی بھی بحث یا تاویل کا محتاج نہیں ہونے دیا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی نعت مروّجہ اسالیب سے ہٹ کر ہے۔ جہاں تک مقاماتِ رسول ﷺ کی بلندیوں کا تعلق ہے، آپ ان کی رسائی کے لیے کسی بھی محبِّ صادق یا نعت گو شاعر سے آگے نظر آتے ہیں، مگر آپ نے نعت کو پیرایۂ اظہار بناتے ہوئے ہمیشہ اُمتِ اسلام تک ذاتِ رسول کے حوالے سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کے ابتدائی دور میں آپ کے اشعار میں روایتی نعت گوئی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے، مگر جلد ہی اقبال اس انداز سے گزر گئے اور اپنی آفاقی سوچ کے ذریعے اردو

اورفارسی شاعری میں نعت گوئی کی روایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اقبال کے ابتدائی اسلوبِ نعت کا جائزہ لینے کے لیے ان کی ایک نعت سے کچھ اشعار پیش ہیں تا کہ علامہ اقبال کے ابتدائی نعتیہ رنگ کی ایک جھلک بھی قارئین کے سامنے آجائے:

لحد میں سوتے ہیں تیرے عاشق تو حورِ جنت کو اس میں کیا ہے
کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر
جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنت میں دل نہ بہلا
تسلیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر
تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا
دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر
رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے
کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے زرِ شفاعت دکھا دکھا کر
پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے
دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر
ترے ثنا گو عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر
خیالِ راہِ عدم سے اقبالؔ تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ سفر نہیں ہے ، صلہ مری نعت کا عطا کر ☆۷۵

اس نعت کے تمام اشعار اس اسلوبِ نعت میں لکھے گئے ہیں جو مدتوں سے مروّج ہے۔ غزلیہ انداز ہے، مگر محبوب وہی ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہے جو تمام زندگی اقبال کے افکار اور محسوسات کا محور بنی رہی۔ اگر چہ غزل قدیم انداز میں ہے، مگر مضمون آفرینی کا حسن اپنی جگہ۔ مقطعے میں اس قدر عاجزی ہے کہ پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں:

بغل میں زادِ سفر نہیں ہے ، صلہ مری نعت کا عطا کر

اقبال کوئی بھی پیغام دیتے ہیں، خودی یا بے خودی کا تذکرہ کرتے ہیں، مردِ مومن یا

شاہین کا ذکر چھیڑتے، فقر و سرمستی یا آزادیِ برِصغیر کی بات کرتے ہیں، اتحادِ عالمِ اسلام یا تہذیبِ مغرب کے خلاف جہاد کے عزم کا اعلان کرتے ہیں، ان کی ہر گفتگو اور ہر جستجو کا حاصل ذاتِ مصطفیٰ اور نعتِ مصطفیٰ ﷺ ہی ٹھہرتی ہے۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت کی انتہائی پختگی کا ثمر تھا، فقیر سیّد وحید الدین نے آپ سے پوچھا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں تو علامہ اقبال نے فرمایا، ’’ایک مرتبہ فارمن کرسچین کالج، لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے، ’چائے پی کے چلے نہ جانا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔‘ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آگئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے، ’اقبال مجھے بتاؤ کہ تمھارے پیغمبر پر قرآنِ حکیم کا مفہوم نازل ہوا تھا، اور چوں کہ انھیں صرف عربی زبان آتی تھی۔ انھوں نے قرآنِ حکیم عربی زبان میں منتقل کردیا، یا یہ عبارت ہی اس طرح اُتری تھی؟‘ میں نے کہا، ’یہ عبارت ہی اُتری تھی۔‘ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ، ’اقبال تم جیسا پڑھا لکھا انسان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اُتری ہے۔‘ میں نے کہا، ’ڈاکٹر لوکس! یقین— بلکہ میرا تجربہ ہے، مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اُتری ہوگی۔‘‘[۷۶☆]

دیکھیے! اقبال کے جواب میں کوئی بحث طلب یا اُلجھاوے والی بات نہیں، اُنھیں اپنے رسولِ کریم اور قرآنِ حکیم پر ایمان و یقین کی پختگی ہی اس طرح عطا ہوئی تھی کہ وہ دوسرا جملہ کہنے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔

شاعرِ مشرق کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی وابستگی کا ثمر یوں عطا ہوا کہ ان کے نعتیہ اشعار بقاے دوام حاصل کر گئے۔ زمانہ صدیوں کی مسافتیں طے کرتا رہے گا، مگر اقبال کے نعتیہ کلام کی تب و تاب میں کمی رونما نہیں ہوگی، بلکہ ہر آنے والا دور اس سے فیض یاب ہوتے ہوئے فخر محسوس کیا کرے گا۔ مروّجہ اسلوب میں باقاعدہ نعت گوئی نہ کرنے کے باوجود بھی علامہ اقبال، توصیفِ مصطفیٰ ﷺ میں اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ

زمانے بھر کے نعتیہ دواوین سے ان کے نعتیہ اشعار کا مقام و مرتبہ اولیٰ تر ہے، کیوں کہ انھوں نے کوئی بھی نعتیہ کلام نعت برائے نعت کے حوالے سے نہیں لکھا، بلکہ ان کی نعت مفاہیم و مضامین کا قلزمِ بے کنار اپنے دامن میں لیے ہوئے تھی۔ نئے سے نیا پیغام، نئی سے نئی بات، نئی سے نئی تجلی، غرضے کہ تجلیاتِ نعت کی فراوانی نے ان کی نعت کو عالم گیریت عطا کر دی ہے۔

سلطانِ دو عالم ﷺ سے غیر معمولی محبت اور عشق وعقیدت نے انھیں تاریخِ اسلام کا مردِ مومن بنا دیا۔ وہ مردِ مومن کہ جس کی عظمتوں کو وقتِ آخر انھوں نے یوں سلام کیا تھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اور پھر اقبال کی وہ رباعی جو انھوں نے اپنے وصال سے چند منٹ پیش تر پڑھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ سانس بھی رُک رُک کر چل رہا تھا۔ بعض اوقات آنکھوں کے اشارے اور ہاتھ کی جنبش سے کچھ سمجھاتے تھے۔ آپ کے ایک بزم آشنا راجا حسن اختر کی روایت کے مطابق۔

راجا حسن اختر کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم نے انتقال سے تقریباً دس منٹ قبل اپنا حسبِ ذیل قطعہ پڑھ کر وقت آجانے کا اعلان کر دیا تھا:

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

بلاشبہ وصال سے قبل اس نوعیت کی رباعی کہہ جانا اقبال کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ اور یہ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ ہی کا صدقہ ہے کہ ربِ کریم نے اقبال کو وقتِ آخر یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ اپنی مدحت طرازیوں کو ''نسیمے از حجاز آید کہ ناید'' کا نام دے کر محبتِ رسول ﷺ کی خوش بوئے دل نواز سے زمانے بھر کو مہکانے کا اہتمام کر جائیں۔ اقبال کے قلب ونظر

میں، افکار و محسوسات میں، عمر بھر محبتِ رسول نے اپنا مقام بنائے رکھا۔ یہی محبتِ رسول ﷺ ان سے زندگی بھر توصیف و ثنا کا خراج لیتی رہی۔ اقبال نے جو سرمایۂ مدحتِ رسول ﷺ چھوڑا ہے ہم نے اس سے اجمالاً خوشہ چینی کی ہے ورنہ وہاں تو ہر ساعت ''جہانِ دیگر'' کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا ''جہانِ دیگر'' کہ جس میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ہر ورق اور ہر صفحہ زمانے بھر کے توصیف نگاروں سے ہٹ کر نئے ہی اسلوب میں نعت اور تعلیماتِ حضور ﷺ کے ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے اسلوب طرازوں سے کہیں زیادہ رومی، عرفی اور جامی و بصیری کے قافلے کا خوش بخت مسافر تھا۔ اس کی نعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی محبت کے والہانہ پن کا اظہار کر رہی ہے اور وہ اسلامیانِ عالم کو محبتِ رسول کا آفاقی پیغام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو میری بات پر غور کرے اور حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی رمز شناس آنکھوں سے دیکھے تو حضور نبیِ کریم ﷺ تیرے لیے دل و جگر کی قوت بن جائیں گے اور ان کی ذاتِ گرامی خدا سے زیادہ محبوب بن جائے گی:

معنیِ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی ☆۷۸

سیّدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے نبیِ کریم ﷺ اس لیے محبوب تر تھے کہ انھوں نے اپنے محبوب ﷺ کی سیرت و صورت میں خدا کو دیکھا۔ اقبال کا عشقِ رسول ﷺ اور اقبال کی نعتیہ شاعری بھی ہمیں نعتِ رسول ﷺ کے حوالے سے مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کو پہچان کر خدا شناسی کا پیغام دے رہی ہے۔

حواشی

۱۔ ''ارمغانِ حجاز'' (اردو)، ص۶۲۔
۲۔ فقیر سیّد وحید الدین، ''روزگارِ فقیر''، جلد اوّل، ص۹۴۔
۳۔ ایضاً

۴۔ ''اسرار و رموز''، ص۱۹۔
۵۔ ''جاوید نامہ''، حلاج، ص۱۲۸۔
۶۔ ''بالِ جبریل''، حصہ دوم، ص۳۹۔
۷۔ ایضاً، ''ذوق وشوق''، ص۱۱۶۔
۸۔ ایضاً، ص۴۹۔
۹۔ ''بانگِ درا''، جوابِ شکوہ، ص۲۲۱۔۲۲۰۔
۱۰۔ ''اسرار و رموز''، رحمۃ للعالمین، ص۱۶۶۔
۱۱۔ ''بانگِ درا''، بلال، ص۹۰۔
۱۲۔ ایضاً، جنگِ یرموک کا ایک واقعہ، ص۲۶۰۔
۱۳۔ ایضاً، ''شمع اور شاعر''، ص۱۹۸۔
۱۴۔ الطاف حسین حالی، ''دیوانِ حالی''۔
۱۵۔ ''بانگِ درا''، حضور رسالت مآب ﷺ میں، ص۲۰۹۔
۱۶۔ ایضاً، ص۲۶۴۔
۱۷۔ ایضاً، ص۲۹۳۔
۱۸۔ ''بالِ جبریل''، ص۴۸۔
۱۹۔ ''ضربِ کلیم''، اے روحِ محمد ﷺ، ص۶۱۔
۲۰۔ ''بانگِ درا''، مذہب، ص۲۶۱۔
۲۱۔ ایضاً، وطنیت، ص۱۷۱۔
۲۲۔ ''ارمغانِ حجاز'' (اردو)، حسین احمد، ص۶۲۔
۲۳۔ ''ضربِ کلیم''، امرائے عرب سے، ص۷۷۔
۲۴۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص۱۸۔
۲۵۔ ایضاً، ۱۹۔
۲۶۔ ''بالِ جبریل''، ص۸۴۔
۲۷۔ ''اسرار و رموز''، ص۲۱۔
۲۸۔ محمد طاہر فاروقی، ''اقبال اور محبتِ رسول ﷺ''، ص۱۵۱۔
۲۹۔ ''بانگِ درا''، بلادِ اسلامیہ، ص۱۵۶۔
۳۰۔ ایضاً، صدیق، ص۲۳۶۔
۳۱۔ ایضاً، ''ترانۂ ملّی''، ص۱۷۰۔
۳۲۔ ایضاً، ص۱۱۶۔

۳۳۔ ایضاً، شفاخانۂ حجاز، ص۲۱۵۔
۳۴۔ ایضاً، جوابِ شکوہ، ص۲۲۰۔
۳۵۔ ''بالِ جبریل''، ذوق وشوق، ص ۱۱۷۔
۳۶۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص۶۵۔
۳۷۔ ''اسرار و رموز''، ص۲۲
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۰۔
۳۹۔ فقیر سیّد وحید الدین، ''روزگارِ فقیر''، حصہ اوّل، ص۳۷۔
۴۰۔ جلال الدین بیرسٹر، ''ملفوظاتِ اقبال''۔
۴۱۔ سیّد عبدالرشید فاضل، ''اقبال اور عشقِ رسالت مآب ﷺ''، ص۵۲۔۵۱۔
۴۲۔ شیخ عطاء اللہ، ''اقبال نامہ''، حصہ اوّل، ص۲۲۸۔
۴۳۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص۲۴۔
۴۴۔ ایضاً، ص۲۵۔
۴۵۔ ایضاً، ص ۲۶۔
۴۶۔ احمد رضا خاں، ''حدائقِ بخشش''، ص۵۶۔
۴۷۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص ۲۵۔
۴۸۔ ایضاً، ص۲۷۔
۴۹۔ ایضاً۔
۵۰۔ ایضاً، ص۲۹۔
۵۱۔ ایضاً۔
۵۲۔ ایضاً، ص۳۰۔
۵۳۔ ایضاً، ص۳۱۔
۵۴۔ ایضاً، ص۲۸۔
۵۵۔ ایضاً، ص۲۹۔
۵۶۔ ایضاً، ص۳۸۔
۵۷۔ ایضاً، ص۴۱۔
۵۸۔ ایضاً، ص۴۳۔
۵۹۔ ایضاً، ص۴۶۔
۶۰۔ ایضاً، ص۵۰۔
۶۱۔ ایضاً، ص۵۲۔

۶۲۔ ایضاً،ص۵۴۔

۶۳۔ ایضاً۔

۶۴۔ ایضاً،ص۵۵۔

۶۵۔ ایضاً،ص۵۶۔

۶۶۔ ایضاً،ص۵۹۔

۶۷۔ ایضاً،ص۶۰۔

۶۸۔ ایضاً،ص۴۶۔

۶۹۔ مثنوی پس چہ باید کرد،ص۴۸۔

۷۰۔ ''بانگِ درا''، ایک حاجی مدینے کے رستے میں،ص۱۷۲۔

۷۱۔ ایضاً، شفاخانۂ حجاز،ص۲۱۰۔

۷۲۔ ایضاً، شبِ معراج،ص۲۶۲۔

۷۳۔ ''بالِ جبریل''،ص۴۵۔

۷۴۔ ایضاً،ص۴۵۔

۷۵۔ ''ارمغانِ نیاز''، مکتبۂ دین و ادب، لکھنؤ،ص۱۲۶۔

۷۶۔ فقیر سیّد وحید الدین، ''روزگارِ فقیر''، جلد اوّل،ص۳۸۔

۷۷۔ ''ارمغانِ حجاز''،ص۱۲، بہ حوالہ سیرتِ اقبال، محمد طاہر فاروقی،ص۶۹۔

۷۸۔ ''اسرار و رموز''، رسالت،ص۱۰۱۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید

''بانگِ درا'' کی نعتیہ تب وتاب

''بانگِ درا'' ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والا، اقبال کا وہ پہلا اردو مجموعۂ کلام ہے جس نے اقبال کو عوام الناس میں متعارف بھی کرایا اور ان کے پیغام کی عظمت و رفعت کے لیے اساسی حیثیت کا کام بھی دیا۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر شعرِ اقبال کا رفیع الشان قصر وجود میں آیا۔ اس میں نظمیں زیادہ اور غزلیں کم ہیں۔ لسانی شکوہ، اہلِ نظر اور تماشائی ہر دو کے لیے معتبر دل آویزیوں کا حامل ہے۔ اس کتاب میں پیغامِ اقبال، اس شاہین کے مانند ہے جو اپنے نشیمن میں مقیم اور پرواز کے لیے بے چین ہو، اور اس کی نگاہ دور بہت دور آفاق کی لافانی وسعتوں پر لگی ہوئی ہو، یا پھر اس دیو کی طرح جو انگڑائی لیا چاہتا ہو۔ ''بانگِ درا'' میں وطن دوستی کا رنگ بھی ہے اور غیر مسلم شخصیات کی مداحی بھی، داغؔ کی شستگیِ زبان بھی ہے اور امیرؔ کا رنگِ تغزل بھی۔ انگریزی شعر و ادب سے استفادہ بھی موجود ہے اور منظر نگاری کے دل کش نمونے بھی۔ البتہ خیالات کی گہرائی اور فکر کی سنجیدگی کے مقابلے میں مشاہدے کی گہرائی اور اسلوب و ادا کی رعنائی نمایاں ہے۔ اس میں وہ نظمیں بھی ہیں جو زبان کے اعتبار سے آسان ہیں اور جنھیں بچوں کے ادب میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ گویا ابتدائی نوعیت کے اس کلام میں فکری اعتبار سے وہ پختگی نہیں ہے جو بعد میں اقبال کا طرۂ امتیاز بنی، اس میں مشاہداتی نظموں کی بھرمار ہے جب کہ ''ضربِ کلیم'' میں اس نوع کی کوئی نظم بھی نظر نہیں آتی اور نہ الفاظ و تراکیب کا کوئی ایسا شکوہ دکھائی دیتا

ہے۔ وہاں فکر کی عظمت غالب ہے، اور زبان و ادا ثانوی ہوکر رہ گئے ہیں اور شاعر اقبال، حکیم الامت کی مفکرانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اقبال کے اپنے الفاظ میں ''بانگِ درا'' کی بیش تر نظمیں میرے طالب علمی کے زمانے کی ہیں۔

حضور ﷺ کی محبت ہر مسلمان دل کا سرمایۂ ایمان ہے۔ مولا کریم نے اقبال کو اس سرمائے سے حصۂ وافر عطا کیا تھا اور یہ اس کریم کا کرمِ خاص بھی ہے اور بڑے نصیب کی بات بھی:

دہد حق عشقِ احمد بندگانِ چیدۂ خود را
بہ خاصاں می دہد، شہ بادۂ نوشیدۂ خود را

گو ''بانگِ درا'' اقبال کا ابتدائی کلام ہے، مگر اس میں بھی جہاں حضور ﷺ کا اسمِ گرامی آتا ہے، اقبال کا قلم آنسوؤں کے گوہر لٹانے کے ساتھ ساتھ، محبت کے پھول برسانے کے لیے بھی بے چین نظر آتا ہے۔ نعت، رسولِ کریم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ بھی ہے اور اُن کی ذاتی پسندیدگیوں کا شعری بیان بھی۔ یہ پسند اشخاص سے لے کر اعمال تک اور مقامات سے لے کر آثار تک پھیلی ہوئی ہے۔ نعت گو کا قلم ان خوش نصیب اصحاب کے حضور میں بھی سجدۂ نیاز پیش کرتا ہے جنھوں نے انوارِ رسالت کو چشمِ سر سے دیکھا۔ وہ ان فضاؤں کو بھی سلام کہتا ہے جن میں ممدوح کے سانسوں کی مہک رچی ہوئی ہے۔ وہ ریت کے ان ذرّوں کو بھی اپنی بھیگی ہوئی پلکوں سے چومتا ہے جنھیں حضور ﷺ ہی کے خرامِ ناز کی وجہ سے ریشم کا لوچ عطا ہو چکا ہے:

جاوید ہمیں باش بایں نعت و بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ بہ افعال
وصفش ہمہ تقدیس ز پیوند و ز فرزند
نعتش ہمہ تنزیہہ ز امثال و ز اقوال

نعت کی اس تعریف کی روشنی میں ''بانگِ درا'' کے نعتیہ رنگ و آہنگ کی ایک اجمالی کیفیت یوں ہے۔

''بلال رضی اللہ عنہ'' کے عنوان سے ''بانگِ درا'' کی سینتیس ویں اور اس اعتبار سے پہلی نظم ہے کہ اس میں نعت کا رنگ بھی ہے اور بلال رضی اللہ عنہ کے پردے میں خود اقبال کے اپنے دل کی دھڑکنیں، روح کی لرزشیں اور نگاہوں کی تمنائیں بھی شعر کے پیرہن میں انوار بکھیرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ نظم ۱۹۰۴ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوئی تھی۔ بلال رضی اللہ عنہ ایک حبشی غلام تھے۔ ان کے مالک کا نام اُمیہ بن خلف تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام میں سبقت لے جانے والوں میں سے تھے۔ اس بنا پر وہ ناقابلِ برداشت ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ تپتی ریت اور جلتے سنگ ریزوں پر گھسیٹے گئے، دہکتے انگاروں پر لٹائے گئے، لوہے کی زرہ پہنا کر سورج کی آتشیں کرنوں میں بٹھائے گئے، مگر ان کی زبان ''احد، احد'' کے ترانے الاپتی رہی۔ جرم کتنا حسین ہے اور سزا کتنی دردناک اور مقصود کتنا ارفع و اعلیٰ۔

اس جرم میں پہنچے ہیں سرِدار کہ ہم لوگ
اس قامتِ زیبا کو بھلا کیوں نہیں دیتے

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں خرید کر آزاد کردیا جب کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم خریداری میں شمولیت کی آرزو فرمائی۔ اسلام کے پہلے مؤذّن بلال رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ فتحِ مکہ کے بعد انھی کی زبان سے کعبے کی چھت پر توحید کا نغمہ گونجا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام کی طرف، جہاد کی غرض سے گئے۔ ۲۰ھ میں دمشق کے مقام پر فوت ہوئے۔ حضرت عمر، حضرت بلال کو ''سیّدنا'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ قلبی تعلق اور روحانی نسبت بھی کتنی عظیم نعمت ہے، استوار ہوجائے تو زندگی مقصود مہروماہ بن جاتی ہے، کٹ جائے، تو دربدر آبرو ہوکر رہ جاتی ہے. اس نظم کا عنوان بہ ظاہر ''بلال رضی اللہ عنہ'' ہے، مگر حقیقتاً اس نظم کا ہر شعر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاب وتب لیے ہوئے ہے۔ اقبال اپنے مکاتیب میں شعر کی دل رُبائی سے بہت ہی کم کام لیتے ہیں، مگر انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس نظم کے آخری شعر کو ان الفاظ کے ساتھ درج کیا ہے:

میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں، مشاغلِ ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالمِ تخیل میں قرونِ اولیٰ کی

سیر، مگر خیال کیجیے جس زمانے کی تخئیل اس قدر حسین و جمیل و روح افزا ہے، وہ زمانہ خود کیسا ہوگا:

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

یہ نظم بتاتی ہے کہ کسی وجودِ رعنا کے عشق میں ہونے والا ستم، لطف و راحت کی تمہید ہوا کرتا ہے۔ عشق کے مرحلے بھی عجیب ہیں اور انداز بھی نرالے۔ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ ترستے رہے کہ رخِ خیرالبشر صلی اللہ علیہ وسلم چشم سے دیکھا بھی جاسکے گا یا نہیں، وہ کاسہ ہائے چشم کو شفاف بنانے ہی میں عمر بتا گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ جی بھر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے باوجود، دیکھتے ہی رہے کہ انھیں دیکھنا عین عبادت تھا اور عبادت بھی ایسی جس سے دل کبھی سیر نہ ہو۔ عادت، عبادت ہوجائے تو سراپا کیف ہوجاتی ہے، مگر عبادت، عادت بن جائے تو لطفِ نیاز کھو دیتی ہے۔ لمحاتِ دید میں حسرتِ دید قائم رہے تو شوق جوان رہتا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کی نگاہیں رخِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر مچل مچل کر ''نمازِ نیاز'' ادا کیا کرتی تھیں۔ ان کی اذان عشق کا ترانہ تھی اور ان کی آواز، قلبِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے موجبِ فرحت:

وہ آستاں نہ چُھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا بھی طور تھا گویا
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

اس نظم میں جہاں لفظی شکوہ اور قلبی ناشکیبائی کا ایک حسین امتزاج ہے وہاں فنی حسن بھی تشبیہات کی شکل میں موجود ہے:

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا
اویسؓ ، طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر

عشق کی برق آشامی نے بلال رضی اللہ عنہ کی سیاہ فامی کو، موسیٰ علیہ السلام کے یدِ بیضا کے لیے وجہِ رشک بنا دیا تھا، مدینہ انوار کی بستی تھی اور بلال رضی اللہ عنہ اسی طُور کے کلیم تھے۔ اور ادا شناسیِ نبوت کے لیے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بہ طورِ تشبیہ لانا بھی چند لفظوں میں تاریخ کی وسعتوں کو سمیٹ دینا ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ، ہر دنیاوی تعلق سے کٹ کر ''ابنِ اسلام'' ہو گئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اہلِ بیت میں سے قرار دیا تھا۔ سلمان ساوجی کا مصرع ہے:

چوں محمد گفت ''السلمان من اہلِ بیت''

''بانگِ درا'' حصہ اوّل کے آخر میں دی گئی غزلوں میں سے نویں غزل جنوری ۱۹۰۴ء کے ''مخزن'' میں چھپی تھی۔ گو غزل کا ہر شعر مختلف الاحوال ہوتا ہے، مگر اس غزل میں فکری تسلسل اس نوع کا ہے کہ شروع میں اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو پا کر خود عظیم ہو جانے کا ذکر ہے۔ درمیان میں، اللہ کے ان بندوں کا تذکرہ جن کی موجِ نفس بجھتے ہوئے دیوں کو روشن کر دیا کرتی ہے اور آخر میں چھ اشعار نعتیہ انداز لیے ہوئے ہیں:

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

بھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ''ما عرفنا'' پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں
خموش اے دل، بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

وہ شرر جو خرمنِ دل کو یوں پھونک دے کہ خورشیدِ محشر بھی اس کا خوشہ چیں ہوجائے، حبِ رسول ﷺ ہی کے طفیل حاصل ہوسکتا ہے، اور یہی شرر، مقصدِ زندگی ہے۔ اور یہ محبت انھی دلوں میں انوار برساتی ہے جو سوز و گداز کی دولت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ گویا اس شرر کے حصول کے لیے صلاحیت اور ظرف لازم ہے، اور اقبال کا یہ کہنا نہ معلوم ان کے دل کی کس کیفیتِ طلب کا آئینہ دار ہے کہ حضور ﷺ ایسے حسین سے دل لگانے والا خود سراپا حسن بن جاتا ہے، کیوں کہ اس حسن کا طواف تو خود حسن آفریں کرتا ہے۔ بہ قول حافظ مظہر الدین رحمۃ اللہ علیہ:

جو حسن میرے پیشِ نظر ہے اگر اسے
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

اور یہی وجہ ہے کہ جب اس حسینِ کامل کی زبانِ فصاحت نثار سے خالقِ حسن نے یہ سنا کہ ''ہم نے تجھے اس طرح نہ پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا'' تو اس ادائے ناز پر وہ اس قدر پھڑک گیا کہ انھیں معراج کی شکل میں دید کی سعادت بھی عطا ہوئی اور اجمل و احسن ہونے کا شرف بھی ملا، عرفانِ کامل کے باوجود، اعترافِ نارسائی، شانِ عبودیت بھی ہے اور شوقِ طلب کی بے پایانی بھی۔ اقبال یہ تمنا بھی کرتے ہیں کہ کاش، عقل کے پرستار اس حسن کا ایک جلوہ دیکھ لیں تو ان کی بصارت، بصیرت کے نور سے مستنیر ہوجائے، اور آخر میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضورِ ناز میں سکوت بولتا، آنسو چھلکتے اور دھڑکنیں حالِ دل کہتی ہیں۔ اور ادب ہی وہ قرینہ ہے جس سے محبت بال و پر لیتی اور انتہائے عشق کو چھو کر کیمیا ہوجاتی

ہے۔ اس غزل میں اقبال نے پہلے عاشق کا، پھر عشق کا پھر محفلِ محبوب کا اور پھر خود محبوب کا ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس، کائنات کا مقصود اور محبت کی معراج ہے۔

گیارھویں غزل جون ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی۔ اس کے آخری شعر میں اقبال، غبارِ راہِ حجاز ہوجانے کی تمنا کرتے ہیں:

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے الفاظ میں ''اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ رسول ﷺ کا رنگ اقبال کے دل میں جوانی ہی سے کارفرما تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ حجاز نہ جاسکے، لیکن عشقِ رسول ﷺ کی یہ دولت لاکھوں مسلمانوں کے محبوب ضرور بن گئے۔ اگر انھوں نے اپنے آپ کو سرکارِ دو عالم ﷺ کے عشق میں فنا کردیا تو حضور ﷺ نے بھی انھیں زندہ جاوید کردیا۔''

''بانگِ درا'' کے آخر میں دی گئی غزلوں میں، پہلی غزل کا پہلا شعر ہے:

اے بادِ صبا ، کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمت بے چاری کے ، دیں بھی گیا ، دنیا بھی گئی

گویا اُمت نے اتباعِ رسالت مآب ﷺ سے منہ موڑا تو دنیاوی اعتبار سے بھی ذلت اس کا مقدر بن گئی، کیوں کہ:

ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

اسی طرح تیسری غزل کا چوتھا شعر بھی نعتیہ رنگ لیے ہوئے ہے:

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سنتے ہی ایمان لے آئے اور استفسار پر یہی کہا کہ ''محمد ﷺ کا چہرہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔'' دوسری طرف ابوجہل عقل عیار کا شکار رہا اور خاسر و نامراد ہوا اور نہ سمجھ سکا:

رودِ آواز پیمبر ﷺ معجزہ است

اقبال نے ۱۹۰۸ء میں میونخ (جرمنی) کے مقام پر ''وصال'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی، گو یہ نظم مجازی نوعیت کی ایک متغزلانہ سعی ہے، مگر اس سے ان کے دل کے گداز، روح کی پیاس اور نظر کی تمنا کا ضرور پتا چلتا ہے کہ کیسے ان کے دل کے گوشے گوشے میں آتشِ غم شرر بار ہے، اور اس بات کا اندازہ بہ خوبی ہوسکتا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں اقبال کا دل عشق کے جس سوز سے آتش کدہ بنا ہوا تھا، وہ سوز جب حجاز کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہوا ہوگا تو پھر کیا سے کیا ہوگیا ہوگا۔ تابشِ خورشید سے ذرّے بھی ٹکرا جائیں تو ماہتاب ہوجاتے ہیں، اور جو پہلے ہی ماہتاب ہو اس کے رشکِ صد طور ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ اس دور کی اس نظم کے چند شعر ہیں:

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے
غازۂ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکسِ ہم دمِ دیرینہ ہے
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے
یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کے خاشاکِ مرا واسوختی

اس دور کی ایک نظم ''پیامِ عشق'' میں اقبال، مجاز سے حقیقت، فرد سے ملت، صحرا نوردی سے محفل آرائی، فرقہ سازی و طریقِ آزری سے قوی یک جہتی تک پہنچ چکے ہیں اور بتوں سے دامن بچا کر، غبارِ راہِ حجاز ہونے کے شرف سے مشرف ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وہ فکری ارتقا ہے جس نے اقبال کو نہ صرف حکیم الامت بنایا، بلکہ دوقومی نظریے کی اساس کو بھی مستحکم کیا، اقبال کے جسمِ خاکی نے ۱۹۰۸ء میں اس دیارِ ناز میں سراپا نیاز بننے کی تمنا یوں کی تھی:

وجود افراد کا مجازی ہے ، ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ حجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اور یوں لگتا ہے کہ انیس ویں صدی کے اوائل ہی میں خالقِ آرزو نے اقبال کے دل میں لگن پیدا کر دی تھی کہ اس نے خود تڑپنا بھی ہے اور اوروں کو تڑپانا بھی ہے۔ اور یہ طے ہو چکا تھا کہ شعرِ اقبال نے عشقِ رسول ﷺ سے حرارت لے کر، ایک عہد کے عروقِ مردہ کو خونِ زندگی دینا ہے اور نقش ہائے حضور ﷺ سے تابانیاں سمیٹ کر دلوں کی وادیوں میں نور بکھیرنا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مارچ ۱۹۰۷ء میں اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری ، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نظم ''بلادِ اسلامیہ'' میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ یاد دلانے کی ایسی سعی کی ہے جس میں جذبہ، جنوں آفرینیوں کے جلو میں انگڑائی لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ نظم تاریخی حقائق کا ایک شاعرانہ اظہار ہے اور تاریخ کا مقصود ہی یہ ہے کہ گرے ہوئے دل و دماغ ہمیشہ کے لیے گرے ہوئے نہ رہیں، بلکہ وہ اُبھریں، بلند ہوں اور یہاں تک بلند ہوجائیں کہ عزت کی سب سے اونچی سطح پر پہنچ جائیں۔ اس نظم میں اقبال دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینہ منورہ کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ علاقے ہماری شوکتِ دیرینہ کے مظہر ہیں۔ آخری بند میں جب مدینہ منورہ کا ذکر آتا ہے تو اقبال کے دل میں چھپا ہوا نعت گو، مچل مچل کر سامنے آتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ ذکر اس ''خنک شہر'' کا ہے جو دو عالم سے خوش تر بھی ہے اور دو عالم کی عقیدتوں کا مرکز بھی۔ اقبال کے نزدیک یہی وہ سرزمینِ پاک ہے جو احساسات و کیفیات کی جملہ شعاعوں کا نقطۂ جاذب ہے۔ مدینہ صبحِ دل نواز ہے تو ہم قطراتِ شبنم، وہ مرکز ہم دائرہ۔

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولایت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم ﷺ کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس شہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے ، وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیّتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی ، نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تُو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تُو
جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

نظم ''ترانۂ ملّی'' کا نواں، دسواں شعر بھی خاکِ بطحا کے لیے بہنے والے خونِ مسلم کی رعنائیوں اور حضور ﷺ کے لیے قلبی عقیدتوں کا اظہار ہیں:

اے ارضِ پاک ، تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز ﷺ اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

''حضورِ رسالت مآب (ﷺ) میں'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی کرب کو اس بارگاہِ بندہ نواز میں پیش کرتے ہیں کہ وہی ایک دیوار ہے جس سے دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے انگریز کی ایما و اعانت

سے طرابلس پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ طرابلس سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ، بلکہ صوبہ تھا، ترک اس کی مدد کے لیے مصر کے راستے آسکتے تھے، مگر انگریز نے اس راستے کو روک دیا تھا، جب کہ مسلمان بحری طاقت سے محروم تھے۔ ترک غیر معروف راستوں سے طرابلس پہنچے، عربوں اور مصریوں نے بھی اعانت کی، اور یوں مسلمانوں نے طرابلس کو بچانے کے لیے لیبیا کے ریگ زار کو لہو سے سرخ کر دیا۔ انگریز نے جنگ کا رخ موڑنے کے لیے بلقانی ریاستوں سے ترکی پر حملہ کرا دیا، اور یوں وہ اپنی سیاست اور شرارت میں کامیاب رہا۔ اقبال نے یہ نظم شاہی مسجد لاہور میں ۱۹۱۲ء میں پڑھی تھی۔ یہ جلسہ ترک بھائیوں کی مالی امداد کے لیے مولانا ظفر علی خاں کی کوشش سے منعقد ہوا تھا۔

اس تصوراتی نظم کا آخری بند نعتیہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اس میں جہاں غمِ زمانہ کی ایک خوب صورت آمیزش ہے، وہاں شاعر کے دردِ دل کا ایک بے ساختہ اظہار بھی ہے:

حضور ﷺ ، دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو ، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

''شفاخانۂ حجاز'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال حجاز کے ذرّوں میں تحلیل ہو جانے کی تمنا کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک دیارِ محبوب میں موت کو لبیک کہنا اور انھی راستوں کا غبار بن جانا، زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے کہ یہ حیات عارضی ہے اور موت، صبحِ دوامِ زندگی ہے۔ ایسی موت پر ہزاروں زندگیاں نثار کہ یہی موت زندگی کی دلیل اور حریمِ ناز تک رسائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ حجاز میں شفاخانہ بنا کر، اس کے

لیے چندہ جمع کر کے، آپ کم نظر لوگوں کو تو پیغامِ زندگی دے سکتے ہیں، مگر میں تو اس دیارِ خنک آثار میں مٹنا اور یہیں کی مٹی بن جانا چاہتا ہوں کہ اس مٹی کو حضور ﷺ کے مبارک قدم چومنے کا شرف مل چکا ہے، شمس وقمر کی درخشانیاں، ان کے نقوشِ پا کی تابانیوں پر نثار۔

اوروں کو دیں حضور ، یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں دیارِ حجاز میں

''جوابِ شکوہ'' بہ ظاہر اللہ پاک کی طرف سے، قبل ازیں کیے جانے والے شاعرانہ شکوے کا جواب ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۳ء میں بیرونِ موچی دروازہ، لاہور، بعد نمازِ مغرب پڑھی گئی۔ یہ جلسہ مولانا ظفر علی خاں کی سعی سے ترکوں کی مالی امداد کے لیے منعقد ہوا تھا۔ یہ نظم مومنانہ گداز کا ایک شاعرانہ اظہار ہے۔ مقصود یہی ہے کہ مسلم، پیغامِ محمد ﷺ سے بیگانہ ہو گیا۔ نتیجہ معلوم کہ نہ اس کے دل میں سوز ہے نہ روح میں احساس، ہولے ہولے وہ پتھروں سے بھی سخت ہوتا جا رہا ہے۔ اگر وہ محمد ﷺ سے وفا کرے یعنی ان ﷺ کی اطاعت کا حق ادا کرے اور ان کی اتباع سے اپنی زندگی کو نور بنا لے تو آج بھی وقت کی ہر قوت، اس کے قدموں تلے ہوگی، اور اس کی ہر تدبیر، تقدیر کے سانچے میں ڈھل کر اعجاز ہو جائے گی۔ نتیجہ معلوم کہ وہ اس کائناتِ ارضی میں ایک چلتی پھرتی آیتِ الٰہی بن جائے گا۔ اس طویل نظم کے آخری پانچ بند، اپنے اندر نعتیہ جمال کا کمال لیے ہوئے ہیں کہ حبِ رسول ﷺ جہاں ہمارے ایمان کی شرعی اساس ہے۔ ہماری دنیاوی کامرانیوں کی تمہید بھی ہے۔ یہ بنیاد اگر قائم ہو تو پھر اسلام کو پھلنے اور پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حبِ رسول ﷺ اور ارتقائے ملت دونوں ہم رشتہ ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جو اقماش جاں پر بنی ہوئی ہے، حقیقت بکھر نہیں سکتی، مگر چاہیے کہ مسلمان خود کو بکھرنے سے بچائے:

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کردے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش، خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری

تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

حضور ﷺ کا اسمِ گرامی ایک دائمی رفعت اور وسعت کا حامل ہے۔ یہ سائنسی حقیقت ہے کہ زمین گول ہے۔ سورج مختلف اوقات میں، مختلف مقامات پر طلوع ہوتا ہے، دنیا میں اوقات مختلف ہیں۔ بنا بریں دنیا میں ایک منٹ نہیں، ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا جب کہیں نہ کہیں نماز کا وقت نہ ہو اور کوئی نہ کوئی مسلمان نماز نہ پڑھ رہا ہو اور اپنے آقا ﷺ پر درود نہ بھیج رہا ہو اور یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے صدیوں پہلے فرما دیا کہ ''ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا'' اور مندرجہ بالا اشعار اسی حقیقت کا مظہر ہیں۔

نظم ''ارتقا'' کا پہلا شعر ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغِ مصطفوی ﷺ سے شرارِ بولہبی

یہ شعر اس نوع سے نعتیہ ہے کہ اسے پڑھتے ہی وہ پورا دور تصور میں گھوم جاتا ہے کہ کس طرح اہلِ مکہ، حرفِ حق کے خلاف یک جا ہوگئے تھے، اور کیسے حرفِ حق بلند ہوتے ہوتے دار کی بلندیوں تک آ گیا تھا۔ اہلِ باطل نے شمعِ صدق کو ہر انداز سے گل کرنا چاہا تھا، مگر ان کی پف زنی ناکام رہی اور اس شمع کا نور مکمل ہوکر رہا۔ اور یہ شعر اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ حق و باطل ازل ہی سے دست و گریباں رہے ہیں اور زندگی کا سارا حسن، سعیِ مسلسل میں مضمر ہے۔

۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقعے پر حضور ﷺ نے چندے کی اپیل فرمائی۔ اس موقعے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گھر کی ہر شے پیش فرما دی۔ اقبال نظم ''صدیقؓ'' میں اسی واقعے کو بیان کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے جب استفسار فرمایا کہ اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑ آئے تو اس رفیقِ نبوت اور مردِ وفا سرشت نے جو جواب دیا، اس میں ایک شعر

خالص نعت کا ہے:

بولے حضور ﷺ ، چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات ﷺ باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے ، بلبل کو پھول بس
صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

دوسرے شعر پر غور کیجیے۔ نعت کے کتنے ہی مضمون اس ایک شعر میں ضو ریز ہیں۔ حضور ﷺ ہی کے طفیل کائنات رنگین و رعنا ہے۔ ان کے تبسم سے کلیاں چٹکتی تھیں، ان کے گردِ سفر سے کہکشاں کو لباسِ نور ملتا تھا، ان کے قامتِ زیبا سے کہسار سربلندی پاتے تھے اور ان کی تشریف فرمائی سے فرش کو عرش کی رعنائی نصیب ہوتی تھی۔ جود و کرم کا یہ ہر لحظہ برستا ہوا بادل نہ ہوتا تو کائنات سراب ہوتی۔ دوسرا مصرع اس نکتے کو واضح کر رہا ہے کہ آپ ﷺ ہی کی ذات، وجہِ وجودِ کائنات ہے۔ ہماری ہر آبرو، اسی نام کے طفیل ہے، اسی ذاتِ گرامی قدر ﷺ کا عشق تابندگی و پائندگی کی دلیل ہے۔ اس صداقت کو اقبال، قبل ازیں اپنی نظم ''بلال رضی اللہ عنہ'' میں واضح کر چکے ہیں کہ سکندرِ رومی عظیم فاتح ہو کر بھی وقت کی گردش میں گم ہو گیا، مگر نورِ نبوت سے مستنیر بلالِ حبشی رضی اللہ عنہ زندۂ جاوید ہے کہ ان کے دہن سے اُبھرنے والے کلمات، اذان کی صورت میں لحہ لحہ اور قریہ قریہ گونج رہے ہیں اور اقبال اس استفہامیہ انداز میں کہتے ہیں:

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا ، حبشی کو دوام ہے

گویا عشقِ ہی وہ چمن بے نظیر ہے جس کے پھول مرجھانے کے لیے نہیں کھلتے، یہ ایک بہارِ بے خزاں ہے اور اس جذبے کی چاندنی سے لحد کی تاریکیاں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

شبِ معراج پر اقبال کے دو شعر اپنے اندر اس رات کی فضیلتوں کے ساتھ ساتھ اس عزمِ صمیم کا ذکر بھی لیے ہوئے ہیں جو فکرِ اقبال کا خاص جوہر ہے، اور جس کے سامنے آسمان، ردائے نیلگوں سے زیادہ وقیع نہیں اور جس کے طفیل، گردوں، عالمِ بشریت کی زد میں ہے:

دخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

''میں اور تُو'' ایک ایسی نظم ہے جس میں اقبال نے اپنے دردِ دل کو شعر کے رنگ میں یوں پیش کیا ہے کہ وہ ہر دل کی تڑپ بن گیا ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیہ کی پریشاں حالی کا ذکر ہے کہ شیوۂ آذری ہمارا شعار ہے۔ ہم ایک بے کیف نغمہ اور بے رنگ و بُو پھول ہیں۔ ایسے میں اقبال کی نظر اسی آستاں کی طرف اُٹھتی ہے اور وہیں ٹک جاتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نقشِ پا کی تابانیوں کو پا لینے کے بعد، کسی اور منزل کی تلاش توہینِ جستجو ہے۔ یہ تعلق استوار ہو جائے تو نانِ جویں، قوتِ حیدری بن کر اُبھرتی ہے اور فقرِ غیور، غنا کے سانچے میں ڈھل کر، وقت کے ہر سکندر کا سر، پائے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر نعت کے ایک ایسے مضمون کو لیے ہوئے ہے کہ اگر دنیائے نعت میں اسی سے پھوٹنے والی بہاروں اور اُبھرنے والے ستاروں کو یک جا کیا جائے تو اس سے ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ شعر ہے:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تُو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

''طلوعِ اسلام'' وہ آخری طویل نظم ہے جو اقبال نے (اپریل ۱۹۲۳ء) حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اقبال نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا جو خواب ۱۹۰۷ء میں دیکھا تھا۔ وہ

اب پورا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس لیے اس نظم میں اقبال اظہارِ مسرت بھی کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے ایک روشن مستقبل کی پیش گوئی بھی کرتے ہیں۔ دنیاے اسلام اُبھر اور نکھر رہی ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی میں، رضا شاہ پہلوی ایران میں، شاہ امان اللہ افغانستان میں، سعد زاغلول مصر میں اور غازی عبدالکریم مغربِ اقصیٰ میں طلوعِ اسلام کا نشانِ امتیاز بنے ہوئے ہیں۔ اقبال ان تمام کامرانیوں کو حضور ﷺ ہی کی نگہِ کرم کا کرشمہ سمجھتے ہیں، اور اسی ذکر سے لبوں کو آراستہ اور اسی محبت سے دلوں کو پیراستہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ اس ذاتِ اطہر ﷺ کے پوشیدہ تصرفات، شاعر کی چشمِ باطن پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس نظم کے آخری بند کا یہ فارسی شعر، نعت سرائی میں تازہ گوئی کی ایک اساس ہے۔

به مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہاے پنہانش بہ چشمم آشکار آمد

اور ''بانگِ درا'' کے بعد کی شاعری، رسالت مآب ﷺ کے انھی پنہاں تصرفات کی ایک نغماتی تفصیل ہے۔

پروفیسر افضال احمد انور

اقبال کی نظم ''ذوق وشوق'' حمد ہے یا نعت؟

شاعرِ مشرق حکیم الامت حضرتِ علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا نقطۂ ارتکاز عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اُن کی فکری عظمت کی اساس بھی یہی جذبہ ہے۔ اس دل کش جذبے کا اظہار اُن کے کلام میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ ''بالِ جبریل'' میں یہ جذبہ اور بھی نمایاں ہے اور ''بالِ جبریل'' میں ہی اُن کی نظم ''ذوق وشوق'' اس والہانہ جذبے کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

اقبالؔ کے اکثر محققین، ناقدین اور شارحین کا خیال ہے کہ اس نظم ''ذوق وشوق'' میں جذبۂ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم برنگِ نعت ظاہر ہے، خصوصاً اس کے تیسرے بند:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب

میں سراسر حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف ہی بیان ہوئی ہے، لیکن بعض ناقدینِ اقبالیات کی رائے ہے کہ ''ذوق وشوق'' (خصوصاً اس کے مذکورہ بند) میں نعت کے بجائے حمدِ خداوندی بیان ہوئی ہے۔ ان کی یہ ذاتی رائے اشاعت پذیر ہوئی تو بعض ذہنوں کو جھٹکا سا لگا کہ وہ تو ان اشعار کو اب تک نعتیہ کلام ہی سمجھتے رہے۔ یہ ''جدت'' تعلیمی اداروں میں مسابقہ ہائے نعت خوانی کی محافل تک پہنچی تو بعض مواقع پر نعت خوانوں پر واضح کر دیا جاتا کہ چوں کہ یہ اشعار جدید تحقیق کی رُو سے حمدیہ ہیں، لہٰذا نعت خوانی کی مسابقت میں انھیں نہ پڑھا جائے۔ بعض مواقع پر نعت خواں کو ٹوک بھی دیا جاتا۔ لہٰذا یہ ضرورت پیش آئی کہ اس ضمن میں دونوں نقطۂ ہائے نظر کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور طے کیا جائے کہ ''ذوق وشوق'' میں کلام حمدیہ ہے یا نعتیہ؟

اس ضمن میں سب سے پہلے بعض محققین و ناقدین کی رائے پیش کی جاتی ہے کہ ''ذوق وشوق'' (خصوصاً اس کے چوتھے بند) میں نعتِ سرورِ کائنات ﷺ بیان ہوئی ہے۔

ا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نزدیک:
''عشقِ رسول ﷺ اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔''[☆۱]

ب: پروفیسر مرزا منور ''ذوق وشوق'' کو اقبال کی مشہور ''نعتیہ نظم'' کہتے ہیں۔[☆۲]

ج: نسیم امروہوی کے نزدیک: ''ذوق وشوق'' دراصل سرورِ کونین ﷺ کی نعت ہے۔[☆۳]

د: یوسف سلیم چشتی کے مطابق: ''یہ نظم دراصل نعتِ رسول ﷺ ہے اور اس کا ہر شعر عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبا ہوا ہے۔''[☆۴]

ہ: مولانا غلام رسول مہر کے نزدیک: ''یہ نظم دراصل حضرت رسولِ اکرم ﷺ کے عشق میں لکھی گئی ہے۔''[☆۵]

اب اس کے برعکس ایک دوسری رائے پیش کی جاتی ہے۔ بھارت کے مشہور ادیب اور معروف ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ اس نظم ''ذوق وشوق'' میں نعت کے بجائے حمد بیان ہوئی ہے۔ اُنھوں نے اپنا یہ نظریہ بڑے تواتر و تسلسل کے ساتھ اپنی مختلف تصانیف میں پیش کیا ہے۔

اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' (پاکستان میں ۱۹۸۲ء میں پہلی بار اشاعت) میں موصوف تحریر کرتے ہیں:

> تیسرے بند کے آخر میں خطاب براہِ راست معشوقِ ازل سے ہے اور اس کے عشق کی آگ شاعر کے دل میں فروزاں ہے۔ لہٰذا فطری طور پر چوتھا بند اس کی بارگاہ میں نذرانۂ حمد پیش کرتا ہے۔[☆۶]

دوسری کتاب ''اقبال کا نظامِ فن'' (مطبوعہ ۱۹۸۵ء) میں رقم طراز ہیں:

> (تیسرے بند میں) خطاب براہِ راست حسنِ ازل، محبوبِ حقیقی سے ہے۔[☆۷] چوتھا بند خالص حمد کا بند ہے۔[☆۸] اس نظم میں محبوبِ حقیقی کے حضور ''شکوہ'' و ''جوابِ شکوہ'' کا ملا جُلا مناجاتی انداز پایا جاتا ہے۔[☆۹]

تیسری کتاب ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا'' (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) میں مزید کھل کر بات کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ذوق وشوق'' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، شاعر کے اس تعلقِ خاطر اور جذبۂ دل کا بیان ہے جو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے اپنی روح کی گہرائیوں میں رکھتا ہے۔[۱۰]☆ تیسرا بند، پورا کا پورا حمدِ باری تعالیٰ میں ہے۔[۱۱]☆ اس تلمیح (کوہِ اضم، نواحِ کاظمہ) کے سبب بعض شارحین نے پوری نظم کو نعتِ رسول ﷺ کی شکل دے دی ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ پہلے ہی بند میں شاعر ''حسنِ ازل'' کی بات کرتا ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ یہ صریحاً نعت کے بجائے حمد کا موضوع ہے۔[۱۲]☆

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ انھوں نے اپنا نقطۂ نظر کس تواتر و تسلسل کے ساتھ دُہرایا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں آرا کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ اب یہ طے کرلیا جائے کہ کون سا نقطہ درست ہے۔ فاضل نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی کتاب ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا'' میں اپنے نظریے کی تائید وتوثیق میں جو دلائل دیے ہیں، ان پر ایک غیر جانب دارانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔

پہلی دلیل: ''ذوق وشوق'' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، شاعر کے اس تعلقِ خاطر اور جذبۂ دل کا بیان ہے، جو وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے اپنی روح کی گہرائیوں میں رکھتا ہے۔[۱۳]☆

اس سے انکار ممکن نہیں کہ علامہ اقبال اپنے دل اور روح کی گہرائیوں میں ذاتِ باری کے لیے یقیناً جذبۂ ذوق وشوق رکھتے تھے، لیکن اس جگہ محض ''عنوان'' پر ایک نظر ڈالنے سے یہ کیسے طے کرلیا گیا کہ یہاں ذوق وشوق کا مشارٌ الیہ اللہ کریم ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں عنوان ہی سے حضور ﷺ کی طرف اشارہ ملتا ہے تو دلیل کے لیے اسی نظم میں محض چند صفحات پیچھے ''مسجدِ قرطبہ'' کا یہ شعر درج کرنا مفیدِ مطلب ہوگا:

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

لہٰذا یہ کہنا محض عنوان کے الفاظ ہی سے کلام کا حمد یہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، درست نہیں۔

دوسری دلیل: (چوتھے بند کے آخر میں) خدا سے ایسا لطیف شکوہ ہے:

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر ، جلوۂ بے حجاب سے

دیدارِ الٰہی کی یہی شدید تمنا آخری بند میں عشق کا ایک ایسا منشور مرتب کرتی ہے جس کی مرضی وصال کے بجائے فراق ہے۔[۱۴]☆

اگر چہ اقبال ''بانگِ درا'' کی ایک غزل میں کہہ چکے ہیں:

کبھی اے حقیقتِ منتظر ، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

لیکن وہاں ''اے حقیقتِ منتظر'' کا واضح اشارہ موجود تھا۔ یہاں واضح اشارہ موجود نہیں۔ مجبوراً جبینِ نیاز میں شعر کے مشارٌ الیہ کی تلاش میں اس شعر سے پہلے آنے والے (یعنی بند نمبر۴ کے تمام) اشعار کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ وہی بند ہے، لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب.... سے شروع ہوتا ہے، جو نعتیہ ہے، مگر جناب مغنی صاحب اسے حمد یہ قرار دیتے ہیں۔

''بالِ جبریل'' تک پہنچتے ہوئے اقبال کا فکر وصال کے بجائے فراق پر زور دیتا ہے، کیوں کہ اس میں سوز وساز باقی رہتا ہے۔ اگر اقبال ''دیدارِ الٰہی کی یہی شدید تمنا'' رکھتے تھے (جس کی طرف مغنی صاحب اشارہ کرتے ہیں) تو پھر ''بالِ جبریل'' ہی کی اس رباعی (دو بیتی) کا کیا مطلب لیا جائے گا:

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں

حقیقت یہ ہے کہ آقاے دو جہاں ﷺ نے تیرہ و تار جہاں کو طبعِ تازہ دی تھی۔ اسی طبعِ تازہ کی اقبال دربارِ رسالت ﷺ میں پھر طلب کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی چشمِ سر سے

زیارت کا شوق ہر عاشقِ نبی ﷺ کے ایمان کا اساسی نقطہ ہے۔ اکثر شعرا نے زیارت کی خواہش پر بہترین مضمون باندھے ہیں۔ جامیؔ کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

ز مہجوری بر آمد جانِ عالم
ترحم یارسول اللہؐ ترحم

تیسری دلیل: نظم کے آغاز میں، کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ (کی) تلمیح کے سبب بعض شارحین نے پوری نظم کو نعتِ رسول ﷺ کی شکل دے دی ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ پہلے ہی بند میں شاعر ''حسنِ ازل'' کی بات کرتا ہے جو ظاہر ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔[۱۵]☆

کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ، مدینہ منورہ کی تلمیحات ہیں، خانۂ کعبہ کی نہیں، لہٰذا ان سے شارحین کا نظم کو نعت قرار دینے کا عمل مبنی بر حقیقت ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جناب مغنی صاحب کو ان تلمیحات کی اہمیت، جاذبیت اور ضرورت کی پروا نہیں۔ اسی لیے وہ رقم طراز ہیں:

> کوہِ اضم یا نواحِ کاظمہ کے متعلق کسی جغرافیائی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ شام سے حجاز تک اور فلسطین سے مکہ و مدینہ تک ایک ہی زمین و آسماں اور اس کی جغرافیائی تاریخ ہے۔[۱۶]☆

شام سے حجاز اور فلسطین سے مکہ و مدینہ تک زمین و آسماں کی جغرافیائی تاریخ ''ایک ہی'' ہے یا نہیں، یہ سوال کسی جغرافیہ داں پر چھوڑتے ہوئے اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ عرب شعرا نے کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ کی تلمیحات اپنے کلام میں استعمال کی نہیں۔ صاحبِ قصیدۂ بردہ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر مشہورِ عالم ہے:

اَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَآءِ كَاظِمَةٍ
وَ اَوْمَضَ الْبَرْقُ فِى الظَّلماءِ مِنْ اِضم

(ایسا تو نہیں کہ کاظمہ کی جانب سے ہوا کا جھونکا آیا ہو، یا یہ کہ اضم کے پہاڑ کی بجلی تاریکیوں میں چمکتی ہو۔)

اضم، مدینہ منورہ کے نواح میں ایک پہاڑی کا نام ہے جب کہ کاظمہ، مدینہ شریف کا

پرانا نام ہے۔ یہ تلمیحات کلامِ اقبال میں یوں ہی نہیں آ گئیں، بلکہ ان کا ایک پس منظر ہے جسے جاننے کے لیے ''جغرافیائی الجھن میں پڑنے کی ضرورت'' ہے۔ وہ یہ کہ اقبال شروع ہی سے روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کا شوق رکھتے تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہوکر وہ ۶/ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس (فلسطین) پہنچے جہاں مؤتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت مقصود تھی۔ اقبال کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر بھی تھے۔ اقبال نے مؤتمر اسلامی کے اجلاسوں میں شرکت کے علاوہ مسجدِ اقصیٰ، جبلِ زیتون، بستانِ جسمانیہ اور مختلف مزارات کی زیارت کی اور فلسطین میں ۱۵/ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح تک قیام پذیر رہے۔[۱۷☆] ہندوستان کی نسبت مسجدِ اقصیٰ سے مدینہ منورہ کی مکانی نزدیکی نے اس سچے عاشقِ رسول ﷺ پر درِ اقدس کی حاضری کے لیے کیا کیا بے تابیاں نہ پیدا کی ہوں گی۔ سیّد نذیر نیازی لکھتے ہیں:

> اُن (اقبال) کی ایک دیرینہ آرزو تھی، حرمِ پاک نبوی ﷺ کی زیارت۔ ۱۹۳۳ء میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے جب وہ مؤتمرِ اسلامیہ کی شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو اس وقت سفرِ حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا، لیکن پھر جیسا کہ انھوں نے خود مجھ سے فرمایا، ''اس بات سے شرم آتی تھی کہ گویا میں ضمناً دربارِ رسول ﷺ میں حاضر ہوں۔'' خیر، اس وقت تک یہ ارادہ پورا ہونے سے رہ گیا، مگر اُن کے تأثرات دب نہ سکے اور ان کا اظہار اس نظم میں ہوا جو ''ذوق وشوق'' کے عنوان سے ''بالِ جبریل'' میں موجود ہے۔[۱۸☆]

اب، اقبال کی صحبت کے فیض یافتہ، فکرِ اقبال کے مترجم کی زبانی اقبال کی اس وضاحت وشہادت کے بعد محترم نقاد اس سب کچھ کو کس طرح ''غلط'' قرار دے سکتے ہیں۔ ''علامہ کو اپنی کوتاہی کا احساس ہے اور افسوس بھی کہ مدینہ منورہ کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ روضۂ مطہرہ کی زیارت سے شرف یاب نہ ہو سکے، ارمان اور حرمان کے یہاں تأثرات نظم میں منعکس ہوئے ہیں۔[۱۹☆] پروفیسر منور مرزا نے اقبال کی کیفیت کا نقشہ اپنے انداز میں یوں کھینچا ہے، ''اقبال نے ''ذوق وشوق'' کے بیش تر اشعار فلسطین میں کہے تھے، مگر وہ عالمِ خیال

میں نواحِ مدینہ منورہ کی سیر و زیارت کر رہے تھے۔ دردِ ہجراں مضطرب کر رہا تھا، دل میں دیارِ حبیب کے دیدار کا ذوق، شوق انگیز تھا، ارمان مچل رہے تھے، روحانی کرب اور جسمانی بُعد۔ عجیب بے سکون لذت اور بڑی لذیذ بے سکونی کا عالم تھا۔''[۲۰]☆ سیّد نذیر نیازی کے ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سفرِ انگلستان و فلسطین کے پروگرام میں حرمِ پاک اور روضۂ رسول ﷺ کی حاضری شامل تھی۔ یہ آرزو پوری نہ ہوسکی تو اس کا اظہار ''ذوق وشوق'' ایسی نظم میں ہوا۔[۲۱]☆ اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ''ذوق وشوق'' کو نعت قرار دینا ''بعض شارحین'' کا کام نہیں، دراصل یہ نظم اقبال نے لکھی ہی نعت کے طور پر ہے۔ باقی عبدالمغنی صاحب کا یہ کہنا کہ چوں کہ پہلے بند میں ''حسنِ ازل'' کی بات ہے، لہٰذا حسنِ ازل سے صرف خدا ہی کی ذات مراد ہے، اس لیے درست نہیں کہ مصرعے میں ''حسنِ ازل'' کی نہیں ''حسنِ ازل کی نمود'' کی بات ہورہی ہے اور حسنِ ازل کی نمود اگر نواحِ مدینہ میں ہے تو اس پر حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا فاضل نقاد بھول جاتے ہیں کہ اقبال نے ''بانگِ درا'' کے پہلے حصے کی نظم ''جگنو'' میں کہا تھا:

حسنِ ازل کی پیدا ، ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے ، غنچے میں وہ چٹک ہے

مظاہر و مناظرِ فطرت میں حسنِ ازل کی نمود دیکھنا عام شاعرانہ مضمون و اسلوب ہے اور اقبال نے اپنے کلام میں متعدد جگہ اس نمود کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن یہی نمود جب کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ میں ہوتی ہے تو معنوی تخصیص کا کون سا جواز نکلتا ہے؟

چوتھی دلیل: اقبال نے کہا ہے: عشق تمام مصطفیٰ ﷺ، عقل تمام بولہب۔
اگر نظم کا موضوع عشقِ رسول ﷺ فرض کرلیا جائے تو سوال ہوگا کہ خود مصطفیٰ ﷺ کو کس سے عشق تھا؟[۲۲]☆

یہ وہ سوال ہے جس کی کوئی منطقی توجیہ نہیں بنتی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر اقبال کا مصرع درج کیا ہے، اسے پڑھ کر کسی سے پوچھا جائے کہ خود مصطفیٰ ﷺ کو کس سے عشق تھا اور خود ابولہب کے پاس کس کی عقل تھی؟ تو بات نہیں بنے گی۔ اقبال حضور ﷺ ہی کو ''عشق'' قرار دے رہے ہیں اور ''عشق'' سے کیا مراد ہے، یہ عبدالمغنی صاحب اچھی طرح

جانتے ہیں۔عشق صرف جسمانی محبت ہی کو نہیں کہتے۔عشق کی فلسفیانہ توضیح وتشریح کا یہ مقام نہیں، بہرحال اتنا اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ ''عشق ہی کا دوسرا نام اسلام ہے۔''[۲۳☆] اور ''اقبال کے نزدیک عشق کی بہترین مثال رسولِ کریم ﷺ کی زندگی ہے۔''[۲۴☆] اقبال نے عشقِ تمام مصطفیٰ ﷺ ہیں نہیں کہا اور بھی بہت کچھ کہا ہے، مثلاً:

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
(مسجدِ قرطبہ)

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
(غزل، ''بانگِ درا''، حصہ سوم)

کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علی خیبر شکن عشق
(رباعی، ''بالِ جبریل'')

پانچویں دلیل: سنجر وسلیم اور جنید و بایزید رحمتہ اللہ علیہم کی سیرتوں میں سوا خدا کے کسی اور کے جلال و جمال کی نمود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۲۵☆]

خدا کا جلال و جمال کس نے دیکھا ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ فلاں کی سیرت میں صرف خدا ہی کا جلال و جمال نمود پذیر ہے۔حق یہ ہے کہ مشہور حدیث ''من رانی فقد رای الحق'' کے مصداق خدا کے جلال و جمال کا اظہار صرف حضور نبیِ کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں ہوا ہے۔آگے جسے بھی جلال و جمال سے کچھ حصہ ملا ہے وہ حضور ﷺ ہی کے جلال و جمال کے طفیل ملا ہے۔اقبال اس حقیقت کو کئی بار بیان کر چکے ہیں۔محض ایک مثال کافی ہے:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

چھٹی دلیل: آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب وجودِ باری کے سوا کوئی اور نہیں۔[۲۶☆]

آیت سے مراد قرآنِ مجید کا ایک فقرہ بھی ہے اور نشانی بھی۔ ''معنی'' کا معنی ''حقیقت'' اور مفہوم ہے۔ آیۂ کائنات یعنی آیت جیسی کائنات۔ معنیِ دیریاب یعنی ''وہ مفہوم جو دیر میں سمجھ آئے۔ اس ٹکڑے کا مطلب ہے کہ تو کائنات کی آیت (یا نشانی) کا وہ معنی ہے جو بہت دیر بعد سمجھ آئے۔[۲۸]☆ اب اگر اس سے مراد خدا کی ذات لی جائے تو لامحالہ یہ مطلب نکلے گا کہ خدا کی حقیقت سمجھ تو آجاتی ہے، لیکن بہت دیر بعد۔ سوال یہ ہے کہ وہ خدا جو ابتدا میں انسانی سمجھ میں نہیں سماتا وہ بعد میں سمجھ آسکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس سے مراد وہی ہے جو شمس الرحمٰن نے بیان کیا ہے:

> آیۂ کائنات کا دیریاب معنی (یعنی رسولِ مقبول ﷺ) اس معنی میں دیریاب ہے کہ بزمِ کائنات تو کہنہ تھی، لیکن آپ کا ورودِ مسعود نسبتاً حال میں ہوا۔[۲۹]☆

ڈاکٹر صدیق جاوید، رفیع الدین ہاشمی، یوسف سلیم چشتی، پروفیسر محمد فرمان اور ڈاکٹر محمد ریاض کے نزدیک بھی یہ نعت ہے۔[۳۰]☆

عبدالمغنی صاحب ''آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو'' کا ترجمہ کیا کرتے ہیں؟ قابلِ ملاحظہ ہے، ''خطاب براہِ راست حسنِ ازل، محبوبِ حقیقی سے ہے جو کائنات میں وجودِ باری تعالیٰ کی چاروں طرف پھیلی ہوئی آیات کا معنی و مطلب ہے، مگر بہ آسانی سمجھ میں نہیں آتا۔ مظاہر کی دل فریبی پردہ بنی ہوئی ہے۔''[۳۱]☆

یہاں فاضل نقاد ''مظاہر کی دل فریبی'' کا سہارا لینے کے باوجود جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اُسے علامہ نے بدرجہا بہتر انداز میں پہلے ہی سے کہہ رکھا ہے، لیکن ہے وہ بھی نعت ہی:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ ست

(جاویدنامہ)

آخری دلیل: سب سے بڑھ کر حسبِ ذیل شعر کا مرجع اگر خدا کے سوا کوئی بھی ہو

تو صریح شرک لازم آئے گا:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب[۳۲]☆

یہاں جوشِ استدلالیت میں عبدالمغنی صاحب مفتی صاحب بھی بن گئے ہیں، حالاں کہ اس شعر میں محض یہ کہا گیا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی محبت اور شوقِ اتباع، عبادت کا اصلی محرک نہ ہو تو وہ عبادت محض حجاب ہے اور مقبولِ بارگاہِ خداوندی نہیں ہوسکتی۔ اس مفہوم میں شرک کہاں سے لازم آتا ہے؟ جناب عبدالمغنی صاحب تو حضور ﷺ کے شوق (عشق ومحبت) کو نماز کا امام تسلیم کرتے ہوئے تکفیر پر اُتر آتے ہیں، لیکن علامہ اقبال نے تو اس سے بھی بڑی بات ارشاد فرمارکھی ہے:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وا، رہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں
(''پس چہ باید کرد'')

اس میں تو حضور ﷺ کے شوق کو نماز کا امام نہیں، بلکہ خود حضور ﷺ کو اذان وصلوٰۃ کہا گیا ہے، اگر اس شعر کے حوالے سے اقبال کے نزدیک حضور ﷺ ہی ''عین صلوٰۃ'' ہیں تو عین صلوٰۃ کا شوق، امام نماز ہو کر کیسے کفر بن سکتا ہے؟ اس شعر کے اگر ظاہری معانی بھی مراد لیے جائیں تو حضور ﷺ کا شوق یہاں امامِ صلوٰۃ ہے نہ کہ مسجودِ مصلیٰ، پس تکفیر کیسے ثابت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کے ارشاد فرمائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز پڑھتے ہیں تو گویا اُن کی اتباع، امام بن کر ہماری نماز کا حصہ بنتی ہے، بلکہ اصلِ نماز ٹھہرتی ہے۔ ہر عبادت کی اصل بنیاد حبِ رسول ﷺ ہے:

مغزِ قرآں، روحِ ایماں، جانِ دیں
ہست حبِ رحمۃ للعالمین ﷺ

مندرجہ بالا تنقیحات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا عینِ حقیقت ہے کہ نظم ''ذوق وشوق'' اقبال کا ترانۂ حمد نہیں، بلکہ عشقِ رسول ﷺ کا نغمۂ سرمدی ہے۔ راقم الحروف عبدالمغنی صاحب سے اس استفسار کا حق رکھتا ہے کہ اگر اُن کی تعبیر صحیح ہے تو، ''لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب...'' میں ''تیرا وجود الکتاب'' نعت کے بجائے حمد کا بیان کیسے ٹھہرے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس بند کی فکری وفنی خوبیوں کے ایک ایک جزو کو بیان کرتے ہوئے (''اقبال کا نظامِ فن''، ص۳۵۶ تا ۳۵۸) نقاد موصوف اس مصرعے ہی کو گول کر گئے ہیں اور اس بارے میں ایک اشارہ تک نہیں دیا۔ چوں کہ اس سے محض نعتِ محبوبِ کبریا ﷺ ہی ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس سے صرفِ نظر کرنا اور ''ذوق وشوق'' کی نعتیہ حقیقت کو تسلیم نہ کرنا ادبی وتحقیقی دیانت کے موافق نہیں۔ حضور ﷺ کے لیے ''لوح بھی تو قلم بھی تو'' کے الفاظ فقط اقبال ہی نے استعمال نہیں کیے، اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ علامہ یوسف نبہانی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

اِنَّ جَسَدَہُ الشَّرِیْفَ لَا یَخْلُوَ مِنْہَ زَمَانَ وَلَا مَکَانِ وَ لَا مَحَلُ وَ لَا اِمْکَانُ وَ لَا عَرْشُ وَ لَا کُرْسِیٌّ وَ لَا قَلَمُ وَ لَا برٌ بحُرُ وَلَا سَھْلُ وَ لَا وَعرُ وَ لَا برْزَخ وَ لَا قَبر۔[۳۳]☆

(بے شک حضور نبیِ اکرم ﷺ کے جسمِ مبارک سے نہ کوئی زمانہ خالی ہے نہ کوئی جگہ، نہ کوئی محل اور نہ کوئی امکان اور نہ عرش، نہ کوئی قلم اور نہ کوئی بحر و بر اور نہ کوئی نرم زمین، نہ سخت زمین اور نہ برزخ اور نہ قبر۔)

ڈاکٹر عبدالمغنی کی کتاب ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا'' دہلی سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تو پاکستان کے معروف ماہرِ اقبالیات جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب پر تبصرہ لکھا جو ''سیارہ'' لاہور کے خاص نمبر۳۱ (سال نامہ) جلد ۶۱، شمارہ نمبر۴، بابت دسمبر ۱۹۹۱ء کے صفحہ نمبر۴۸۸ اور ۴۸۹ پر شائع ہوا۔ اس تبصرے میں ہاشمی صاحب نے ''ذوق وشوق'' کی بابت جناب عبدالمغنی صاحب کی رائے کی ایک لحاظ سے تائید کی ہے۔

> ''ذوق وشوق'' کے دوسرے اور تیسرے بند (''آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو'' اور ''لوح بھی تو قلم بھی تو'') کو اقبال کے شارحین کے برعکس

عبدالمغنی صاحب حمد یہ قرار دیتے ہیں (نہ کہ نعتیہ) ہمارے خیال میں
یہ تعبیر وتشریح زیادہ بہتر اور قابلِ قبول ہے۔[۳۴]

ڈاکٹر ہاشمی صاحب کی میدانِ اقبالیات میں بہترین خدمات، واضح اندازِ تحقیق اور حق گوئی میں شہرت کے باعث ان کی ہر رائے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور راقم الحروف کو اس کا بہت پاس بھی ہے، لیکن عبدالمغنی صاحب کی اس رائے کی تائید وتوثیق میں وہ کئی امور مدِ نظر نہیں رکھ سکے۔

(الف) خود ڈاکٹر ہاشمی صاحب اپنی کتاب ''اقبال کی طویل نظمیں'' میں ''ذوق وشوق'' کو نعتیہ قرار دے چکے ہیں اور اب ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کی رائے کو نسبتاً زیادہ قابلِ قبول اور بہتر قرار دے کر گویا وہ اپنے پہلے قول سے رجوع کر رہے ہیں، حالاں کہ اُن کا پہلا قول ہی درست تھا۔

(ب) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اپنی پی ایچ ڈی کی تحقیق کے دوران میں ''بالِ جبریل'' کا متروک کلام تلاش کر کے شائع کرایا تھا۔ اُنھوں نے لکھا تھا، ''(بالِ جبریل کے متروک اشعار) باقیات کے کسی مجموعے میں نہیں ملتے۔ یہ نوادر بجائے خود اہم ہیں۔ راقم نے انھیں براہِ راست اقبال کی قلمی بیاضوں اور مسودوں سے اخذ کیا ہے۔ خالص تحقیقی اعتبار سے، بلکہ فنی اور شعری محاسن کے نقطۂ نظر سے بھی ان اشعار کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔''[۳۵]☆

راقم الحروف ڈاکٹر صاحب موصوف کے اسی مضمون سے اُن کی اپنی تحقیق سے دریافت شدہ اسی نظم ''ذوق وشوق'' کے چند متروک اشعار درج کر رہا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کے یہ اشعار ''ذوق وشوق'' کی صحیح تعبیر میں بہتر طور پر معاون ہوں گے:

منزلِ یار سامنے اور یہ کیفیت مری
خونِ دل وجگر میں ہے ڈوبی ہوئی مری فغاں

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ فلسطین میں مدینہ شریف سے مکانی قربت کا ذکر ہو رہا ہے۔

وارثِ علمِ انبیا لیتے ہیں دہریوں سے درس
اب ہے خدا کے ہاتھ میں اہلِ حرم کی آبرو

اُس کا گناہ گار ہوں، تجھ سے بھی شرم سار ہوں
صاحبِ اختیار ہے میرے معاملے میں تُو

یہاں اُس اور تجھ سے کون مراد لیا جائے گا؟ صاف ظاہر ہے کہ اُس سے مراد ''خدا'' ہے جس کا ذکر پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ہوا (اب ہے خدا کے ہاتھ میں) اور تجھ سے مرادِ تخاطب حضور ﷺ ہیں۔ اگر یہاں بھی حمد یہ مناجات ہے تو خدا سے یہ کہنا کہ اب ہے خدا کے ہاتھ میں— کیا معنی رکھتا ہے؟ اس سے آگے شعر ہے:

تو ہے تجلّیِ وجود ، تو ہے تجلّیِ شہود
راز و نیازِ مارَمیت ، سوز و گدازِ عبدہٗ

کیا مَا رَمیت... آیۂ شریفہ صرف حضور نبیِ کریم ﷺ کی شان ہی میں نہیں نازل ہوئی؟ کیا اس کے مشارٌ الیہ یعنی حضور نبیِ کریم ﷺ کے مشارٌ الیہ نہ ہونے کا انکار قرآنی تعلیم کے خلاف نہیں۔ کیا یہ آیت بھی ہمارے ذہن کو حمد کی طرف لے جاتی ہے اور عبدہٗ سے مراد کون ہے؟ کیا (نعوذ باللہ) خدا کو عبدہٗ کہا جا سکتا ہے۔ اگر ''عبدہٗ'' صرف حضور نبیِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکت ہے تو پھر اس نعتیہ قصیدے سے حمد کیسے مراد لی جا سکتی ہے۔ اسی نظم کا ایک اور متروک شعر ہے:

ارض و سما کی طاقتیں ، تیرے جنود ہیں تمام
میرِ عساکرِ اُمم ، اپنی سپاہ ساز کر

(کیا میرِ عساکرِ اُمم کا اشارہ بھی حضور ﷺ ہی کی طرف نہیں جاتا؟ اور علامہ اقبال نے اپنے کلام میں حضور ﷺ کو میرِ اُمم نہیں کہا؟ راقم الحروف کے خیال میں اگر ڈاکٹر رفیع خود اپنی کاوش سے تلاش کیے ہوئے مندرجہ بالا متروک اشعار پر ازسرِنو غور کر لیں تو یقیناً عبدالمغنی صاحب کی رائے کی تائید سے ہاتھ کھینچ لیں۔

جہاں تک اس نظم کے فکری جائزے کا تعلق ہے۔ یہ نظم ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ کے جذباتِ فراق کی آئینہ دار ہے۔ سرزمینِ فلسطین سے قربِ مکانی کے باوصف گنبدِ خضرا کی زیارت سے محرومی ''ذوق وشوق'' کی شعری تخلیق کا باعث ہوئی ہے۔

شاعر تصوراتی طور پر روضۂ رسول ﷺ کی طرف گامزن ہے۔ دشتِ عرب میں جب وہ مدینہ منورہ کے نزدیک کوہِ اضم کے مقام پر پہنچتا ہے تو گزرگاہِ محبوب ﷺ کے فطرتی

حسن سے بے پناہ متاثر ہوتا ہے۔ صبح کا سماں، چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں دواں ہیں۔ رات کا بادل نیلے اور سرخ بادل چھوڑ گیا ہے۔ رات کی بارش سے ہوا گرد و غبار سے صاف ہوگئی ہے۔ درختوں کے پتے بھی ڈھل کر نکھر گئے ہیں۔ ان مناظر میں وہی حسن جلوہ نما ہے جو تخلیقِ کائنات کے وقت ظاہر ہوا تھا، جس سے پردۂ وجود چاک ہو جاتا ہے، لیکن اس حسنِ ازل کو دیکھنے کے لیے ظاہری آنکھ بند کرنی پڑتی ہے۔ ایسے میں شاعر کو ایک مقام نظر آتا ہے جہاں بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب اس بات کی غماز ہے کہ اور قافلے بھی اسی راستے سے مدینہ منورہ کی طرف گئے ہیں۔ اتنے میں شاعر کو صدائے جبرئیل سنائی دیتی ہے:

اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

شاعر جس نے دربارِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوکر اپنا دردِ دل بیان کرنا تھا، صدائے جبرئیل سن کر وہیں رُک جاتا ہے، لیکن اُس کی دلی کیفیات زبانِ حال سے ظاہر ہوتی ہے:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات ، تازہ ہیں میرے واردات

شاعر ملتِ اسلامیہ کے انحطاط، بے عملی، بے علمی اور جذبۂ جہاد سے محرومی کا گلہ کرتا ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی ، گیسوے دجلہ و فرات

یہاں شاعر، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو انقلاب و جہاد کا استعارہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ملت کے مندرجہ بالا اجتماعی امراض کا سبب ''عشق سے محرومی'' ہے:

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

یہ معشوق مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ چناں چہ معرکۂ روح و بدن میں صدقِ خلیل علیہ السلام بھی عشق ہے، صبرِ حسین رضی اللہ عنہ بھی اور جہادِ بدر و حنین بھی عشق ہی کی جلوہ گری ہے۔

بدر و حنین سے وہ خواجۂ بدر و حنین ﷺ کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور ﷺ آپ بعثت میں تمام انبیا کے بعد تشریف لائے ہیں، حالاں کہ آپ ﷺ کو سب سے پہلے خلق کیا گیا تھا۔ گویا آپ آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب ہیں۔ چوں کہ یہ کائنات آپ ﷺ ہی کے لیے خلق کی گئی ہے، لہٰذا ازل سے ابد تک، رنگ و بو کا ہر قافلہ آپ ﷺ ہی کا متلاشی

ہے۔ پھر شاعر علما وصوفیا کی کور نظری، مردہ ذوقی اور روحانی فقدان کی شکایت کرتا ہے۔ وہ ان خامیوں کے علاج کے لیے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور ’’کھوئے ہوؤں کی جستجو‘‘ کو اپنی شاعری کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس بند کی ٹیپ کا شعر ہے:

فرصتِ کش مکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوے تاب دار را

یہ ’’زبورِ عجم‘‘ کی ایک غزل کا مطلع ہے، جس کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقم طراز ہیں: ’’یہ مطلع ہے اُس غزل کا جو اُنھوں نے نعت میں لکھی ہے۔‘‘[۳۶☆]

اس نظم کے لیے ’’زبورِ عجم‘‘ کی نعتیہ غزل کے مطلع کا انتخاب، اس نظم کے نعتیہ ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ چوتھا بند، نعتیہ عقیدت کا شہ کار ہے۔ اس میں براہِ راست حضور نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے۔

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب

’’تیرا وجود الکتاب‘‘ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اُس بیان کی تلمیح ہے جس میں اُنھوں نے حضور ﷺ کے خُلق کو قرآن قرار دیا تھا اور حق یہ ہے کہ سیرتِ محمد ﷺ پر اس سے بہتر اور جامع تبصرہ ممکن نہیں۔ اس بند میں حضور ﷺ کے احسانات کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں (عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ) آپ نے بے مایہ قوم (عربوں) کو آدابِ خداوندی سکھائے۔ (ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب)۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید ، تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو ، میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

اسلامی سلاطین کی شوکت اور اولیاے کرام کا فقر، سب حضور ﷺ ہی کی دین ہے۔ آپ ﷺ کی محبت ہی عبادت کا اصل محرک ہے۔ یہاں اقبال نے حضور ﷺ کی

محبت سے خالی نماز کو محض حجاب قرار دیا ہے، لیکن ''بالِ جبریل'' ہی کی ایک غزل میں اقبال نے اس سے بڑھ کر بات کی تھی:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اس بند کے آخر میں حضور ﷺ سے استمداد کی گئی ہے:

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

اس نظم میں اقبال نے حضور ﷺ سے طبعِ زمانہ تازہ کرنے کی التماس کر کے ایک شعری پیرایہ ہی نہیں اپنایا، اپنے عقیدے کا بھی اظہار کر دیا ہے جیسا کہ وہ ۱۴؍جنوری ۱۹۲۲ء کے خط میں نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:

> میرا عقیدہ ہے کہ نبیِ کریم ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اُن کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے، لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔[☆۳۷]

آخری بند میں علم یعنی عقل کی نارسائی اور عشق کے فیوض کا ذکر ہے۔ فلسفۂ وصال وفراق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک شعر میں اپنی اُس کیفیت کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا ہے جس میں وہ، سرزمینِ فلسطین سے مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے، لیکن جا نہ سکے۔

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی ، میری نگاہِ بے ادب

یوسف سلیم چشتی کا اس کی شرح میں یہ لکھنا محلِ نظر ہی نہیں، خلافِ ادب بھی ہے۔

> اگرچہ میری نگاہ، دیدار کی مشتاق تھی، لیکن میں نے وصل کی حالت میں بھی محبوب کی طرف نہیں دیکھا تا کہ ''لذتِ طلب'' برقرار رہے۔[☆۳۸]

اصل یوں ہے کہ اگرچہ اقبال مدینہ شریف جانا چاہتے تھے، پروگرام بھی طے ہو گیا

تھا، لیکن پھر جا نہ سکے۔ کیوں؟ اس کا جواب فقیر سیّد وحید الدین اقبال کی زبانی یوں دیتے ہیں، ''والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا، اقبال! تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی بھی سیر کی، کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ یعنی چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے، فقیر! میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔[۳۹]☆

راقم الحروف کے خیال میں یہی توجیہہ درست ہے اور اقبال کا مدعا (مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا) بھی یہی ہے۔

مندرجہ بالا شواہد سے یہ بات اظہر من الشّمس ہو جاتی ہے کہ اقبال کی نظم ''ذوق وشوق'' دراصل بنیادی طور پر نعت شریف ہے اور اس کے تیسرے بند میں خصوصیت کے ساتھ نعتِ رسولِ کریم ﷺ بیان ہوئی ہے نہ کہ حمدِ خدا۔ یہ نعت دیگر نعتوں سے منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔

ڈاکٹر صدیق جاوید کے بہ قول، ''فلسفۂ اقبال کے بعض پہلوؤں کی ترجمانی کے علاوہ جو بات اس نظم کو سب سے زیادہ اہم بناتی ہے، وہ رسولِ اکرم ﷺ سے عقیدت اور عشق کا والہانہ جذبہ ہے۔ شاید اردو اور فارسی میں اس پائے کی کوئی دوسری نعت موجود نہیں جس میں موضوع اور فن اس طرح ہم آہنگ ہوئے ہوں۔''[۴۰]☆

حواشی

۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''اقبال احوال و افکار''، ص۶۷، مکتبۂ عالیہ، لاہور ۱۹۷۷ء۔
۲۔ محمد منور مرزا، ''میزانِ اقبال''، ص۲۵، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۳۔ نسیم امروہوی، ''فرہنگِ اقبال''، ص۳۸۵ (حصہ اردو، عمودا)، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء۔
۴۔ یوسف سلیم چشتی، ''شرح بالِ جبریل''، ص۵۴۳، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن۔
۵۔ غلام رسول مہر، مولانا، ''مطالبِ بالِ جبریل''، ص۱۵۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۷ء۔
۶۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال اور عالمی ادب''، ص۲۸۵، اقبال اکادمی لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۰ء۔
۷ تا ۹۔ ایضاً، ''اقبال کا فن''، صفحات (بالترتیب) ۳۵۲، ۳۵۶، ۳۶۴، اقبال اکادمی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۰ء۔
۱۰۔۱۲۔ ایضاً، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، صفحات (بالترتیب)، ۶۳، ۶۵، ۶۶، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۱ء۔
۱۳۔ ایضاً، ص۶۳۔
۱۴۔ ایضاً، ص۶۵۔

۱۵۔ ایضاً،ص۶۶۔
۱۶۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال کا نظامِ فن''، ص ۳۴۸، اقبال اکادمی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۰ء۔
۱۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، ''زندہ رود''، جلد نمبر۳، ص ۴۶۶ تا ۴۷۰، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء۔
۱۸۔ نذیر نیازی، سیّد، مضمون ''علامہ اقبال کی آخری علالت''، ص ۳۲۰، مشمولہ رسالہ ''اردو'' اقبال نمبر، منقولہ صدیق جاوید، ''بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ''، ص ۱۸۵۔
۱۹۔ صدیق جاوید، ''بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ''، ص ۱۸۵، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء۔
۲۰۔ محمد منور مرزا، ''میزانِ اقبال''، ص ۲۷، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۲۱۔ نذیر نیازی، سیّد، ''مکتوباتِ اقبال''، ص ۷۷، اقبال اکادمی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۷۷ء۔
۲۲۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، ص ۶۶، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۱ء۔
۲۳۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ''فکرِ اقبال''، ص ۳۱۳، بزمِ اقبال، لاہور، طبع دوم، ۱۹۶۱ء۔
۲۴۔ ایضاً، ص ۳۲۷۔
۲۵۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، ص ۶۶، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۱ء۔
۲۶۔ ولی الدین محمد (مرتب)، ''مشکوٰۃ شریف''، جلد دوم، ص ۳۷۶، مکتبۂ رحمانیہ، لاہور، س ن۔
۲۷۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، ص ۶۶۔
۲۸۔ نسیم امروہوی، ''فرہنگِ اقبال''، ص ۴۹۷ (حصہ اردو، عمودا)، اظہار سنز، لہور، ۱۹۸۴ء۔
۲۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مضمون ''اقبال کا لفظیاتی نظام''، مشمولہ ''اقبال کا فن'' (مرتبہ گوپی چند نارنگ)، ص۔
۳۰۔ (بالترتیب) ''بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ''، ص ۸۸، اقبال کی طویل نظمیں، ص ۱۳۸، ''شرحِ بالِ جبریل''، ص ۵۵۰، ''اقبال اور تصوف''، ص ۱۵۱، ''تقدیرِ اُمم اور اقبال''، ص ۲۰۴۔
۳۱۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، ''اقبال کا نظامِ فن''، ص ۳۵۲، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۵ء۔
۳۲۔ ایضاً، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، ص ۶۶۔
۳۳۔ یوسف النبہانی، علامہ، ''جواہر البحار''، ص ۴۸۲، مطبوعہ مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۷۹ھ۔
۳۴۔ رفیع الدین ہاشمی، مضمون، ''تبصرہ بر کتاب''، ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقا''، از عبدالمغنی، مشمولہ رسالہ ''سیارہ'' نمبر ۳۱، ص نمبر ۴۸۹، لاہور۔
۳۵۔ رفیع الدین ہاشمی، مضمون ''بالِ جبریل کا متروک کلام''، مشمولہ ''اقبال'' شمارہ ۸۴، (مرتب وحید عشرت)، ص ۲۵۶، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۳۶۔ یوسف سلیم چشتی، ''شرح بالِ جبریل''، ص ۵۵۳، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن۔
۳۷۔ اقبال اکادمی (مرتب) مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خاں، خط نمبر ۵۴، ص ۶۰، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۶ء۔
۳۸۔ یوسف سلیم چشتی، ''شرح بالِ جبریل''، ص ۵۵۳، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن۔
۳۹۔ وحید الدین سیّد فقیر، ''روزگارِ فقیر''، جلد اوّل، ص ۳۷۔
۴۰۔ صدیق جاوید، ڈاکٹر، ''بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ''، ص ۱۹۱، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

ڈاکٹر نوید احمد گِل

نعت سرائی — اقبال کی دو بیتی کا اعزاز

انفعالی جذبات کے مترنم ابلاغ کو شاعری کہتے ہیں۔ تفہیم میں آسانی کے لیے تقسیم کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ شاعری کو تین لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا معنوی لحاظ سے، دوسرا تعدادِ مصرع کے اعتبار سے اور تیسرا ہیئت کی بنا پر۔ معنوی تقسیم کے لحاظ سے حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، ہزل، واسوخت، شہر آشوب۔ تعداد مصرعے کے اعتبار سے بیت، مثلث، دو بیتی (= رباعی) مخمس، مسدس، مثمن اور ہیئت کی بنا پر مثنوی، قصیدہ، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان سب کو اصنافِ سخن کہتے ہیں۔ ہر معنوی صنفِ سخن کو ہیئت یا تعدادِ مصرع کی بنا پر تقسیم شدہ صنفِ سخن میں ڈھل کر جلوہ گر ہونا پڑتا ہے۔ فارسی شاعری میں حمد، نعت اور منقبت نگاری کی بڑی مضبوط اور زریں روایت موجود ہے جو ہمیں بالترتیب مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، ترجیع بند، اور غزل کی شکل میں نظر آتی ہے، مگر دو بیتی کی ہیئت میں نعتیہ مضامین اور عرضِ حالِ قوم کی مثال اقبال سے پہلے شواذ میں سے ہے۔

دو بیتی فارسی کی ایک قدیم مگر مطبوع، مشکل مگر مقبول، مختصر مگر جامع اور خواص میں عام صنفِ سخن رہی ہے اور اس کے موجد خود فارسی والے ہیں۔ ہر رباعی دو بیتی ہوتی ہے، مگر ہر دو بیتی رباعی نہیں ہوتی (عارف، ۱۹۷۵ء،ص۱۲۰)۔ دو بیتی چار مصرعوں کی معنوی طور پر ایک مکمل نظم ہوتی ہے گویا دو بیتی چمن کو غنچہ میں نہیں، بلکہ بیج میں، خرمن کو خوشہ میں

نہیں، بلکہ دانے میں، دریا کو کوزے میں نہیں، بلکہ قطرے میں، تلواروں کی تاب داری کو نشتر میں نہیں، بلکہ نوکِ نشتر میں، اور صحرا کو ذرّے میں پرو دینے اور سمو دینے کا فن ہے۔ اقبال سے پہلے خواجہ ابو سعید ابوالخیر، (ابوسعید ۱۳۳۴ھ ص کامل) عمر خیام نیشاپوری (خیام ۱۳۱۶ھ کامل) بابا طاہر عریاں (۱۹۰۱ء، ص کامل)— دو بیتی میں اقبال بابا طاہر عریاں کے پیرو ہیں (اکرام ۱۹۸۲ء، ص ۲۳۱) حکیم سنائی غزنوی، خواجہ فریدالدین عطار نیشا پوری، مولانا روم (رومی ۱۳۹۶ھ، ص ۱۳۲۳۔۱۴۰۰) جیسے شعراے کرام نے فارسی دو بیتی کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ علما رباعی اور دو بیتی میں فرق کرتے ہیں اور ''ارمغانِ حجاز'' میں اقبال کی دو بیتی ہے، رباعی نہیں (عارف، ۱۹۸۵ء ص ۱۸۵۔۱۲۶) / (اکرام، ۱۹۸۲ء ص ۱۲۳)۔

فارسی دو بیتی اپنے آغاز سے اقبال سے پہلے تک عبرت زا، حیرت افزا، فنا و بقا، الٰہیات، اخلاقیات، خمریات، فلسفہ، علم الکلام کے مضامین کے ابلاغ کے لیے مختص رہی اور اپنے اسلوب کے لحاظ سے ایک معزز، متین، معقول، معتبر، بے نمک اور بے خند و قند صنفِ سخن کے طور پر بڑی الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فارسی دو بیتی کو اقبال نے فکر و فن کے حوالے سے کیا دیا۔ اقبال نے صدیوں سے فنا اور بقا کی پُرخوف وادیوں میں حیران اور خمریات کی بے توقیر راہوں میں پڑی فارسی دو بیتی کے کان میں ایک بات کہی، دو بیتی نے وہ اسٹیج پر آ کر کہہ دی:

نہ از ساقی نہ از مے خانہ گفتم
حدیثِ عشق بی باکانہ گفتم
شنیدم ہرچہ از پا کان امت
ترا بہ شوخیِ رندانہ گفتم

(اقبال، ۱۹۹۰ء، ص ۹۸۶)

(میں نے ساقی اور مے خانہ کی بات نہیں کی، بلکہ میں نے عشق کی بات برملا کی ہے اور یہ میری ذاتی باتیں نہیں، بلکہ میں نے اپنے پاک بزرگوں سے جو کچھ سن رکھا تھا اسی کو ذرا شوخ رنگ میں کہہ دیا ہے۔) یعنی:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
(اقبال، ۲۰۰۷ء، ص۴۴۵)

عشق چالاکیاں ختم کر کے بے باکیاں عطا کرتا ہے۔ فارسی دوبیتی طالبِ عشق ہوتی ہے اور اسے عشق کی دولت ارزانی کی جاتی ہے:

بیا ای عشق ، اے رمزِ دلِ ما
بیا ای کشتِ ما ، اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہادان
دگر آدم بنا کن از گلِ ما
(ایضاً، ص۹۵)

(اے عشق آ جا! اے ہمارے دل کے راز آ جا! اے ہماری کھیتی اور ہمارے حاصل آ جا! یہ خاکی پتلے تو پُرانے ہو گئے ہیں، اب ہماری مٹی سے ایک نیا آدم بنا ڈال۔)

اقبال کی دوبیتی عشق کی مذمت کرنے والوں کو جواب دیتی ہے:

دلِ من روشن از سوزِ درون است
جہاں بیں چشمِ من از اشک خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد
کسے کہ عشق را گوید جنون است
(ایضاً، ص ۲۲۵)

(ہمارا دل اندر کے سوز سے روشن ہے اور ہماری آنکھوں کو خون کے آنسوؤں سے روشنی عطا ہوئی ہے، خدا کرے کہ اسے زندگی کی سمجھ کبھی نہ آئے جو عشق کو صرف ایک پاگل پن سمجھتا ہے۔)

اس کے بعد اقبال کی دو بیتی ایک درجہ اور آگے بڑھتی ہے اور لالہ طور (ص ۹۵۔ ۲۲۵) والی عشقِ محض کی حامل دو بیتی ''ارمغانِ حجاز'' (ص ۹۰۵۔۹۴) تک پہنچ کر

عشقِ رسول ﷺ میں بدل جاتی ہے:

عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوی تو برد
بر تلاشِ خود چہ می نازد رہ سوی تو برد
(ایضاً،ص ۳۹۷)

(کوئی راستہ ہو، محبت سے طے کیا جائے تو وہ خود بہ خود راہی کو آپ ﷺ کی گلی میں لے جاتا ہے اور یہ سب میری تلاش کا ثمر نہیں، بلکہ ہر محبت بھرا راستہ جاتا ہی آپ ﷺ کی طرف ہے۔)

اقبال اپنی ایک دوبیتی میں یوں فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی نہ صرف تعینِ اوّل اور وجہِ تخلیقِ کائنات ہے، بلکہ رونقِ کائنات بھی ہے:

شہیدِ ناز او بزمِ وجود است
نیاز اندر نہاد ہست و بود است
نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب
بسیمای سحر داغِ سجود است
(ایضاً،ص۱۹۵)

(عالمِ اجسام آپ ﷺ کے ناز کا شہید ہے اور اسی وجہ سے دنیا میں نیاز مندی ہے، یہ آسمان پر دمکتا ہوا سورج دراصل آپ ﷺ کے در پر سجدوں کی وجہ سے آسمان کے ماتھے پر پڑا محراب ہی تو ہے۔)

اقبال اپنے اردو مجموعہِ کلام ''بالِ جبریل'' میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

آیۂ کائنات کا معنیِ دیر یاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہاے رنگ و بو
(اقبال،۲۰۰۷ء،ص ۴۴۰)

اقبال ''جاوید نامہ'' میں اپنے اسی نظریے کا اعادہ کرتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا از نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است
(اقبال ،۱۹۹۰ء بار ششم، ص۷۱٦)

(جہاں جہاں تمھیں خوش بوؤں کے رنگ نظر آتے ہیں اور وہ تمام کچھ جو کسی کی آرزو یا امکان میں ہے، ان میں ہر ایک آپ ﷺ کے نور سے موجود ہے یا آپ ﷺ کے نور کی تلاش میں ہے۔)

اقبال کی دوبیتی کی شکل میں رسولِ پاک ﷺ کے فضائلِ مبارکہ، شمائلِ حسنہ، مکارمِ کریمانہ اور اعجازِ فاضلہ کا بیان تو ملتا ہے اگرچہ نہایت کم، مگر اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے آپ ﷺ کے دربار میں تضرع اور زاری کے ساتھ استغاثہ، الحاح اور دعا کرنا اقبال سے پہلے انتہائی کم ملتا ہے، اور اقبال اپنی ۱۲۸ دوبیتیوں کے ہمراہ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دینے چل پڑتے ہیں (اقبال ۱۹۹۰ء، ص۹۹۰-۹۴۴)۔ چوں کہ اقبال اور ان کی دوبیتی جان چکے ہیں کہ یہی وہ واحد آستانہ ہے جو ہر بے خانہ کا خانہ، اور ہر بے لانہ کا لانہ اور ہر بے آشیانہ کا آشیانہ ہے۔ تعداد کی یہ کثرت اور اسلوب کا یہ والہانہ پن پوری فارسی، اقبال کے سوا پیش کرنے سے قاصر ہے:

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرودِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشائد پر بہ فکرِ آشیانہ
(اقبال،۹۹۰ء،ص۹۰٦)

(میں اس بڑھاپے میں محبت بھرے گیت الاپتے ہوئے مدینہ منورہ کی طرف چل پڑا ہوں، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی پرندہ شام ہونے کے قریب اپنے گھونسلے کی طرف چل پڑتا ہے۔)

اقبال اس تمام راستے کو قدموں کے بجائے سر کے بل، سر کے بل بھی نہیں، بلکہ پلکوں کے بل، بلکہ پلکوں کے بل بھی نہیں روح کے بل طے کرتے ہیں کہ یہی روش اس راستے کو شایانِ شان ہے۔ بدن کی طاقت تو ختم ہو چکی اور روح کی طلب کے سہارے اقبال کہتے ہیں:

بدن وامانده و جانم در تگ و پوست
سوے شہری کہ بطحا دررہِ اوست
تو باش ایں جا وباخاصان بیامیز
کہ من دارم ہواے منزلِ دوست
(ایضاً،ص۹۰۱)

(اگرچہ میرا جسم شل ہو چکا ہے مگر میری روح ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی اور اسی شہر کی طرف سرگرمِ سفر ہے جس کا راستہ خانہ کعبہ سے ہو کر جاتا ہے اور پھر مجھے اپنے محبوب کے پاس بھی تو جانا ہے۔)

اقبال کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ سے ہمارا تعلق جسمانی نہیں، بلکہ روحانی ہے، جس میں اس کے درمیان میں زمانی اور مکانی دوریاں حائل نہیں ہوتیں، اور وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے، کے تحت اس سے ہماری وابستگی میں ایک شانِ محبوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ انسان تو کیا فرشتوں کو بھی نہیں ہوسکتا، کیوں کہ:

کجا نوری کہ غیر از قاصدی چیزی نمی داند
کجا خاکی کہ در آغوش دارد آسمانی را
(ایضاً،ص۹۴۶)

(اگرچہ وہ (جبریل امین علیہ السلام) نوری ہے، مگر محض پیغام لانے اور لے جانے سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہے؟ جب کہ آپ ﷺ کی ذات خاکی ہے، مگر پوری کائنات آپ ﷺ کے دامن میں ہے۔)

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست
طوافِ او طوافِ بام و در نیست

میانِ ما و بیت اللہ رمزی ست
کہ جبریل امین را ہم خبر نیست
(ایضاً،ص۹۸۶)

(حرم صرف قبلۂ قلب ونظر ہے اور کچھ نہیں اور اس کا طواف، ایک عمارت کے طواف سے زیادہ کچھ نہیں ہے میرے اور بیت اللہ میں ایک راز ایسا بھی ہے جس کی جبریل امین علیہ السلام کو بھی خبر نہیں ہے۔)

اقبال کے مطابق اسلام بجز رضا جوئی مصطفیٰ ﷺ اور پاس داریِ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ کچھ بھی نہیں۔فیضِ الٰہی کا نزول اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف ہوتا ہے، جب کہ فیضانِ رسالت ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف سفر کرتا ہے:

در آن دریا کہ او را ساحلی نیست
دلیلِ عاشقان غیر از دلی نیست
تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو ما را منزلی نیست
(ایضاً،ص ۹۲۸)

(عشق وہ سمندر ہے کہ اس کا کنارہ کوئی نہیں اور عشاق کے لیے اُن کا دل ہی ان کا رہنما ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے حکم دیا تو ہم حج کے لیے چلے جاتے ورنہ آپ ﷺ کے علاوہ ہماری منزل اور کوئی نہیں) یعنی:

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
(اقبال، ۲۰۰۷ء،ص ۷ ۴)

اقبال کی دوبیتی کا قافلہ آہستہ آہستہ اور درجہ بہ درجہ عقیدت کا یہ سفر طے کرتی ہے اور اس بارگاہِ بے کس پناہ میں باریابی کا پروانہ حاصل کرنے کے لیے اپنے نام کا اندراج کچھ اس انوکھے انداز میں کرواتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

چہ خوش صحرا کہ دروی کارواں ہا
درودی خوان و محمل بہ رانند
بہ ریگِ گرم او آور سجودی
جبیں را سوز تا داغی بہ ماند
(ایضاً، ص ۹۰۸)

(وہ کیسا اچھا صحرا ہے کہ جس کے اندر قافلے درود وسلام پڑھتے ہوئے چلتے ہیں اور اس کی گرم ریت پر سجدے کرتے ہیں اور اپنے ماتھے کو داغتے ہیں۔)

اقبال کی دوبیتی کو حاضری نصیب ہوتی ہے تو تمام سوچے ہوئے جملے، ساختہ و پرداختہ عبارتیں، تمام طے شدہ مشورے اور مسودے پیچھے رہ جاتے ہیں، اور اشک آگے بڑھ جاتے ہیں، اور وہ منظر بڑا دیدنی ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

بیا ای ہم نفس باہم بہ نالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفی بر مرادِ دل بہ گویم
بہ پای خواجہؐ چشمان بہ مالیم
(ایضاً، ص ۹۱۱)

(اے میرے ساتھی آ ہم مل کر رولیں، کیوں کہ ہم دونوں ایک ہی محبوب کے متوالے ہیں اور میں اگر اپنا سارا مدعا دو حرف میں بیان کروں تو صرف اتنا ہی ہے کہ ہم اپنی آنکھیں آپ ﷺ کے قدموں پر مَلنا چاہتے ہیں۔)

اقبال بتاتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کائنات میں تعینِ اوّل ہے، اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں متقی اور فرزانے تو ایک طرف یارسول اللہ ﷺ کا نعرہ بلند کرنے والے دیوانے کے لیے بھی زمانی اور مکانی فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور اعالی اور ادانی کے فرق یکسر مٹ جاتے ہیں اور ہر عاصیِ پُر معاصی کو ''بیا بیا'' کی آواز سنائی دیتی ہے، اور آپ ﷺ کی بارگاہ اس کے لیے اک طورِ مدامی کی حیثیت رکھتی ہے:

درین وادی زمانی جاودانی
ز خاکش بی صور روید معانی
حکیمان باکلیمان دوش بر دوش
کہ این جا کس نگوید ''لن ترانی''

(ایضاً،ص۲ ۹)

(وہ وادی کہ جس میں وقت بھی تھم جاتا ہے اور جہاں واقعات اسباب کی محتاجی سے آزاد ہو جاتے ہیں، جہاں خاص و عام دونوں برابر نوازے جاتے ہیں اور جہاں کوئی کسی کو''لن ترانی''، نہیں کہتا۔)

آپ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچنے والا یہ قافلہ اپنی تمام تر بے قراریوں کے باوجود سراپا ادب، اپنی سب بے خوابیوں اور بے تابیوں سمیت سراپا نیاز، بہ چشمِ پرنم صرف یہی کہہ پاتا ہے کہ ہم سب تیری دی ہوئی آنکھوں سے اور تیرے بخشے ہوئے ذوقِ دیدار سے تجھے دیکھنے اور تیری بلائیں لینے آئے ہیں:

بہ چشمِ من نگہ آوردۂ تست
فروغِ لا الٰہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبح ''من رآنی''
شبم را تابِ مہ آوردۂ تست

(ایضاً ،ص۹۳۴)

(ہماری آنکھ کا نور آپ ﷺ ہی سے دریوزہ کیا ہوا ہے۔ ہماری لا الٰہ کو آپ ﷺ ہی سے بڑھاوا ملا ہے۔ مجھے اپنی زیارت عطا کیجیے کہ آپ ﷺ ہی میری اندھیری راتوں کا چاند ہیں۔)یعنی:

لَوح بھی تُو ،قلم بھی تُو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آ بگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ،عشق حضور و اضطراب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کُہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ، عقل تمام بُولہب
(اقبال، ۲۰۰۷ء،ص۴۴۰۔۴۴)

دید کی عید نصیب ہو جانے کے بعد یہ نیاز مند قافلہ قدرے بے باک ہو جاتا ہے، اور مسرور ہو کر یہ رندِ پاک طینت ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے:

بہ کوی تو گدازِ یک نوا بس
مرا این ابتدا ، این انتہا بس
خرابِ جرأتِ آن رندِ پاکم
خدارا گفت ما را مصطفیٰ ﷺ بس
(ایضاً ،۹۴۱)

(آپ ﷺ کی گلی میں مجھے صرف ایک مؤثر صدا لگانے کا شرف عطا ہو جائے۔ میرے لیے یہی کافی ہے اور میری آخری اور پہلی خواہش صرف یہی ہے اور ایک نجیب فطرتِ رند کے جرأت بھرے نعرے نے میری تو کایا پلٹ دی ہے جو خدا کو یہ کہہ دیتا ہے کہ مجھے صرف آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی کافی ہے۔)

یہ نعرۂ مستانہ لگانے کی ایک خاص وجہ ہے۔ یہ تحدیثِ نعمت ہے تکبر نہیں، بلکہ ان کے دیوانے اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال کی دوبیتی آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو مرکزِ مہر و وفا سمجھتی ہے۔ اور محبت، مستی، عشق، شوق سب کا منبع حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اقبال یہاں اپنی ایک دوبیتی میں مولانا جلال الدین محمد بلخی رحمۃ اللہ علیہ، رومی رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۲ھ) اور قرآنِ پاک کی ترکیب ''عبدہٗ'' لاتے ہیں اورایک بے نظیر لطافتِ عرفانی کے رنگ میں کہتے ہیں کہ جب جہانِ شوق کی بات ہو رہی ہوتی ہے تو پھر

وہاں پروردگار آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہی قرار پاتی ہے:

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدۂ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است
(ایضاً، ص۹۷۳)

(محبت کا تسلسل آنکھ سے آنکھ میں ابلاغ سے مستحکم ہے، آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے کسی کو کتنی عملی محبت ہے، یہی اس کا معیار ہے، اگرچہ آپ ﷺ کا مقام ''عبدۂ'' [اس کا بندہ] ہے، مگر کائناتِ شوق کی پروردگار آپ ﷺ ہی کی ذاتِ مقدسہ ہے۔) یعنی:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں ، وہی فرقاں ، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
(اقبال، ۲۰۰۷ء، ص۳ ۳)

عبد اور عبدۂ میں جو فرق ہے اسے خود اقبال نے ارمغانِ حجاز سے پہلے ''جاوید نامہ'' میں اس کچھ اس طرح واضح کیا ہے:

عبد دیگر عبدہ چیزی دیگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہ دہر است و دہر از عبدہ است
ما ہمہ رنگیم او بی رنگ و بو است
عبدہ با ابتدا ، بی انتہا است
عبدہ را صبح و شامِ ما کجا است
کس ز سرِ عبدہ آگاہ نیست
عبدہ جز سرِ الا اللہ نیست
لا الہ تیغ و دمِ او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ہو عبدہ

عبدہ چند و چگونِ کائنات
عبدہ رازِ درونِ کائنات

(ایضاً،ص۷۱۷)

(عبد اور ہے اور عبدہٗ چیز ہی کچھ اور ہے۔ ہم سراسر چشمِ براہ ہیں اور وہ ہمارا مہمان ہے۔ عبدہٗ خود زمانہ ہے اور زمانہ اگر ہے تو اسی کے دم قدم سے۔ ہم سب رنگ ہیں اور وہ خوش بو ہے۔ عبدہٗ اپنی ابتدا سے ہی لازوال ہوتا ہے۔ عبدہٗ کی صبح و شام ہماری طرح کی نہیں ہوتی۔ عبدہٗ ایک راز ہے اور کوئی مکمل طور پر اس سے آگاہ نہیں ہے جب کہ خود عبدہٗ الا اللہ کا راز ہے۔ الا اللہ کی تلوار ہے اور عبدہٗ اس کی دھار ہے۔ عبدہٗ کے بارے میں برملا گفتگو کی جائے تو عبدہٗ اس کائنات کی کمیت بھی ہے اور کیفیت بھی اور وہی اس کائنات کا باطن ہے۔)

یہ سب جیسے بھی ہیں، ہیں تو آپ ﷺ کے اور ان کا آپ ﷺ سے تیرِ نگاہ کا پرانا رشتہ چلا آتا ہے:

محبت چیست تاثیرِ نگاہی ست
چہ شیرین زخمی از تیر نگاہی ست
بہ صید دل روی! ترکش بینداز
کہ این نخچیر نخچیر نگاہی ست

(ایضاً،ص۱۰۰۲)

(آنکھوں کی تاثیر کو محبت کہتے ہیں اور نگاہ کا تیر کتنا دل کش ہوتا ہے، تو دلوں کو شکار کرنے جا رہا ہے تو پھر ترکش کی ضرورت نہیں چوں کہ یہ نخچیر تو تیرِ نگاہ کا نخچیر ہے۔)

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا

(خورشید رضوی، ۲۰۰۷ء، ص۲۴)

تعلق، توجہ اور التفات کے یہ مراحل طے کر لینے کے بعد اقبال کی دو بیتی اقبال کی زبانی اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے مدعا بیان کرتی ہے، یارسول اللہ ﷺ یہ نیم جانی کی کیفیت مزید برداشت نہیں ہوتی:

دگر پاکیزہ کن آب و گلِ او
جہانی آفرین اندر دلِ او
ہوا تیز و بہ دامانش دو صد چاک
بیندیش از چراغِ بسملِ او
(ایضاً، ص۹۱۶)

(اقبال استغاثہ کرتے ہیں کہ اے رسولِ پاک ﷺ موجودہ مسلمان کی مٹی اور پانی کو پھر سے پاکیزہ کر دیجیے۔ اس کے دل میں ایک نئی دنیا آباد کر دیجیے۔ آندھی اُمڈ آئی ہے اور اس کا دامن بھی تار تار ہے اور اس کا چراغ بھی بجھا ہی چاہتا ہے۔)

یہاں ''چراغِ بسمل'' کی ترکیب بڑی دل آویز ہے، اور شاید فارسی شاعری میں اس سے پہلے یہ ترکیب مستعمل نہیں رہی۔ اس کے بعد اقبال کی نیاز مندی اپنی ذات سے بڑھ کر اپنی قوم، اپنے معاشرے تک کو اپنے محیط میں گھیر لیتی ہے۔ اور اقبال بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ میری قوم کی تیرہ بختی کو صرف آپ ﷺ کی توجہ ہی دور کر سکتی ہے:

شبِ ہندی غلامان را سحر نیست
باین خاک آفتابی را گزر نیست
بہ ما کن گوشہ چشمی کہ در شرق
مسلمانی ز ما بی چارہ تر نیست
(ایضاً، ص۹۱۳)

(برطانوی ہند کے غلام مسلمانوں کی رات کی کوئی صبح نہیں ہے اور اس زمین سے [لگتا ہے] سورج کا گزر نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ ہماری طرف اپنی آنکھ کا گوشہ فرما دیجیے کہ آج ہماری بدحالی سب مسلمانوں سے زیادہ ہے۔) یعنی:

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری
(اقبال، ۲۰۰۷، ص۳۷۲)

اقبال کی دو بیتی مسلمانوں کی قدیم وابستگی اور عظمتِ رفتہ کا واسطہ دیتے ہوئے اپنی التجا، تضرع، الحاح، بلکہ استغاثہ کی صورت میں اپنی ضرورت کا اعادہ کرتی ہے:

مسلمان آن فقیر کج کلاہی
رمید از سینہ او سوز آہی
دلش نالد چرا نالد نداند
نگاہی یارسول اللہ ﷺ نگاہی
(ایضاً، ص۹۱۲)

(مسلمان تو گدائی میں بادشاہی کرنے والا تھا، مگر اس کے دل سے آپ ﷺ کی محبت نکل گئی ہے اور اس کا دل روتا ہے اور اسے اتنی خبر نہیں کہ یہ کیوں رو رہا ہے؟ اے رسولِ پاک ﷺ! آپ ﷺ کی توجہ درکار ہے۔)

اقبال کا حسنِ طلب اور استغاثے کا اسلوب بھی بڑا دیدنی ہے۔ اقبال بہ چشمانِ پرنم، بہ چہرۂ خاک آلود، بہ بدن لرزیدہ اپنے حال کو مقال بنا کر حضورِ رسالت مآب ﷺ میں عرض کرتے ہیں:

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست
بجز دستِ تو ما را دست رس نیست
دگر افسانہ غم با کہ گوئیم
کہ اندر سینہ ما غیر از تو کس نیست
(ایضاً، ص ۹۲۷)

(ہمارے اندر سانس کے دھویں کے سوا کچھ نہیں بچا ہے اور سوائے آپ ﷺ کے ہمارا کوئی سہارا نہیں ہے۔ ہم اپنی بپتا آپ ﷺ کے سوا اور کس کو جا سنائیں کہ ہمارے دل میں سوائے آپ ﷺ کے اور کوئی ہے ہی نہیں۔)

شدید انتظار کے بعد بھی وقتِ وصال مزید ادب کو بحال رکھنے کا قرینہ اقبال نے میر سے لیا، کہ دوڑتے اور ہانپتے ہوئے آنے کے باوجود بھی پاسِ ادب یہ ہے کہ دستِ میر

تو کیا غبارِ میر بھی دامنِ محبوب پر نہ پڑ جائے اور اندازہ کیجیے کہ یہ کیسے اور کہاں ہوگا:

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(میر، ''نقوش'' میر نمبر۱۹۸۰، ا، ص ۲۳۷)

نیچی آنکھیں ہم ان کو دیکھا کیے
کبھی اونچی نگاہ کرتے تھے

(ایضاً، ص ۶۰۹)

کچھ تو کہے گا ہم کو خاموش دیکھ کر وہ
اس بات کے لیے اب چپ ہی رہا کریں گے

(ایضاً، ص ۳۴۵)

اقبال بھی اپنی اس کیفیت کو یوں ادا کرتے ہیں:

زبانِ ما غریبان از نگاہی ست
حدیثِ درد مندان اشک و آہی ست
کشادم چشم و بر بستم لبِ خویش
سخن اندر طریقِ ما گناہی ست

(اقبال، ۲۰۰۶ء ص ۹۲۶)

(ہم انجانوں کی نگاہ زبان ہوتی ہے اور ہمارا رونا دھونا ہی ہماری عرض داشت ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنی زبان بند کر کے آنکھیں کھول لی ہیں کہ عشاق کو برملا گلے زیب نہیں دیتے۔)

اقبال مزید کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دامن سے مکمل اور مستقل وابستگی ہی ہمارے لیے متاعِ غرور ہے:

مران از در کہ مشتاق حضوریم
ازان دردی کہ دادی نا صبوریم

بفر ما ہر چہ می خواہی بجز صبر
کہ ما از وی دو صد فرسنگ دوریم
(ایضاً،ص ۹۲۸)

(مجھے اپنے در سے دور مت کیجیے کہ مجھے زیارت کی آرزو ہے۔ آپ ﷺ کے ہجر نے مجھے بالکل بے بس کر دیا ہے۔ مجھے آپ ﷺ ہر حکم دیجیے، مگر صبر کا نہ کہیے گا کہ میں اب صبر سے بہت ہی دور نکل آیا ہوں۔)

فارسی دو بیتی ماورائی، الٰہیاتی اور صوفیانہ مضامین کی حیرتوں میں گم، چپ سادھے کھڑی تھی کہ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے فلسفے میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اور پریشان اور منتشر ہوگئی۔ اس نے خمریات میں اپنا غم غلط کرنا چاہا، مگر جب خمار ٹوٹا اور ہوش آیا تو وہ عبرت کا نشان بن چکی تھی کہ اچانک اقبال جیسے دانائے راز کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں آیا۔ جس نے اس حیران اور منتشر صنفِ سخن کو عشق کے نقطے پر مرتکز کیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ مسرور اور مخمور صنف جنونِ باشعور کی دولت پا کر کہیں متکبر و مغرور نہ ہو جائے۔ تو مزید تہذیب اور تحریک دے کر اس کے عشقِ محض کو عشقِ رسول ﷺ میں بدل دیا، اور اس میں ایسا عجز و نیاز پیدا کر دیا کہ خمریات کی بے توقیر گلیوں میں پڑی یہی فارسی دو بیتی اقبال کے ہاتھوں اس کی قوم کا استغاثہ لے کر دربارِ رسول ﷺ میں حاضر کھڑی نظر آتی ہے۔ خواجہ ابو سعید ابو الخیر، عمر خیام، بابا طاہر عریاں اپنی دو بیتی پر ناز کرتے ہیں۔ جب کہ فارسی دو بیتی اقبال پر ناز کرتی ہے۔

اقبال کی دو بیتی نے واضح کر دیا ہے کہ عشق جب عشقِ رسول ﷺ میں ڈھل جاتا ہے تو پھر اس میں ایک اور طرح کا دم خم آ جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک ذاتی رویہ، شخصی نظریہ، نجی معاملہ اور انفرادی شیوہ کے بجائے ایک اصول، ایک جیتی جاگتی حقیقت، ایک رائج حکمت، ایک مروّج علاج، ایک ہمت اور ایک توانائی بن جاتا ہے۔ وہ ایک لمحاتی، مؤقتی اور ساعتی حالت سے بڑھ کر ایک ازلی، ابدی اور سرمدی حالت میں بدل جاتا ہے۔ اور ایک ذاتی، شخصی، انفرادی صورتِ حال سے ایک آفاقی اور کائناتی کیفیت بن جاتا ہے۔

فارسی دوبیتی کے بحرِ بے کراں میں صرف اقبال نظر آتے ہیں جنھوں نے دوبیتی کی شکل میں اپنا اور اپنی قوم کی زبوں حالی کا استغاثہ حضور رسالت مآب ﷺ میں پیش کیا ہے۔ اسی لیے اقبال اور اقبال کی دوبیتی سازِ حیات کے لیے اس سوز کو، اپنے ہوش وحواس کے ارتکاز کے لیے اس گداز کو، اپنی روح کے اطمینان کے لیے اس بے قراری کو، اپنے نازِ زیست کے لیے اس نیازمندی کو سروری کے لیے اس چاکری کو، سرفرازی کے لیے اس سرفروشی کو، آزادی کے لیے اس بندگی کو اور درماں کے لیے اس درد کو طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

منابع

۱۔ ابوسعید ابوالخیر، خواجہ، ۱۳۳۴ش، سخنان منظوم ابوسعید ابوالخیر، بہ کوشش، استاد سعید نفیسی، ایران، تہران۔

۲۔ اقبال محمد، ڈاکٹر۔۱۹۹۰ بارِ ششم، ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز اردو بازار، پاکستان، لاہور۔

۳۔ اقبال محمد، ڈاکٹر ۲۰۰۷، بارِ ہشتم، ''کلیاتِ اقبال'' (اردو) پاکستان، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور۔

۴۔ اکرام، سیّد محمد اکرم، ڈاکٹر، ۱۹۸۲م، اقبال درراہ مولوی، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور۔

۵۔ بابا طاہر عریاں، ۱۹۰۱م، ترانہ ہاے باباطاہر عریاں، بہ کوشش، یوسف جمشید پورو ایدورد ھارن ایلن، ایران، تہران۔

خورشید رضوی، ڈاکٹر، ۲۰۰۷ء، ''شاخِ تنہا''، پاکستان، لاہور۔

۶۔ خیام، عمر بن ابراہیم، حکیم، ۱۳۲۱ش، ''رباعیاتِ خیام''، بہ کوشش محمد علی فروغی، ایران، تہران۔

۷۔ رومی، جلال الدین محمد، مولانا، ۱۳۶۹ھ، ''کلیاتِ شمس تبریزی''، بہ کوشش استاد بدیع الزمان فیروز انفر، ایران، تہران، اشارات طلایہ۔

۸۔ عارف، عبدالمتین، ۱۹۷۵م، امکانات، ٹیکنیکل پبلشرز، پاکستان، لاہور۔

''نقوش'' (سالانہ)، میر نمبر ا، محمد طفیل مدیر، ۱۹۸۰ء، پاکستان، لاہور، ادارہ فروغِ اردو، شمارہ نمبر ۱۲۵۔

کاشف عرفان

کلامِ اقبال میں نعتیہ عناصر
——ساختیاتی جائزہ

علامہ محمد اقبال اردو شاعری کا وہ باکمال نام ہیں جن کے ہاں نظریہ اور فکر ہمیشہ فن پر غالب رہے ہیں۔ اقبال کے ہاں ملی شاعری کے بین السطور بھی عشقِ رسول ﷺ اور سیرتِ پاک سے متصف فکر رواں رہتی تھی۔ وہ سیرتِ پاک ﷺ اور مطالبِ قرآن پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ حضرت محمد ﷺ ہی تمام مظاہر و حقیقت کا سرچشمہ ہیں اور آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات تمام کمالاتِ ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے۔ اقبال کے ہاں مرکزی فکر کے طور پر عشقِ رسول ﷺ شاعری کا حصہ بن کر اُبھرتا ہے۔ وہ عشق کو ایک قوت قرار دیتے ہیں جو صرف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے توسل سے حاصل ہوتا ہے۔

''ارمغانِ حجاز'' میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اقبال عشق کو ہمیشہ عقل (خرد) کے مقابل لاکھڑا کرتے کہ علامہ کے خیال میں دونوں جذبوں کی فکر کے درمیان ایک بہت بڑا فاصلہ ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اُس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں[☆1]

اقبال کے کلام کو ساختیاتی اندازِ نقد ونظر کے ذریعے جانچنے سے پہلے ہمیں اس مغربی اور کسی حد تک پیچیدہ اندازِ نقد کو اس کی بنیاد میں جا کر سمجھنا ضروری ہوگا۔

ساختیات کا نظریۂ تنقید مغرب میں بیس ویں صدی کے آخری ربع میں مقبول ہوا۔ یہ اندازِ نقد منطق کے اصولوں پر مبنی ایسا اندازِ فکر ہے جو ادب اور سائنس کے دوراہے پر تخلیقات کی منطقی پرکھ کرتا ہے۔ ساختیات کا نظام رشتوں پر قائم ہے اور یہ رشتے فن کار کے اندرونی فکری نظام سے بھی ہیں اور باہر کی دنیا سے بھی۔ گویا رشتوں کا ایسا نظام جو فن پارے کو فن کار کے فکری نظام سے منسلک کر کے دیکھتا ہے اور ساختیہ (Structures) کے ساتھ ایک مجرد نظام کا قیام ہی ساختیاتی اندازِ فکر کی بنیاد ہے۔ ساختیہ ٹھوس اشیا کا مرکب نہیں، بلکہ رشتوں کا ایک ان دیکھا مجرد نظام ہے جو ہمیشہ عناصر کی مکمل ترتیب و تنظیم پر مشتمل نہیں ہوتا، بلکہ یہ عناصر کی حاصل جمع سے زیادہ یا کم بھی ہوسکتا ہے۔ دراصل یہی وہ نکتہ ہے جہاں ادب اور سائنس کے درمیان ایک اختلافی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ منطق ہمیشہ حاصل جمع کو ایک مکمل حسابی دائرے میں رکھنے پر زور دیتی ہے، جب کہ ادب مکمل طور پر منطقی نہیں ہوسکتا کہ فن پارے کی تخلیق بہ ذاتِ خود مکمل منطقی عمل نہیں ہے۔ دراصل ساختیاتی اندازِ نقد ادب کو منطق کے قریب تر رکھ کر درست نتائج نکالنے کا عمل ہے۔ ساختیاتی اندازِ فکر میں ادب پارے کی بنیاد میں چھپے اس سسٹم یا کوڈ کا پتا چلایا جاتا ہے جو کسی فن پارے کی بنیاد بنتا ہے، لیکن اس سسٹم یا کوڈ کو ہم ہمیشہ ایک سی صورت میں نہیں دیکھ سکتے کہ ان پیٹرنز میں تغیرات نمودار ہوتے ہیں۔ یہ تغیرات دراصل فن کار کی لاشعوری

کیفیات میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث پیدا ہوتے ہیں، تاہم اس سسٹم کی بنیاد میں تبدیلیاں واقع نہیں ہوتیں، بلکہ اس سسٹم میں تعمیر کے باعث کچھ خلا یا کھائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جنھیں ناقد یا قاری اپنے مطابق بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساختیاتی نظام ایک باقاعدہ نظام ہے جس کے اپنے قاعدے یا گرامر موجود ہے۔ ساختیہ کسی نئے نظام کے خود میں داخل ہونے پر مزاحمت کرتا ہے اور باہر سے آنے والا مظہر یا شے فوراً اُسی سسٹم یا گرامر کے تابع ہو جاتا ہے۔

مغرب میں فرد عمومی سطح پر سائنسی اور منطقی ذہن رکھتے ہیں۔ وہاں اب ادب کو بھی سائنسی شکل وصورت میں دیکھنے کا رجحان تقویت پکڑ رہا ہے۔ انیس ویں صدی تک مغرب میں بھی تاثر اور رائے کو ادب پارے کی تنقید میں اہم سمجھا جاتا تھا اور سوچ کا منطقی انداز اہم نہیں تھا۔ بیس ویں صدی کے آغاز میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ہی ادب اور تنقیدِ ادب پر بھی بڑی واضح تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زبان کے حوالے سے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ گفتگو میں استعمال ہونے والی زبان کن پیٹرنز (patterns) کے تحت تشکیل پاتی ہے۔

سوچ کا یہ انداز خالصتاً سائنسی فکر کا متقاضی تھا جس میں عمل کو دوسرے عمل کا منطقی نتیجہ اور محرک قرار دیا جاتا تھا۔ یوں مظاہر کو خطِ مستقیم میں سفر کرتے ہوئے علت ومعلول کے اصول کو ہی ادب اور سائنس دونوں کے لیے یکساں کارگر قرار دیا جانے لگا۔ بیس ویں صدی کے آخری ربع میں انسانی ذہن کی پیچیدگی کو بیان کرنے کے لیے اصول وضوابط بنائے جانے لگے، یوں سوچا جانے لگا کہ مظاہر صرف خطِ مستقیم میں ہی سفر نہیں کرتے، اُن کی حرکت رینڈم (randum) ہوسکتی ہے، تو ایسے میں اُس کے بیان کے لیے بھی کسی ایسے نظام کی ضرورت ہے جو اپنے بیان میں صرف خطِ مستقیم پر حرکت کرنے والی اشیا یا مظاہر کی پرکھ نہ کرے۔ یوں ساختیاتی اندازِ فکر پر سوچا جانے لگا۔ مرکز کے بجائے کوڈ اور سسٹم میں مختلف رشتوں کے ذریعے ایک ایسے نظام کی تخلیق پر سوچا جانے لگا جہاں اُن ادب پاروں کی تخلیق پر بھی گفتگو ہو سکے جن میں حاصل جمع ہر مرتبہ منطق کے مطابق نہیں

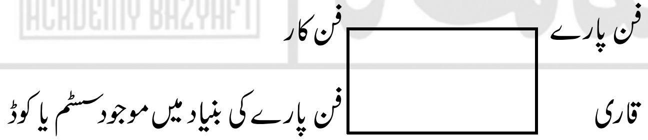
آ تا، مثلاً اسطور (Myth)، حکایات، داستان، رزمیہ نظمیں، گوئٹے، حافظ، غالب، میر اور اقبال کی شاعری وغیرہ۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اسطور کے بارے میں لکھا تھا:

> جب ہم اسطور کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم پر انکشاف ہوتا ہے کہ اسطور محض لاتعداد مختلف دیومالائی کہانیوں کے مجموعے کا نام نہیں، بلکہ اس کی حاصل جمع سے کچھ زیادہ ہے۔☆[۲]

ساختیاتی نظریۂ نقد ونظر سائنس سے عبارت ہے اور سائنس نظامِ زندگی کو مادی ٹھوس شے کے بجائے رشتوں کی اکائی سمجھ رہی ہے۔ برق (بجلی) اور وقت کو اضافی تصور کرنے سے اب مادہ اساسی اکائی نہیں رہا، بلکہ برقی قوت کو اکائی سمجھا جا رہا ہے تاہم گریوٹیان (God Particle) کی دریافت کے بعد ان نظامِ کائنات کو صرف برق (بجلی) اور روشنی کو مرکزی حیثیت دے کر تسلیم کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ساختیات فن کار، فن پارے اور قاری کی مثلث میں ایک چوتھی سمت کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے جو کسی بھی فن پارے کی تفہیم کے لیے ان تینوں کی طرح ہی اہم ہے۔



فن پارے کی بنیاد میں موجود اس گرامر یا کوڈ کو سمجھنا فن پارے کے معنی کی تلاش کے لیے ضروری ہے۔ ایک ہی فن کار کے مختلف فن پاروں میں موضوعات یا شخصیت کی پیچیدگی کے باعث ہونے والی تبدیلی اسی کوڈ کے تحت ہوتی ہے۔ آسان لفظوں میں فن پارہ صرف فن کار کی ذاتی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ اُس فن پارے کی تشکیل و ترتیب میں تخلیق کار کی لاشعوری کیفیات، معاشرتی عوامل، نفسیاتی مسائل، نظریات، خواب، آدرش اور اُس کی انانیت میں چھپی ایسی گرہیں۔

اردو نعت کی کلاسیکی روایت پر بات کرتے ہوئے آغاز اقبال سے کرنا ناقد کی دو طرح سے مجبوری بن جاتی ہے۔

اوّل: اقبال کی شاعری میں عشقِ رسول ﷺ کی منفرد کیفیات

دوم: الفاظ وتراکیب کا غیر روایتی استعمال

اقبال رحمۃ اللہ علیہ ان معنوں میں نعتیہ شاعر نہیں تھے جن معنوں میں ہم آج کے روایتی نعت گو شعرا کو لگے بندھے موضوعات، روزمرہ کی زبان، عمومی لہجے اور ذاتی حوالوں کے باعث نعت گو کہتے ہیں۔ ان شعرا کے ہاں سب کچھ عمومی سطح پر ہوتا ہے، نعت اور دوسری شاعری میں کہیں اختصاص نہیں آتا۔ اقبال کے ہاں تقریباً تمام شاعری میں احترامِ رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ملت کے مسائل نظر آتے ہیں۔ اقبال کی فکر کی خشتِ اوّل عشقِ رسول ﷺ ہے۔ اس بنیاد پر انھوں نے شعائرِ اسلامی کو تاریخی تناظر میں دیکھا۔ ساختیاتی حوالوں سے دیکھا جائے تو اقبال کے ہاں شعری گرامر یا کوڈ کے طور پر دو مختلف پیٹرنز بنتے ہیں۔ پہلا عشقِ الٰہی ومحبتِ رسول ﷺ اور دوسرا اسلامی تاریخ کو بہ حیثیت اجتماعی فکر کے دیکھنا۔ خود اقبال نے آلِ احمد سرور کے نام ایک خط میں اس حقیقت کا اظہار کیا تھا۔

> میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔[۳]☆

اقبال کے ہاں ساختیاتی فکر کے حوالے سے ایک بالکل مختلف اپروچ اور منفرد زبان و بیاں کے تصورات ملتے ہیں جو اُن سے پہلے ان کے پیش رووَں میں سے کسی کے ہاں موجود نہیں ہے۔ محسن کاکوروی، مولانا حالیؔ، مولانا جوہر یا مولانا ظفرعلی خان سب کے ہاں قرآنی فکر سے استفادہ تو موجود ہے، لیکن تاریخِ اسلامی سے حاصل کردہ تصورات کو ایک نئی اور مختلف زبان میں بیان کرنے کا ملکہ نہیں تھا۔

اس کی نفرت بھی عمیق اُس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں رفیق

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

ساختیات فکر اور الفاظ کے درمیان ایک ایسے تال میل کی دریافت کرتی ہے جو کسی فن پارے کے آفاقی بننے کی وجہ بنتی ہے۔ اسلوبیات کا حصہ ہونے کی وجہ سے اس میں فن کار کے اسلوب سے عہد کے اجتماعی اسالیب کا جائزہ لے کر فن کار کی قدر متعین کی جاتی ہے۔ خود ''اسلوب'' کی اصطلاح ہی ناقدین کے ہاں ایک مشکل اور ادق مرحلۂ تنقید بن چکی ہے۔ اسلوب کے تشکیلی عناصر دراصل کسی بھی تخلیق کار کے اندرون اور بیرون سے مل کر تیار ہوتے ہیں۔ اسلوب صرف شخصیت کا اظہار ہی نہیں، بلکہ اس میں معاشرتی عوامل کے ساتھ ساتھ اُس کی ذات کی پیچیدگی، تاریخی تناظرات، جغرافیائی تعمیرات، ادراکِ مذہب، لسانیاتی دائرہ، ذاتی مطالعہ و مشاہدہ، سائنسی و منطقی ارتقائی عوامل، معنی کے مختلف تناظرات، اجتماعی ادبی ارتقا اور انفرادی صلاحیت شامل ہوسکتے ہیں اور درونِ ذات کی وسعت اس فہرست کو مکمل بھی نہیں ہونے دیتی۔

ادب پارہ اپنی بنیادی ساخت میں دو طرح کے رجحانات رکھتا ہے:

اوّل: اساطیری ماضی بعید (تاریخی شعور) کے تسلسل کی بنا پر اپنی بنت کے اعتبار سے مابعد الطبیعیاتی ماہیت۔

دوم: منہاجی تشکل کے اعتبار سے ریاضیاتی معروض کا آئینہ دار۔

دونوں نکات واضح کرتے ہیں کہ ماہیت کے اعتبار سے رمز و حقیقت کا آمیزہ ایک ادب پارے کی تشکیل کرتا ہے اور ان دونوں قوتوں سے اسے فکری و فنی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ آسان زبان میں اگر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ کسی ادب پارے کے مکمل پیکر میں دو اجزا لازم ہیں، پہلا اُس کی رمزیت (روح) ہے اور دوسرا اُس کی حقیقت (جسم) ہے۔ اوّل الذکر

تاریخی تناظر اور اساطیری آغاز و تسلسل ہے جو روح کی طرح ادب پارے کے بدن میں سرگرداں رہتا ہے، لیکن دکھائی نہیں دیتا صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، اور ثانی الذکر کا تعلق تخلیق کار کی شخصیت پر موجود اس کے ثقافتی اور تمدنی تغیرات (حقیقت) سے ہے۔ رمزیت (روح) زبان کے اثرات سے تشکیل پاتی ہے اور جسم (حقیقت) فن کار کے اسلوب کا غماز ہوتا ہے۔

اقبال کے کلام میں ساختیاتی نقطۂ نظر سے رمزیت (روح) اور حقیقت (جسم) پر نظر دوڑائی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اساطیری ماضی بعید (تاریخی تناظرات) کے اعتبار سے مابعدالطبیعیاتی ہیئت کا بننا بہت نمایاں ہے۔ اقبال تاریخ کے قدیم گوشوں میں سے گزرتے ہوئے اور پھر اُن کا اپنے آج کے ساتھ تقابل کرتے ہیں۔ فکر کی یہ صورت خود اتنی پیچیدہ تھی کہ زبان (فن) کی انفرادیت سامنے آئی۔ اقبال سے پہلے زبان کو اس کی باطنی اور نامیاتی نشوونما کے بغیر بدلنے کی کوشش کی گئی، لیکن اقبال نے اردو زبان کی اُس روایت کو سمجھا جو وَلی دکنی سے میر و غالب تک اور پھر اُن کے استاد داغ تک پہنچی تھی۔ انھوں نے لسانی تشکیلات کے اجتماعی تجربات کو سمجھا جو ماضی میں رواں رہے۔ خاص طور پر سوداؔ کی شکوہِ لفظی اور میر کی سادہ کاری، لیکن غالب کے ہاں خطوط کی سطح پر پیش آنے والے زبان کے برتاؤ نے انھیں لاشعوری سطح پر وہ راستہ دیا جو آگے چل کر اقبال کا اسلوب ٹھہرا۔ انھوں نے شاعری کے اجتماعی اسلوب میں بنیادی نوعیت کی ترمیم زبان کی روایت کو سامنے رکھ کر کی۔ خود نظریاتی قوت نے انھیں یہ احساس بخشا کہ جس فکر کو وہ عام کرنا چاہتے ہیں وہ اکبرؔ، حالیؔ یا محسنؔ کے لسانی کلیات میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

دونوں اشعار علامہ کی ایک نعت سے لیے گئے ہیں جو ان کی نظم ''ذوق وشوق'' میں

شامل ہے۔ لفظوں کا درو بست اُس تہذیبی ارتقا اور ثقافتی تغیرات کی کہانی سنا رہا ہے جس سے علامہ کا عہد گزر رہا تھا۔ لوح، قلم، عالمِ آب و خاک، فروغ اور ذرّہ ٔ ریگ جیسے الفاظ وتراکیب اس شکوہِ لفظی کی کہانی سنا رہے ہیں جو فکر اور فن کے ادغام سے پیدا ہوتا ہے۔

مابعد الطبیعیاتی عوامل کو سمجھنا اور سمجھانا حمد و نعت کی آفاقی شاعری کا ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ تصورِ کائنات کی کوڈ ڈ شکل کو حمد و نعت کے تناظر میں دیکھنا دراصل موجود سے ماورا کو سمجھنے کا عمل ہے اور اقبال کے ہاں یہ عمل جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اقبال کے ہاں جدیدیت کے نظریات کو بھی مابعدالطبیعیاتی سطح پر استعمال کیا گیا ہے۔ وہ ملی شاعری کو دینی روح کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مسلم اجتماعی شعور پر تاریخی تقابل سے مسلسل ضربیں لگاتے ہیں۔ اس لیے وہ ماضی کی رخشندہ روایات کا تقابل حال سے کرتے ہیں اور مستقبل کے لیے روشن اُمیدوں کا راستہ کھولتے ہیں۔ اُن کے ہاں نعت روایتی موضوعات کی نعت نہیں۔ وہ ماضی کی شان دار روایات کی تصویر کشی کرتے ہیں اور پھر اپنے حال (Present) پر گریہ و زاری کرتے چلے جاتے ہیں۔ آخر آخر مستقبل کی روشن صبح کی اُمید پر اپنی نظم کا اختتام کرتے ہیں۔ اقبال روایت سے علاحدہ ہوئے بغیر جدیدیت کے علم بردار ہیں۔ روایت سے جدیدیت کو علاحدہ طور پر سمجھنے کے لیے یہ اقتباس دیکھیں:

> جدیدیت زمین سے اپنے رشتے کی تلاش کا عمل بھی ہے۔ فرد اس کائنات کے ساتھ ایک ایسے رشتے میں جڑا ہے جو خود اس کی تخلیقی قوت کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ یہ رشتہ دو طرفہ ہے یعنی سماج اور زمین بھی اس سے اتنے ہی اہم مطالبات کرتے ہیں اور انھی سوالات کے جوابات کی تلاش جدیدیت کی بنیاد ہے جو اُسے روایت سے علاحدہ کرتی ہے۔''[۴]☆

اقبال کی نعت میں جدیدیت کو سمجھنے کے لیے اُس تاریخی شعور کی ضرورت ہوگی جو چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ اور فکری تہذیب و تزئین پر مشتمل ہے۔ اقبال کے ہاں تلمیحاتی اشارے اسلامی تہذیب سے آتے ہیں جس کے ساتھ وہ فکری طور پر ہمیشہ سفر میں رہے۔

معراج النبی ﷺ کے حوالے سے ان کے چار مصرعے دیکھیے:

اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات[۵]

ساختیاتی سطح پر اقبال کی شاعری کے پسِ پردہ فکری نظام کا پہلا اور اہم ترین نکتہ ''عظمتِ انساں'' ہے۔ انھوں نے عظمتِ انساں کو ہمیشہ صرف ایک ہی شخصیت کے حوالے سے دیکھا اور بیان کیا اور وہ شخصیت آقاے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کی شخصیت ہے۔ کہیں وہ سرورِ کائنات ﷺ کی شخصیت کو مثال بنا کر اپنے آج کا موازنہ ماضی سے کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اقبال ایک مناجاتی کا روپ دھار لیتے ہیں، ملت کا غم انھیں اسلاف کے شان دار ماضی کی جانب رُخ موڑنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ مسلمانوں کے اجتماعی شعور پر ضرب لگاتے ہیں:

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہوگئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد ﷺ کا تمھیں پاس نہیں[۶]☆

اقبال کی شاعری کے پسِ پردہ کوڈ یا گرامر کا دوسرا اہم ترین نکتہ یہ بنتا ہے:

اجتماعی لاشعور اور اجتماعی شعور کا انضمام

مسلم اجتماعی شعور کو اقبال نے اپنے اشعار سے مسلسل متحرک کرنے کی کوشش کی اور ان کی شاعری مسلم اجتماعی شعور کی ایک بڑی واضح اور مفصل تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔ اقبال نے مسلم اجتماعی شعور کو جس طرح مہمیز دی اُس نے نعت کے تصور کو وسیع کر دیا

اور یہی اقبال کا اصل کارنامہ ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اقبال کے ہاں مسلم اجتماعی شعور انھیں بار بار شان دار ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ قرآن کی آیات کو شعر کا حصہ بناتے ہیں:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

اقبال کی فکر میں خودی کا بار بار آنا دراصل اس غیرتِ ایمانی کا ذکر ہے جو مومن کی زندگی کا اہم ترین حصہ رہی ہے۔ اقبال کے مردِ مومن کو نطشے کے سپرمین کی توسیع قرار دیا گیا، لیکن ایسا کہنے والے مردِ مومن میں موجود خصوصیات کو آقاے دو جہاں ﷺ کے حوالے سے دیکھنے سے قاصر تھے۔ اقبال مردِ مومن کو خودی کی قوت کا مظہر قرار دیتے ہیں:

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا[۷☆]

اقبال کا فکری نظام ان کے روایتی نعت لکھنے میں ہمیشہ مانع رہا۔ اقبال سیرتِ طیبہ کے ایسے طالبِ علم تھے جو تاریخِ اسلام اور نعت اور سیرت کے مختلف موضوعات کو اپنی زندگی سے علاحدہ محسوس نہیں کرتے تھے اور سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کی زندگی اُن کے لیے ایک روشن مثال بن کر سامنے آتی ہے:

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ ﷺ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اُس شہنشاہِ ﷺ معظم کو ملی
جن کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی[۸☆]

اقبال کی فکر میں عمل ایک بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عمل اُن کے ہاں مومن کی بنیادی پہچان ہے۔ وہ حج اور زیارتِ مدینہ کو عام زائر کی نظر سے دیکھنے کے بجائے عشقِ رسول ﷺ سے سرشار نظر سے دیکھتے ہیں:

زائرانِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں[۹]

دوسری جگہ وہ اسی عمل کی قوت کو اجتماعی سطح پر اس طرح پھیلاتے ہیں کہ رسوم و رواج اور خانقاہی نظام کے خلاف ایک داعی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہِ دل گیری[۱۰☆]

اقبال کے ہاں خودی کے مختلف شیڈز ہیں، لیکن اس ہمہ سمت کیفیت میں وہ مصطفیٰ کریم ﷺ کی سیرت کو ہی مثال بناتے ہیں:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی[۱۱☆]

اقبال کی شاعری میں لا الٰہ کی صدا دراصل خودی کا بیان ہے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کے پیغام سے ایک ایسے مردِ مومن کی تصور کھینچتے ہیں جو حضرت محمد ﷺ کی سنت پر عمل پیرا مسلمان ہے۔ ایسی ہر جگہ پر جہاں جذبہ فکر کی گہرائی کے ساتھ سامنے آتا ہے شکوہِ لفظی کا منظر حیران کن ہو جاتا ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ ☆[۱۲]

لا الٰہ الا اللہ کو ردیف کے طور پر استعمال کر کے پوری اُمتِ مسلمہ کو اقبال نے پیغام دیا کہ اللہ کو الٰہ ماننے کے بعد آپ کو کہیں جھکنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس نظم کا عنوان بھی انھوں نے ''لا الٰہ الا اللہ'' ہی دیا، لیکن اس پوری نظم میں توحید کے بیان کے ساتھ بین السطور نعت کے خوب صورت پھول بھی کھلتے اور مہکتے نظر آتے ہیں، گویا اقبال کے ہاں نعت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ بین السطور رواں نظر آتی ہے جو اردو کی پوری نعتیہ تاریخ میں بالکل مختلف اور یکتا ہے۔

اقبال کی نظریاتی شاعری ملت کے لیے پیغام تھی اور اس پیغام کو براہِ راست اور عام فہم کرنے کے لیے انھوں نے جگہ جگہ خطابت کا سہارا لیا۔

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

علامہ اقبال نے بیس ویں صدی میں قرآنِ حکیم کی تعلیمات اس اسلوب میں پیش کیں کہ دورِ جدید ان کو سمجھ سکے اور قبول کر سکے۔☆[۱۳]

اسی کے ساتھ اقبال نے اسوۂ نبی ﷺ کے اتباع کی طرف قوم کو متوجہ کرنے کی سعی کی۔ اقبال کی طرح اردو زبان کے تقریباً تمام بڑے شاعروں کے ہاں فکر کے ساتھ لفظیات بھی

اسی تناظر میں آئیں۔ غالب کے ہاں فلسفۂ زندگی، میر کے ہاں انسانی جذبات کے تناظر میں لفظوں کا دروبست سامنے آتا ہے۔ اقبال کے ہاں یہ لفظ اپنے نظریے کی پیش کش کے لیے آتے ہیں، لہٰذا اُن کے لہجے اور بیان میں ایک تیقن کی کیفیت آغاز سے ہی نظر آنے لگتی ہے۔ ''ملّاے حرم'' کے عنوان سے ''کلیاتِ اقبال'' کی ایک نظم میں خطابت اور تیقن کی کیفیات دیکھیے:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام[۱۴]☆

اقبال کے ہاں فرد کے نفسیاتی نظام کی اسلامی اور اخلاقی تشکیل کے تین مرحلے بیان ہوئے ہیں۔

اوّل: اطاعت دوم: ضبطِ نفس سوم: نیابتِ الٰہی

انھوں نے اسرارِ خودی میں ان موضوعات پر حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کو مثال بنا کر بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول اکرم ﷺ کے راستے پر چل کر مردِ مومن کی وہ خصوصیات پیدا کی جاسکتی ہیں جو انسان کو عارف کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔

اقبال کے ہاں وقت کے ماورائی تصورات کو قرآنِ حکیم کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واقعۂ معراج کے حوالے سے تقریباً تمام نعت گوشعرا نے اظہارِ خیال کیا، لیکن اکثریت کے ہاں روایتی اندازِ فکر کے باعث اس عظیم واقعے سے کسی بڑے خیال کی طرف پیش رفت نہیں کی گئی۔ تاہم اقبال کے ہاں وقت کے ماورائی تصورات کو حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر عالم خوند میری اپنے مضمون ''زمانہ — اقبال کے شاعرانہ عرفان کے آئینے میں'' میں لکھتے ہیں:

اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک حرکت پذیر کائنات میں انسانی مؤقف کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ کائنات اگر تغیر پذیر ہے تو پھر انسانی تقدیر کو بھی تغیر پذیر ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں انسان تبدیلی کے قابل ہے۔"☆۱۵

اقبال کے ہاں واقعۂ معراج سے انسانی عظمت اور تحرک کا فلسفہ سامنے آتا ہے۔ وہ واقعۂ معراج النبی ﷺ کے تناظر میں وقت کی ماہیت پر بحث کرتے ہیں اور وقت کو انسان کے متحرک رہنے میں اور کائنات کی شکست و ریخت میں بہ حیثیت ایک اوزار دیکھتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(کلیاتِ اقبال)

اقبال کے ہاں وقت کا تصور relative، غیر مستقل اور اعتباری ہونے کا ہے۔ یہ تصورِ وقت قرآن کے مطابق ہے۔ اقبال کے تصورِ وقت کی ماہیت، کسی حد تک حرکی اور پیچیدہ ہے۔ اگر نکات کی شکل میں بیان کیا جائے تو اقبال کا تصورِ وقت کچھ یوں ہوگا:

الف: زمان (Time) ایک تخلیقی قوت ہے۔

(ب): زمان (Time) ایک ارتقائی قوت ہے۔

(ج): زمان (Time) پر قابو پا کر ہی زندگی کے ممکنات کو سامنے لایا جاسکتا ہے۔

(د): زمان (Time) حقیقی لمحوں کا مرکب ہے اور زمانِ مسلسل جو مختلف اکائیوں کی شکل میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

زمانِ حقیقی کا بیان اقبال کے ہاں دیکھیے:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال نے زمانِ حقیقی کو تقدیر کہا ہے اور یہ قرآنی حکم کے عین مطابق بھی ہے۔ ان کے ہاں زندگی کا حرکی تصور ملتا ہے جو اسلام کے انقلابی اور حرکی مزاج سے

ہی اخذ کیا گیا ہے۔ وہ وقت کو زمان و مکاں کے تحت بھی سمجھتے ہیں اور ماورائے زمان بھی۔ لہٰذا اقبال کائناتی تفہیم کے لیے بھی وقت کو ایک آلے کے طور پر سمجھتے ہیں:

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

اقبال کے ہاں ایک خاص طرح کی لفظیات کو ان کے بعد کئی شعرا نے اپنانے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ اس کی بڑی وجہ زبان کی روایت کو سمجھے بغیر ایک ادھوری کوشش کی گئی جس کو قبولِ عام حاصل نہ ہوسکا۔

اقبال کے ہاں نظریاتی سطح پر نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کا بیان ایک بالکل مختلف اور منفرد تصویر بناتا ہے جو اُن سے پہلے بھی کسی شاعر کے ہاں نظر نہیں آئی اور ان کے بعد بھی کہیں دکھائی نہ دی۔

وہ باقاعدہ نعت کے شاعر نہ تھے، لیکن اُن سے زیادہ عمدہ اور اثر پذیر نعت کسی شاعر کے دیوان میں موجود نہیں۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

جیسے اشعار میں سیرتِ مبارکہ کے ہر پہلو کا احاطہ ہوتا نظر آتا ہے۔

ولایت ، پادشاہی ، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہے فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اقبال کی شاعری میں سے نعت کو علاحدہ نہیں کیا جاسکتا کہ پھول اور خوش بو کے درمیان رشتہ ہوا کا ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام اور لفظوں کے درمیان بھی سیرتِ پاک ﷺ کا

رشتہ ہے جسے علاحدہ کرنا ممکن نہیں۔ کلامِ اقبال پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کی نعت کو کسی بھی ناقد سے علاحدہ نہیں کیا جاسکا۔ اقبال کے کلام کی ہر ہر پرت میں معنی کے خزانے موجود ہیں اور نعت کے حوالے سے ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ''کلیاتِ اقبال''، علامہ محمد اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور سن ندارد۔
۲۔ ''معنی اور تناظر''، وزیر آغا، ڈاکٹر، مکتبہ نردبان سرگودھا، دسمبر ۱۹۹۸ء۔
۳۔ ''خطوط اقبال''، اقبال آلِ احمد سرور کے نام خط سے اقتباس۔
۴۔ ''نعت اور جدید تنقیدی رجحانات''، کاشف عرفان، نعت ریسرچ سینٹر کراچی، ص۶۷، ۲۰۱۵ء۔
۵۔ ''کلیاتِ اقبال''۔
۶۔ ایضاً۔
۷۔ ایضاً، ص۲۷۳۔
۸۔ نظم ''بلادِ اسلامیہ''، کلیاتِ اقبال۔
۹۔ ''کلیات اقبال''، ص ۱۳۵۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۳۸۔
۱۱۔ ایضاً صف۸۳۔
۱۲۔ ایضاً۔
۱۳۔ ''اقبال اور محبتِ رسول''، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، نومبر ۱۹۹۷ء (طبع اوّل)۔
۱۴۔ ''کلیاتِ اقبال''، ص۲۴۔
۱۵۔ بہ حوالہ ''نعت اور جدید تنقیدی رجحانات'' ص ۱۷۰۔۱۶۹۔

اقبال اپنی مجموعی شاعری کی طرح نعت گوئی میں بھی ایک ایسی انفرادیت رکھتے ہیں جس کا سبب معلوم ہے، لیکن اثر مفقود۔ اقبال کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کا اخلاقی جوہر، حقیقتِ وجود اور غایتِ ہستی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عربی کی نعتیہ روایت کی طرح اقبال نے رسول اللہ ﷺ کی بشریت اور تاریخی شخصیت کو خلاصۂ وجود اور منتہائے کمال کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کی طرح آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں بھی آفاقیت اور دوام کے یکساں عناصر کارفرما ہیں۔ ان عناصر کی سیر اقبال نے جس تفصیل کے ساتھ کی ہے، اس کی دوسری کوئی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔

صوفیا نے رسول اللہ ﷺ کو بااعتبارِ حقیقت خاتم الوجود اور خاتم الزماں قرار دیا ہے۔ اقبال نے اس صوفیانہ بصیرت کو آپ ﷺ کی شخصیت کے مطالعے میں پورے کا پورا صرف کر دکھایا اور ایک عارفانہ تیقّن کے ساتھ روحانی ذہن کو اس معرفت کا حامل بنایا کہ آپ ﷺ کی ذات میں پہلی مرتبہ وہ اصولِ وحدت ظاہر ہوا جہاں مظہر اور اس کی حقیقت میں دوئی نہیں رہتی۔ یہ بات تصوف کی روایت میں عقیدے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ حقائقِ رسالت کو تاریخ میں بھی کارفرما دیکھنا ہو تو اس کی بس ایک صورت ہے: اقبال کے نعتیہ کلام کو پڑھنا، بلکہ پڑھتے رہنا۔

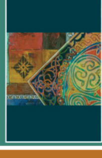
اقبال کی نعت کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے اس کا مطالعہ رسمی اندازِ تنقید کے بس کا روگ نہیں رہا۔ اسی لیے کلامِ اقبال کی اس اہم جہت پر ذرا کم ہی کام ہوا ہے۔ صبیح رحمانی خود اچھے نعت گو ہیں، وہ نعت اور مطالعاتِ نعت کے لیے وہ بہت جذبے اور سلیقے سے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب ''اقبال کی نعت — فکری و اسلوبیاتی مطالعہ'' میں فکرِ اقبال کے اسی رخ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کتاب میں کچھ پرانے مضامین کا انتخاب شامل ہے اور بعض نئے مضامین بھی بہ طورِ خاص لکھوائے گئے ہیں، یوں ان کے ذریعے اقبال کی نعت کا ایک جامع مطالعہ سامنے آتا ہے جس میں اس فکر و اسلوبِ اقبال کے اہم زاویے پیشِ نظر رکھے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک گراں قدر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور نقدِ اقبال میں بھی اسے اضافہ قرار دیا جائے گا۔

محمد سہیل عمر

ACADEMY BAZYAFT

مرتّب
صبیح رحمانی

اقبالؒ کی نعت
فکری و اسلوبیاتی مطالعہ



ISBN 969540132-5
9789695401323